پاکستانی اردو ناول میں کراچی کی معاشرتی زندگی

مقالہ نگار:

شہزاد قیصر

رجسٹریشن نمبر:105-FLL/MSURDU/S13

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

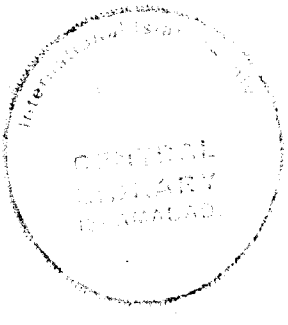

Accession No. TH23091

MS
891.4393
شن ہ پ

اردو ادب - ناول

" - ناول - پاکستان

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"پاکستانی اُردو ناول میں کراچی کی معاشرتی زندگی"**

مقالہ نگار: شہزاد قیصر

رجسٹریشن نمبر: 105-FLL/MSURDU/S13

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیۂ زبان وادب
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
صدر
شعبۂ اُردو
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر عابد سیال
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
اے آئی او یو، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

مارچ، 2019ء

فہرست موضوعات

باب اول:	کراچی: ثقافت، تمدن اور تاریخ	1
	کراچی تاریخ کے آئینے میں	1
	کراچی کی تاریخ سے متعلق روایتوں کا جائزہ	2
	سومرو خاندان	6
	سمہ خاندان	6
	کلھوڑو خاندان	7
	تالپور خاندان	8
	سندھ پر انگریزوں کا قبضہ	10
	انگریزوں کا دور حکومت	13
	کراچی کی تعلیم برطانوی عہد میں	15
	کراچی کے اعلیٰ تعلیمی ادارے	18
	سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال	19
	برطانوی دور میں کراچی کی معاشی ترقی اور بندرگاہ	21
	کراچی میں بینکنگ سیکٹر کی ابتداء	23
	کراچی میونسپل کارپوریشن	24
	برطانوی دور میں سڑکوں اور شاہراؤں کی تعمیر	26
	برطانوی دور کے کراچی کی چند نامور ہستیاں	28
	برطانوی دور میں سیاست اور سیاسی پارٹیاں	29
	کراچی انگریزوں کے دور سے ۱۹۴۷ء تک ایک مختصر خاکہ	32
	کراچی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک	35
	کراچی ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک	40
	کراچی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک	44

	کراچی ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک	45
	کراچی ۱۹۸۷ء سے تا حال (چند بڑے واقعات)	47
	مہاجر قومی موومنٹ (آغاز، قیام، موجودہ صورتحال)	48
	کراچی یونیورسٹی اور طلبہ تنظیمیں ایک مختصر جائزہ	50
	مہاجرین کی سیاسی بیداری	54
	آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO)	56
	مہاجر قومی موومنٹ کی ابتدائی مشکلات	56
	مہاجر قومی موومنٹ اور قائدِ تحریک سے وفاداری	59
	ایم کیو ایم کی مفاد پرستانہ سیاست	60
	ایم کیو ایم کے لیے چند بڑے خدشات (ماضی، حال، مستقبل)	61
	حاصلِ کلام	62
	حوالہ جات	66
باب دوم:	**کراچی کی معاشرتی زندگی اور اُردو ناول**	70
	اُردو ناول اور کراچی کی جھلکیاں	72
	خدا کی بستی مقہور اور مجبور لوگوں کی داستان	75
	خدا کی بستی کا لوکیل	76
	خدا کی بستی کے کرداروں کی بے بضاعتی	76
	راجا، نوشا اور کراچی	77
	کراچی کی زندگی کی تلخ حقیقتیں اور خدا کی بستی	83
	خدا کی بستی اور کراچی کی اپر کلاس	88
	انتظار حسین آگے سمندر ہے	93
	مہاجرین جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں	95
	کراچی کے باشندے اور خوف	98
	شہر کراچی کی زندگی	102

کراچی اہل زبان اور مشاعرے 105

کراچی کی خواتین 106

کراچی اور مستقبل کی ایک اُمید 108

چاکی واڑہ میں وصال ابن انشا اور فیض احمد فیض کی نظر میں 109

لیاری کا علاقہ "چاکی واڑہ" 110

چاکی واڑہ میں وصال میں چاکی واڑہ کے مختلف علاقوں کے زندہ مناظر 111

چاکی واڑہ کے مکانوں، عورتوں اور دریائے لیاری کا بیان 113

چاکی واڑہ کے ریستوران 114

چاکی واڑہ کے لوگوں کی معاشرت 114

چاکی واڑہ کا ہائیڈ پارک 116

رضیہ کا حسن بے مثال اور کراچی کے خُسر 117

چاکی واڑہ میں وصال اور بالکونی کا عشق 118

آبِ گم اور مہاجرین کی بپتا 120

کرامت حسین کی جھگی، سطح سمندر اور خط ناداری سے نیچے 121

مولانا کرامت حسین کے مصائب 122

عزت نفس، خودداری، احساسِ تفاخر کی موت 123

جام اُس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اُٹھا لے 124

قرۃ العین حیدر آگ کا دریا 125

کراچی 126

آگ کا دریا اور مہاجر 127

اندھوں میں کانا راجا 127

پاکستانی بیگمات 128

حوالہ جات 130

باب سوم:	کراچی کی سیاست، معیشت اور اُردو ناول	133
	مٹھی بھر ہوا کوکب جمیل	134
	کراچی میں معاشی ترقی کے امکانات اور سماجی رویوں پر اُن کا اثر	134
	مٹھی بھر ہوا کے تناظر میں کراچی کی طبقاتی کشمکش	139
	مٹھی بھر ہوا مذہبی طبقے کی اُٹھان	140
	کوکب جمیل کا ناول مٹھی بھر ہوا اور نئی نسل	141
	مٹھی بھر ہوا اور ملک کی سیاسی صورتحال	142
	جوگندر پال کا ناول خواب رَو	145
	ناسٹلجیائی کیفیت کی شدت اور اُس سے پیدا ہونے والے منفی رویے	147
	احساسِ تفاخر اور زمینی حقیقتوں سے گریز	152
	اسحاق مرزا خواب رَو کا ایک منفرد کردار	157
	نہ جنوں رہا نہ پری رہی زاہدہ حنا، کراچی کی پارسی کمیونٹی	160
	پارسی لوگ	161
	زاہدہ حنا کا ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی	161
	کراچی کے گلی، کوچے، شاہرائیں، سمندر اور کلفٹن	162
	سگے رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، خودغرضی اور موقع پرستی	165
	نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں پارسی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں	171
	رضیہ فصیح احمد کا ناول ایک صدی کی کہانی	176
	ایک صدی کی کہانی اور کراچی	177
	متحدہ ہندوستان کی تقسیم	177
	مہاجرین کی کراچی آمد اور اُس زمانے کا کراچی	179
	مہاجرین کی آمد اور چھینا جھپٹی کی نفسیات	181
	حوالہ جات	183

باب چہارم:	کراچی کی طبقاتی صورتحال اور اُردو ناول	186
	فہمیدہ ریاض کی کراچی	187
	کراچی میں مہاجرین کی آمد، چھینا جھپٹی کی ابتدا	188
	صدر ایوب اور کراچی	191
	کراچی سندھی قوم پرستی اور مہاجر	194
	مہاجر قومی موومنٹ آغاز، عروج اور مسائل	197
	کراچی کے شہری اور خوف	201
	کراچی کے شہری	202
	کراچی کے منظرنامے کو متاثر کرنے والے دو بڑے عوامل	203
	لینڈ گریبرز اور غیر قانونی اسلحہ	203
	قرۃ العین حیدر کا ناول سیتا ہرن	207
	سیتا میر چندانی کی ہجرت اور ہجرت کے آلام	219
	سیتا ہرن اور ناسٹلجیا	210
	سیتا میر چندانی کے خاندان کی ہجرت	215
	محمد امین الدین کا ناول کراچی والے	218
	کراچی اس نہج تک کیسے پہنچا	219
	کراچی اور خاندانی زندگی	221
	کراچی کے نوجوانوں کا المیہ اور محمد امین الدین کا ناول کراچی والے	223
	علم سے دوری	223
	بے سمتی کا عذاب اور نوجوان نسل	225
	کراچی کے نوجوان اور مذہبی شدت پسندی	227
	دربدری کا عذاب اور کراچی کے نوجوان	229
	کراچی والے اور کراچی کے مختلف طبقات	233
	قرۃ العین حیدر کا ناول ہائوسنگ سوسائٹی	235

مہاجرین کی مشکلات، ایسی بلندی ایسی پستی	236
کراچی اور بائیں بازو کی سیاست، سلمان کا قتل	241
کراچی اعلیٰ اقدار کی موت اور نئے سرمایہ دار طبقے کا ظہور	243
حوالہ جات	251
ماحصل، حاصلات، نتائج اور سفارشات	254
کتابیات و ماخذات	264

اقرار نامہ

میں شہزاد قیصر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(شہزاد قیصر)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

پیش لفظ

کراچی وطنِ عزیز کا بلحاظِ آبادی سب سے بڑا شہر ہے۔قیام پاکستان سے لے کر تا حال اس شہر نے شاندار معاشی ترقی کی ہے۔کراچی کی اس معاشی ترقی کی وجہ سے ملک کے کونے کونے سے لوگ بہتر مستقبل کے لیے کراچی عارضی اور مستقل ہجرت کرتے رہے ہیں۔لوگوں کے اس رجحان نے کراچی کو منی پاکستان بنادیا ہے۔پاکستان کے کم وبیش ہر شہر کا باشندہ کراچی میں موجود ہے۔کراچی کی اس ثقافتی رنگارنگی نے کراچی کو ایک منفرد پہچان دی ہے۔

بدقسمتی سے سیاسی غیر یقینی شروع دن سے ہی پاکستان پر کسی آسیب کی طرح مسلط رہی ہے۔اس وجہ سے ہمارے مستقبل پر بھی غیر یقینی کے بادل چھائے رہتے ہیں۔کراچی قیام پاکستان سے قبل چار لاکھ آبادی کا ایک صاف ستھرا اور خوبصورت شہر تھا۔آزادی کے ستر برس بعد یہ شہر دو کروڑ کا حدف عبور کر چکا ہے۔آبادی کے اس بے ہنگم پھیلاؤ سے اس شہر کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔شہری سہولتوں کی فراہمی ناممکن ہوتی جارہی ہے۔

کراچی شروع دن سے سیاسی ہلچل کا بھی محور ومرکز ہے۔اس عمل سے شہر پر قبضے کی جو جنگ چھڑی اس جنگ نے شہر کو لہولہان کردیا۔شہری ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔افغان جہاد، غیر قانونی اسلحہ، افغان مہاجرین کی بلاروک ٹوک آمد، سندھی مہاجر تنازعہ، مہاجر پٹھان تنازعہ، طالبان، مذہبی شدت پسند تنظیمیں ایسے عوامل ہیں جو کراچی کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔سیاسی جماعتوں نے بھی کراچی کے ساتھ پرخلوص ہونے کا کوئی عملی اظہار نہیں کیا۔کراچی کو یوں لاوارث چھوڑ دینے کی وجہ سے شہر کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ان دل دہلا دینے والے حالات میں اس شہر کے باسیوں نے اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ہمارے ادیبوں، قلم کاروں اور لکھاریوں نے اس صورت حال پر عمدہ ادب تخلیق کیا ہے۔کراچی پر لکھے گئے کم وبیش تیرہ ناولوں سے کراچی کے باسیوں اور کراچی شہر کو سمجھنے کی کوشش ہماری اس تحقیق کا مقصد ہے۔

اس مقصد کے حصول میں ہمارے اساتذہ جناب پروفیسر ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، جناب پروفیسر ڈاکٹر روش ندیم، پروفیسر ڈاکٹر ارشد معراج اور پروفیسر ڈاکٹر کامران کاظمی نے ہماری راہنمائی کی جس کے لیے ہم تہہ

دل سے اُن کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے محترم استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر طیب میر (مرحوم) سے بھی ہم نے بہت کچھ سیکھا ہماری بدقسمتی کہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین۔ ہمارے اس سفر میں ہمارے دوستوں نے بھی دامے، درمے، قدمے، سخنے ہمارا ساتھ دیا۔ یہ دل اُن کے لیے بھی شکر گزاری کے جذبات سے لبریز ہے۔ کچھ کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں ہمارے طالب علموں نے ہماری بہت مدد کی اُن کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے۔

شہزاد قیصر

مقالہ نگار

باب اول:

کراچی؛ ثقافت، تمدن اور تاریخ

کراچی تاریخ کے آئینے میں

بحیرہ عرب کے کنارے آباد پاکستان کا آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا شہر کراچی، عروس البلاد، روشنیوں کا شہر، غریبوں کی ماں جو اپنے ہر باسی کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ جس کی مہربان گود میں سندھی، بلوچی، شیدی، مکرانی اور گجراتی آبادیوں کے علاوہ پنجابی، پٹھان، سرائیکی، پوٹھوہاری، ہزاروی، براہوی، تھری، چولستانی، کشمیری، بلتی، چترالی، واخی کے علاوہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے یوپی، حیدر آباد، دہلی کے ساتھ ساتھ بہاری، کچھی، میمن، گوانیز، مارواڑی، میواتی، ملباری، مدراسی، اور ایرانی، افغانی، بنگالی سب کے سب چین و آرام کی نیند سوتے ہیں۔

اس شہر نے سمندر کی طرح پاکستان کے تمام علاقوں سے آنے والوں کو خوش آمدید کہا اور ان کو بڑھنے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے۔ پاکستان کے کسی اور شہر کو یہ اعزاز حاصل نہیں جو کراچی کے حصے میں آیا ہے۔

کراچی کے بسنے والے کراچی کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی معاشی شاہ رگ میں حیرت انگیز توانائی ہے زمانے کے جتنے گرم و سرد اس شہر نے سہے ہیں شاید ہی کسی شہر نے دیکھے ہوں۔

کراچی کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کئی روایتیں، قصے، داستانیں مشہور ہیں جو الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ ایک ہی بات بتاتی ہیں۔ وادی سندھ کا مشہور و معروف شہر کراچی جو آج کسی تعارف کا محتاج نہیں کسی زمانے میں ملاحوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہوا کرتا تھا۔

وادی سندھ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بیسویں صدی میں ماہرین آثار قدیمہ نے سندھ کی قدامت کا اندازہ پانچ ہزار سال تک لگایا ہے اس وادی پر مختلف ادوار میں مختلف اقوام حکمران رہی ہیں۔

۷۱۲ء میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے سندھ کی تاریخ کو مندرجہ ذیل چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) سومرو خاندانوں کا عہد حکومت ۱۰۵۰ء سے ۱۳۵۱ء تک

(۲) سمہ خاندان کا عہد حکومت ۱۳۵۱ء سے ۱۵۲۱ء تک

(۳) ارغون، ترخان اور مغلیہ عہد حکومت ۱۵۲۱ء سے ۱۷۱۸ء تک

(۴) کلہوڑو خاندان کا عہد حکومت ۱۷۱۸ء سے ۱۷۸۳ء تک

(۵) تالپوروں کا عہد حکومت ۱۷۸۳ء سے ۱۸۴۳ء تک

(۶) برطانوی عہد حکومت ۱۸۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد سندھ اور کراچی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کراچی کی تاریخ سے متعلق روایتوں کا جائزہ

ایک بستی کا ویران ہونا اکثر نئی بستی کے بسنے کا سبب رہا ہے۔ اسی طرح دریائے حب کے دوسرے کنارے پر آباد کھڑک بندر نامی شہر کی بربادی نئی بستی جو مختلف ناموں سے موسوم رہی کی آبادی کا باعث بنا۔ کھڑک بندر تجارتی بندرگاہ تھا۔ اس بندرگاہ کا دہانہ ریت سے اٹ گیا اور جہازوں کے لیے وہاں لنگر انداز ہونا مشکل ہوگیا تو اس شہر کے باسیوں نے مناسب مقام ڈھونڈنے کے لیے کوشش شروع کردی۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی نظر موجودہ کراچی کے مقام پر پڑی اس مقام کو پسندیدہ کہا گیا یہاں ایک "کلاچی جوکن" نامی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ اس چشمے کے اردگرد کھجور کے درخت تھے۔ آخر کار جگہ کو پسند کر کے گھر تعمیر کیے گئے کھڑک بندر سے تمام منقولہ غیر منقولہ جائیداد کو یہاں منتقل کیا گیا اور کھڑک بندر کے تمام لوگ آہستہ آہستہ یہاں منتقل ہوگئے۔

پھر اس چھوٹے سے شہر کے لیے حفاظتی نقطہ نظر سے ایک فصیل تعمیر کی گئی اور اس فصیل میں دو دروازے رکھے گئے۔ مغربی دروازے کو کھارو دروازہ، یعنی کھارے پانی کی طرف کھلنے والا دروازہ اور شمال مشرق کی طرف لیاری ندی کی طرف کھلنے والے دروازے کو "مٹھو دروازہ" یعنی میٹھے پانی کی طرف کھلنے والا دروازہ کہا گیا۔ فصیل بنانے سے آبادی کے گرد اگرد ایک قلعے کی شکل ابھری اس شہر کی حفاظت کے لیے مسقط سے توپیں منگوا کر قلعے کی دیواروں پر رکھی گئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان علاقوں کو "کھارادر" اور "میٹھا در" کہا جانے لگا۔ یہ دونوں علاقے آج بھی موجود ہیں اور کھارادر کے علاقے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کی یہاں قائداعظم کی رہائش گاہ بھی ہے۔

کراچی کی تاریخ کے بارے میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں میں یہی کہانی کچھ کمی بیشی کے ساتھ ملتی

ہے۔ گوہر بحیرہ عرب کے مصنف احمد حسین صدیقی لکھتے ہیں۔

تاریخ میں عموماً یہی ہوا کہ ایک بستی کے اجڑنے سے دوسرا شہر آباد ہوتا ہے۔ کراچی کی آبادی کا سبب بھی دریائے حب کے دوسرے کنارے پر آباد کھڑک بندرگاہ کی تباہی تھی۔ موجوں اور ہواؤں نے کھڑک بندر کا دہانہ ریت سے بھر دیا۔ جہازوں اور کشتیوں کا بندرگاہ میں داخلہ ممکن نہیں رہا۔ سمندر کے راستے ہونے والی تجارت برباد ہونے لگی تو کھڑک بندر میں آباد لوگ جہاز رانی کے ذریعے ہونے والی اپنی تجارت کو بچانے کے لیے کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نکلے جسے نئی بندرگاہ کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ قسمت نے یاوری کی اور ان کے قدم کھڑک بندر کے کچھ فاصلے پر مشرق کی جانب ایک ایسے کھاڑی کی طرف اٹھے اور وہاں انھیں ایک قدرتی بندرگاہ مل گئی۔[۱]

احمد حسین صدیقی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

کھڑک بندر کے پریشان حال لوگوں کو یہ جگہ پسند آئی انھوں نے اس جگہ نئی بستی بسائی اور اسے "کلاچی جوگوٹھ" کے نام سے یاد کرنے لگے۔ یہ ۱۷۲۹ء کا واقعہ ہے۔ گویا آج کے کراچی کے سنگ بنیاد اسب ۲۶۵ برس پہلے بھوج مل اور اس کے ساتھیوں نے رکھا۔ جو سو میانی، گوادر، بیلا اور مسقط سے ہونے والی تجارت کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔[۲]

کم وبیش اسی طرح کی باتیں سید ادیب حسن کی کتاب کراچی اور اس کی بندرگاہ میں بھی نظر آتی ہیں سید ادیب حسن کہتے ہیں۔

جب بلوچستان کے علاقے سے گزرنے والے حب دریا کے دہانے پر موجود کھڑک بندر پانی کے ساتھ بہہ کر آنے والی ریت کے سبب جہاز رانی کے قابل نہ رہی تو اسے استعمال کرنے والے افراد نے ۱۷۲۹ء میں کسی اچھے متبادل مقام کی تلاش میں سفر کرتے ہوئے کراچی آئے اور انھیں اپنی تجارتی سرگرمیوں کے لیے یہ جگہ مناسب نظر آئی۔ اس طرح وہ لوگ کھڑک بندر سے اپنے محلے اور ساز وسامان کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے۔[۳]

عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں رقم طراز ہیں۔

اس شہر کی بنیاد ۱۷۲۹ء میں بھوجومل نامی ایک تاجر نے رکھی تھی۔ وہ کھارک بندر کے ناقابل

استعمال ہونے کے بعد ایک بہتر بندرگاہ کی تلاش میں یہاں آکر آباد ہوگیا تھا۔ اُس وقت کراچی ایک مچھیروں کی بستی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ یہاں کے مقامی باشندے جولدار، ونگورا، بندری اور کراچو کہلاتے تھے۔ کیماڑی، منوڑا اور ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ آباد تھے اور ماہی گیری اور کشتی رانی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ بھوجومل نے یہاں اپنے ساتھیوں کے تعاون سے فصیل شہر تعمیر کرائی اور بندرگاہ کی ترقی کے لیے اقدامات کیے اور یوں یہ مقام، جو اُس وقت ایک بڑے گاؤں کی مانند تھا نہ صرف بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ ہوگیا بلکہ یہاں روزگار کے مواقع بھی پیدا ہونے لگے جن سے مستفید ہونے کے لیے یہاں قرب و جوار کے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ سلسلہ اس تیز رفتاری سے بڑھا کہ ۱۸۳۹ء میں اس شہر پر انگریزوں کے قبضے کے وقت یہاں کی آبادی چودہ ہزار نفوس تک پہنچ چکی تھی۔ [۴]

اس بستی کے بستے اور پرانے تجارتی رابطے بحال ہونے پر اردگرد کے لوگ بھی اسی بستی میں پہنچنے لگے اور یہ جگہ آہستہ آہستہ آبادی کے اعتبار سے بڑھنے لگی۔

کھتری عبدالغفور کانڈا کریا اپنی کتاب کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی میں لکھتے ہیں۔

ہوایوں کہ بلوچستان میں بہنے والی حب ندی کے آخری سرے پر موجود کھارک بندر نامی بندرگاہ جب ریت سے اٹ گئی تو وہاں کے تاجر بھوجومل نے ۱۷۲۹ء میں اپنا درآمدی اور برآمدی کاروبار کھارک بندر سے کراچی منتقل کردیا۔ اس وقت اس مقام کا نام دربو تھا۔ ان کی تقلید میں ٹھٹھہ کے قریب موجود "شاہ بندر" کے تاجر اور مکین بھی یہاں آگئے اور یوں دیکھتے دیکھتے کراچی مچھیروں کی بستی کے بجائے ایک شہر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اس دوران گذری بندر اور دوسرے چھوٹے بندر کے پیچھے ہٹنے سے اپنی اہمیت کھوتے گئے۔ تو بندرگاہ سے وابستہ کاروبار کیاماڑی بندر میں سمٹ آیا۔ [۵]

کراچی کی تاریخ کے سلسلے میں سیٹھ ناؤمل کی یاداشتیں پہلی بار انگریزی کے ایک محدود ایڈیشن کی صورت میں ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئیں تھیں۔ کتاب کا مکمل عنوان یہ تھا۔

"A forgotten chapter of Indian History, as told by SethNaomal Hotchand, CSI of Karachi (1804,1878) written by himself and translated by his Grandson Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani BA, edited with an introduction by Sir H. Evin.M.

James KCIE, CSI Commissioner of Sindh, 1891-1899 printed for private circulation only"

سیٹھ ناؤمل کی کتاب کا سندھی ترجمہ محمد حنیف صدیقی نے کیا اور یہ ترجمہ یاد گیریوں کے عنوان سے سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔

ان یاداشتوں میں تفصیل کے ساتھ اس علاقے، جسے آج لوگ کراچی کے نام سے جانتے ہیں کی تاریخ کے اہم حقائق سامنے آتے ہیں۔ کراچی کی ابتدا کے متعلق خاصی تفاصیل دستیاب ہوتی ہیں۔ کراچی کی تاریخ سے متعلق ایک قدرے طویل اقتباس میں انہی باتوں کی کسی قدر تفصیل وتوضیح ہے۔ ناؤمل ہوت چند لکھتے ہیں۔

> اُس وقت پنوھر اور چنا قوموں کے لوگ سندھ کے اس حصے پر حکومت کرتے تھے اور کاہری، سامتانی پرگنے کا صدر مقام تھا۔ سجن مل کے بڑے بیٹے بھوجومل سولہ برس کی عمر میں اپنی سوتیلی ماں سے ان بن کی وجہ سے کاہری چھوڑ کر سیوھن چلے گئے۔ پھر وہاں سے ایک قافلہ تیار کر کے کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس وقت کراچی کے موجودہ شہر کا وجود نہیں تھا۔ البتہ حب ندی کے اُس طرف " کھڑک بندر" نامی ایک شہر تھا جو تجارت کے لیے مشہور تھا۔۔۔ بندرگاہ کا دہانہ اٹ جانے کے باعث سوداگروں کو وہاں لنگر انداز ہونے میں بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ سیٹھ بوجھومل وہاں کے دوسرے معزز لوگوں کے مشورے سے آباد ہونے کے لیے کوئی دوسری قریبی جگہ تلاش کرنے لگے۔ جہاں انھیں تجارت میں سہولت ہو۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان لوگوں کی نظر کراچی کے ساحلی علاقے پر پڑی۔ وہاں ریت کے دہانے پر، بیس، پچیس میر بحروں (ملاحوں) کی جھونپڑیاں تھیں۔ اس جگہ کو اس وقت " دربو " کہتے تھے اس کے قریب پانی کا چشمہ تھا جسے " کلاچی کن" کہتے تھے۔ کن کے معنی ہیں ایک گہرے پانی والا گڑھا اور کلاچی ایک میر بحر کا نام تھا۔۔۔ ۱۷۲۹ء کے آس پاس کھڑک بندر کے لوگ آ کر کراچی میں آباد ہوئے۔[۶]

یوں رفتہ رفتہ اس شہر کی شکل نمودار ہونی شروع ہوئی، لیکن کہتے ہیں بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ پر تو کلھوڑوں کی حکمرانی تھی لیکن وادی سندھ عربوں کے دور حکومت سے لے کر ۱۷۲۹ء تک کافی نشیب وفراز سے گزر چکی تھی۔

مناسب ہوگا کہ مختصراً عربوں کے دور سے انگریزوں کی آمد تک وادی سندھ کی بالعموم اور کراچی کی

تاریخ کا بالخصوص ایک جائزہ لے لیں اس سے کراچی کی تاریخ کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔عربوں کی آمد سے پہلے سندھ پر راجا داہر حکمران تھا۔محمد بن قاسم کی آمد سے سندھ پر عرب حکمرانی کا دور شروع ہوتا ہے۔اس سارے دور میں مختلف گورنر سندھ کے نظم ونسق کو دیکھنے کے لیے مقرر کیے جاتے رہے،بنوامیہ کے دور میں ۱۰ اور بنوعباس کے دور میں ۳۱ گورنر مقرر ہوئے۔

عربوں کا اقتدار سندھ میں ۳۰۰ سال پر محیط رہا۔عربوں کے دور حکومت میں سندھ کو خصوصی اہمیت ملی۔مساجد کی تعمیر،قرآن مجید کا سندھی ترجمہ،ڈاک کا بہتر نظام،تجارت میں ترقی، نئے شہروں کا بسنا ایسے کام تھے جن سے سندھ کی تہذیب وثقافت پر عربوں کی چھاپ نظر آنے لگی۔عدل وانصاف،مساوات،رواداری کو فروغ ملا۔

سومرو خاندان

سندھ میں عرب دور حکومت کے خاتمے کے بعد سومروں کا دور حکومت (۱۰۵۰ء سے ۱۳۵۱ء) شروع ہوا۔یہ لوگ سندھ کے باشندے تھے اور غزنی کے سلطان کے باج گزار تھے۔یہ دور سندھ کی تاریخ کا رومانی دور مانا جاتا ہے۔اس دور میں سسی پنوں،عمر ماروی،مومل رانو،کی داستان اور محمود غزنوی اور ڈنو سنار کے قصے کہانیاں منظر عام پر آئیں۔

> سومرو عہد میں سندھ کی پہلی شاعرہ مرکھاں شیخن ہوگزری ہیں جن کے کلام کی بازیافت کا سہرا شیخ محمد سومار کے سر ہے جنھوں نے مائی مرکھاں شیخن کو ۱۹۷۱ء میں مرتب کر کے جیلانی پبلی کیشنز بدین کے زیر اہتمام شائع کروائے ہیں۔مرکھاں کی شاعری ان گیتوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے اپنے مرشد پر کرھیو بھانڈاری کی شان میں کہے تھے۔مرکھاں کی شاعری بھی سندھی شاعری کی زبانی روایت کا حصہ رہی ہے۔[۷]

سمہ خاندان

سومرو خاندان کے تقریباً ۳۰۰ سالہ دور حکومت کے بعد سندھ کی حکمرانی سمہ خاندان نے سنبھالی (۱۳۱۵ء سے ۱۵۲۱ء)۔یہ جام کا لقب لیے منظر عام پر آئے اور دہلی کے باج گزار بنے۔

سمہ خاندان نے سومرو دور کے دوران پیدا ہوجانے والی بدنظمی کو ختم کیا اور امن وامان قائم کیا۔ان کے دور حکومت میں ہمسایہ ممالک کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم ہوئے۔اس دور کی روحانی داستان نوری جام

تماچی سندھی زبان کا عظیم لوک ورثہ ہیں۔

سمہ حکمرنوں نے پونے دوسوسال حکومت کی۔ان کی حکمرانی کے خاتمے پر مختصر مدت کے لیے ارغونوں اور ترخانوں کا دور آیا(۱۵۲۱ء سے۱۷۱۸ء)۔اس دور حکومت میں سندھ پر چھینا جھپٹی جاری رہی جس کے نتیجے میں خون ریزیاں ہوئیں۔یہ دور سندھ کے لیے بدنصیبی لایا۔امیروں کی باہمی لڑائی سے تاریخی شہر ٹھٹھہ تباہ ہوا اور ساتھ ساتھ علمی اور تاریخی ذخیرہ بھی تاراج ہوا اس کے بعد سندھ میں کلھوڑو عہد کا آغاز ہوا۔

کلھوڑو خاندان

میاں یارمحمد کلھوڑو کو اورنگزیب عالمگیر نے سندھ کی حکومت عطا کی (۱۷۱۸ء سے۱۷۸۳ء) یوں وہ کلھوڑو دور کے پہلے حکمران کہلائے، مگر سندھ زیادہ عرصہ مغل سلطنت کے ساتھ منسلک نہ رہ سکا اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل شہزادوں کی باہمی لڑائی نے مغلیہ سلطنت کو کمزور کیا جس کی وجہ سے سندھ پر مغلیہ حکومت کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور سندھ نادرشاہ کا باج گزار بن گیا۔

کلھوڑو کے دور میں سندھ کو قدرے امن اور سکون میسر آیا جس سے معاشی خوشحالی کی جھلک بھی نظر آئی ۔کلھوڑوں کا دور کراچی کے لیے بہت اہم ثابت ہوا اس دور میں کراچی کی بستی اپنے ابتدائی خدوخال بناتی نظر آتی ہے۔بھوجومل کا کھارک بندر کے اٹ جانے کے بعد تجارتی راستے کی تلاش میں یہاں پہنچنا اس دور کا یادگار واقعہ ہے۔

کلھوڑوں کے عہد حکومت میں منصب داروں پر مشتمل ایک نظام وضع کیا گیا جس سے سندھ کی انتظامی صورتحال قدرے بہتر ہوئی اس عہد کی زراعت میں متاثر کن تبدیلی نظر آتی ہے۔نہروں کی کھدائی سے زمینوں تک پانی پہنچایا گیا جس سے قابل کاشت رقبے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

کلھوڑو کے عہد میں حیدرآباد شہر بسایا گیا جو بعد میں دارالخلافہ قرار پایا۔کراچی شروع سے سندھ کا حصہ ہے مگر ۱۶۹۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کے حکم پر اس شہر کو خان قلات کے حوالے کیا گیا اور یہ شہر ۱۶۹۷ء سے ۱۷۵۷ء تک بلوچستان کا حصہ رہا۔ ۱۷۵۷ء میں غلام شاہ کلھوڑو نے اسے دوبارہ سندھ کا حصہ بنایا لیکن ۱۷۷۴ء کو یہ شہر دوبارہ خان آف قلات کے حوالے کیا گیا۔

دونوں دفعہ اس شہر کی حوالگی خون بہا کے عوض ہوئی۔ پہلی دفعہ میر محراب خان کے خون بہا میں اور دوسری دفعہ زرق خان کے خون بہا کے بدلے میں۔

خون بہا کے عوض حاصل کیا گیا شہر خان آف قلات کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا جو تھوڑے بہت محصولات حاصل ہوتے تھے ان پر قناعت کی جاتی تھی۔ اس دوران کلھوڑوں کی پے در پے غلطیوں، ناانصافیوں اور عاقبت نااندیشوں کی وجہ سے تالپور سندھ کے حکمران بنے۔

تالپور خاندان

۱۷۸۲ء میں ہالانی کے مقام پر ہونے والی جنگ میں تالپوروں نے کلھوڑوں کو شکست دے کر سندھ کی حکمرانی کا تاج اپنے سر پر سجایا۔

تالپوروں کی حکمرانی (۱۷۸۳ء سے ۱۸۴۳ء) کے باوجود کراچی خان آف قلات کے زیر نگیں تھا ۔تالپوروں کی خواہش تھی کہ کراچی کو خان آف قلات کے قبضے سے چھڑا کر اپنے زیر نگین لایا جائے۔ یہ باتیں بھی ہوتی تھیں کہ خان آف قلات کب تک خون بہا وصول کرتا رہے گا جب کہ مرنے والوں کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔

تالپوروں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ پہلی دفعہ ۱۷۹۲ء میں میر فتح علی خان ۱۵ ہزار بلوچوں پر مشتمل لشکر کو اس کام کے لیے بھیجا لیکن انھیں ناکامی ہوئی ۔دوسری کوشش ۲۰ ہزار کے لشکر کے ساتھ کی گئی لیکن شہر کی فصلیں آڑے آئیں اور تالپور ناکام ہوئے۔

میر فتح علی خان نے تیسری دفعہ اپنے بھائی میر کرم علی کو کراچی فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ میر کرم علی اور سیٹھ دریا نومل کے دوستانہ تعلقات تھے۔ میر کرم علی نے دریا نومل کے نام خطوط بھیجے جس میں ان سے مدد کی درخواست تھی۔ ایسے ہی ایک خط کا تذکرہ ناؤمل ہوت چند اپنی یادداشتوں میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

> ہمیں یقینی طور پر معلوم ہوا کہ کراچی میں خان قلات کی کوئی حفاظتی فوج نہیں ۔اس میں لڑائی کی ہمت نہیں ۔ہمیں یہ سن کر دکھ ہوا کہ آپ نے ہمارے لوگوں کی مخالفت کی ہے اور اپنے جہازوں کا گولہ بارود ہماری فوج کے خلاف استعمال کر کے انھیں دوبارہ شکست دے کر، نراس کر کے ہٹا دیا ہم کافی عرصے سے دوست ہیں اور ہم وطن بھی ہیں۔ اس لیے آپ کو ہماری مخالفت زیب نہیں دیتی۔ ۸

ان خطوط کے بعد دریا نومل نے قاصدوں کے ذریعے خان قلات کو پیغام دیا میروں نے دو دفعہ کراچی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہم نے ذاتی کوشش سے شہر کا دفاع کیا۔ اب میروں نے تیسری دفعہ فوج بھیجی ہے تم

کوئی تدبیر کرو۔ خان قلات نے جواب میں لڑائی سے معذرت کی اور کہا اگر تم شہر کا دفاع کرسکو تو بہتر ورنہ تم پر کوئی الزام نہیں۔ دریا نومل نے پھر قاصد کے ذریعے میر کرم علی کو خط بھیجا خط میں لکھا

> بے شک ہماری کافی عرصے سے دوستی ہے۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میری عرض ہے جب کراچی آپ کے حوالے کیا جائے، تو بلوچ سپاہیوں کو، جو ایک سرکش اور بے لگام طبقہ ہے شہر میں نہ داخل ہونے دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ جو نواب آپ مقرر کریں وہ ہمارے مشورے سے کام کرے گا اور عوام پر ظلم نہیں کرے گا۔[۹]

یوں ۹۵ء۔۱۷۹۴ء میں دریا نومل نے قلعے کے دروازے کی چابیاں میروں کے حوالے کیں۔

یوں یہ شہر تالپوروں کے قبضے میں گیا۔ ناؤمل ہوت چند نے اپنی یاداشتوں میں تفصیل کے ساتھ ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ باقی تاریخ کی کتب جو کراچی کی تاریخ کے حوالے سے تحریر کی گئی ہی ان میں کم وبیش یہی باتیں ناؤمل ہوت چند کے حوالے سے درج ہیں۔

عثمان دموہی کی کراچی تاریخ کے آئینے میں ہو یا عبدالغفور کانڈا کریا کی کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی انھی تفاصیل سے بھری ہوئی ہیں۔

ایک مختلف نکتہ نظر جناب سید ادیب حسین نے اختیار کیا ہے ان کے مطابق کراچی ناؤمل ہوت چند کے دادا بھوجومل سے پہلے کی آباد بستی ہے اور ۳۰۰ سال پرانے آثار کراچی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اپنی کتاب کراچی اور اس کی بندر گاہ میں لکھتے ہیں۔

> "میں (ناؤمل ہوت چند) کراچی پر قبضہ کے بعد اپنے ذاتی ملازم کے ذریعے چارلس نیپیئر کو کراچی کے حالات کی پل پل کی خبریں پہنچایا کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خاندان کی عظمت دکھانے میں اس حد تک آگے نکل گیا کہ تاریخ کو بھی مسخ کر ڈالا۔ تمام کتابوں میں کراچی کے ۳۰۰ سال کے واضح خدوخال دیکھتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے لکھتا ہے کہ کراچی کے اس مقام کو میرے دادا (بھوجومل) نے ۱۷۲۹ء میں آباد کیا۔[۱۰]

تالپوروں کے عہد میں کراچی تو ان کے زیر نگین آ گیا لیکن مجموعی طور پر اس دور حکومت میں انگریزوں کا عمل دخل سندھ میں خاصا بڑھ گیا تھا۔ سندھ پر ان کی حریصانہ نگاہیں جم چکی تھیں۔ تالپوروں کی باہمی چپقلش کا فائدہ انگریزوں نے بخوبی اٹھایا۔

میر سہراب خان کی وفات پر جب رستم خان اور میر مراد علی خان کے درمیان تنازعہ ہوا تو انگریزوں نے میر مراد علی کی طرف داری کی اور اس کے بدلے میر مراد علی سے مزید مراعات حاصل کیں۔

میر مراد علی کے عطا کردہ پروانہ راہ داری پر الیگزنڈر برنس نے ۱۸۳۱ء میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سندھ سے پنجاب کا سفر کیا اور سندھ کی اہمیت انگریزوں کی نظروں میں اجاگر ہوئی۔ انھوں نے سندھ پر قبضے کے لیے ابتدائی خدوخال تیار کرنے شروع کیے۔

میروں کی بدقسمتی یہ بھی رہی کے پے در پے حالات غیر موافق ہوتے چلے گئے اس دوران افغانستان سے شاہ شجاع ایک لشکر لے کر سندھ آن پہنچا۔ میروں اور افغانوں کے درمیان سکھر کے قریب " کھرڑی " کے مقام پر جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے مشاورت کی اور تالپوروں کو ایک لاکھ تاوان شاہ شجاع کو پیش کرنے کے عوض اس جنگ سے نجات ملی۔

اس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ ملتان پہنچ آیا اور اس نے بھی سندھ پر نظریں گاڑ لیں۔ انگریزوں نے اس سے بھی میروں کے حق میں سفارت کاری کی اور وہ پچیس لاکھ کا تاوان لے کر ٹلا۔

ان سارے حالات میں انگریزوں نے میروں کے ساتھ مختلف معاہدے کیے۔ یہ سارے معاہدے ایسی شاطرانہ چالوں سے بھرے ہوئے تھے جن سے بظاہر میروں کی حمایت لیکن بباطن سندھ پر قبضہ کرنے کی ہوس نمایاں تھی۔ دوسری طرف میر بھی تاوان ادا کر کے معاشی طور پر بہت کمزور ہو چکے تھے۔ میروں کی معیشت کے کمزور ہونے پر سارا بوجھ عام عوام کی طرف منتقل ہوتا جس سے عوام میں بے چینی بڑھنے لگتی۔

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ

برطانوی نمائندے سندھ کے مختلف علاقوں کے دورے کرتے اور سندھ کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر افغانستان اور زارِ روس پر نگاہ رکھنے کے لیے اس علاقے پر انگریزوں کے قبضے کو ناگزیر خیال کرتے ہوئے متعلقہ رپورٹس اعلیٰ حکام کو ارسال کرتے۔ برصغیر پر تادیر قبضے کے لیے کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ اور اس کو اپنے زیر تسلط رکھنا بھی بے حد ضروری تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے انگریزوں نے اپنے آزمودہ اور کارآمد نسخے تجارت کو آزمایا اور ناتھن کرو نامی انگریز کے ذریعے کراچی کے قریب تجارتی کوٹھی (گودام) کے ذریعے مختلف اجناس کی تجارت کا بہانہ بنایا۔ لیکن تالپوروں کو کئی مرتبہ شکایات ملیں کہ اس شخص کی حرکات وسکنات مشکوک ہیں۔ آخر کار میروں نے ناتھن کرو کو بیک بینی و دو گوش سندھ سے بے دخل کر دیا۔

اس عمل کو انگریزوں نے بالکل پسند نہیں کیا اور وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ سندھ پر قبضہ اب ان کی ضرورت بن گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ افغانستان سندھ کے راستے جب بار برداری کے جانور اور سامان رسد پہنچانے کی کوشش کی گئی میروں نے اس عمل میں بھی روڑے اٹکائے۔ کرنل پوٹنگر نے سندھ کا دورہ کیا کچھ معلومات حاصل کیں۔ انگریزوں نے ۲۴ جون ۱۸۳۹ء کو میروں سے ایک نیا معاہدہ کرنے کی کوشش کی لیکن تالپوروں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ سارے عوامل انگریزوں کو سیخ پا کرنے کے لیے کافی تھے۔

اس عمل کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کرنل ہنری پوٹنگر نے برطانوی حکام کو خط لکھا اور کراچی پر حملے کا مشورہ دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میروں کو اس سارے عمل سے بے خبر رکھنے کے لیے دوستی اور مختلف معاہدوں کے سبز باغ بھی برابر دکھاتا رہا۔

ان اطلاعات کی بنیاد پر برطانوی حکام نے لارڈ آک لینڈ کو کراچی پر قبضے کا مشن سونپا۔ کراچی پر حملے کے لیے بمبئی کے آرمی کمانڈر ان چیف "جان کیان" کو فوجی دستے کے ساتھ سندھ کی جانب روانہ کیا۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ کراچی کی بندرگاہ پر انھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے بھرپور تیاری کی اس تیاری کا احوال سید ادیب حسین اپنی کتاب کراچی اور اس کی بندرگاہ میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> انگریزوں کو خدشہ تھا کہ انھیں یہاں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے بہت زیادہ تیاریاں کی ہوئی تھیں۔ اس حملے میں برطانیہ کے چار عظیم جنگی جہاز نے کونسٹنس (Constance)، برنائس (Bernice)، ایوفریٹس (Euphrates) اور ایلگرائین (Algerine) بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ممبئی نیول ڈاک یارڈ میں شاہی بحری بیڑے کے لیے تیار کیے جانے والے فلیگ شپ ایچ ایم ایس ولزلی (HMS Wesllesely) کو بھی خاص طور پر اس جنگ میں شامل کیا گیا تھا صرف ایک جہاز پر ۷۴ توپیں نصب تھیں۔ ۱۱

اس قدر تیاری کے ساتھ جب کراچی کی بندرگاہ پر حملہ کیا گیا تو اس کا صاف نتیجہ کراچی کی شکست کی صورت میں نکلنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس جنگ میں حصہ لینے والے ایک کیپٹن نیل اپنی یادداشتوں میں اس بات کی تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ کس قدر آسانی سے انھوں نے منوڑا جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ بغیر کسی مزاحمت

کے۔اس زمانے میں منوڑا قلعہ پر کمانڈر واصل بن بچہ تعینات تھا۔جس کو انگریزوں نے اپنے جہاز ایچ ایم ایس ولزلی پر لے جا کر مذاکرات کے بعد معاہدے پر دستخط کروالیے۔جس کی رو سے کیماڑی اور منوڑا کو اپنے تصرف میں رکھا باقی کراچی کا نظم ونسق تالپوروں کے پاس رہنے دیا۔

دوسری جانب ۱۸۴۲ء میں افغانستا ن کے محاذ سے پسپا ہوکر آنے والے چارلس نیپیئر کو سندھ میں برطانوی فوج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تو اس نے بھی روایتی مکاری اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے اثر ونفوذ کو سندھ میں بڑھانے کی کوشش جاری رکھیں۔

اس کی انہی ریشہ دوانیوں کا حال جناب سید ادیب حسین اپنی کتاب کراچی اور اس کی بندر گاہ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> جب ۱۸۴۲ء میں افغانستان کے محاذ سے پسپا ہوکر آنے والے چارلس نیپیئر کو سندھ میں تعینات کی گئی برطانوی افواج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تو اس شخص نے فوجی ہونے کے باوجود اپنی شاطرانہ چالوں کا جال بچھا دیا۔اس نے اسماعیلی فرقہ کے مذہبی پیشوا "حسن علی شاہ" اور میر مراد علی تالپور کو جال میں پھنسانے کے بعد ان کی مدد سے سندھ کے مختلف حصوں پر قابض ہوتا چلا گیا۔ اور جب سندھ کے ایک دوسرے حاکم میر نصیر خان تالپور نے اسے روکنے کی کوشش کی تو حیدآباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر میانی کے قریب اس کا انگریز فوجوں سے ٹکراؤ ہوا لیکن میر نصیر خان کو اس کے اپنے ہی لوگوں کی بے وفائی اور سازش نے ہتھیار ڈالنے پر مجبو رکر دیا اور ۱۹ فروری ۱۸۴۳ء کے دن حیدر آباد کے قلعے پر انگریزوں کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔"[۱۲]

سندھ پر انگریزوں کے قبضے پر ایک اور اقتباس جو سید مظہر علی کی کتاب آشوب سندھ اور اردو فکشن سے لیا گیا ہے مزید راہ نمائی کرتا ہے۔سید مظہر علی لکھتے ہیں

> سندھ پر انگریزوں کی عمل داری ۱۸۴۳ء میں جنگ میانی کے فتح کے بعد مکمل ہوسکی تھی۔ یہ جنگ میر پور خاص اور حیدر آباد کے امیر میر محمد خان اور انگریزوں کے درمیان لڑی گئی تھی جس میں سندھی فوج کے سردار ہوش محمد خان شیدی (جنھیں عرف عام جنرل ہوشو بھی کہا جاتا ہے) نے "مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں" (مرتے مرجائیں گے سندھ پر قابض نہ ہونے دیں گے) کا دلیرانہ نعرہ لگایا تھا اور آخر کار انگریزوں سے لڑتے لڑے شہادت پائی۔ ہوشو شیدی کی

جرأت مندی اور حب الوطنی سے قطع نظر یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ سندھ میں انگریزو
ں کی فتح کا بڑا سبب نہ صرف انگریزوں کی بہتر اور منظم فوجی حکمت عملی تھی بلکہ بہت حد تک
تالپوروں کی انتہائی غیر منظم فوج، افراتفری اور بدنظمی بھی وجہ شکست بنی۔اس پر مستزاد بعض
غدارانِ سندھ کی مفاد پرستی اور ابن الوقتی نے بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔یہی وہ فیصلہ کن جنگیں
تھیں جن میں فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزی اقتدار کا قیام ممکن ہوسکا۔[۱۳]

انگریزوں کا دور حکومت

انگریزوں (۱۸۴۳ء سے ۱۹۴۷ء) نے برصغیر کے باقی علاقوں کی طرح سندھ پر اپنا تسلط جما لیا۔ کراچی اور اس کے گرد ونواح میں جب حیدر آباد کے انگریزوں کے ہاتھ جانے کی خبریں پہنچیں تو کراچی کے مضافات کے لوگ سخت مشتعل ہوگئے اور انھوں نے کراچی میں انگریزوں اور سیٹھ ناؤمل ہوت چند کے گھر کی طرف بڑھنے کی کوشش کی جس پر ناؤمل بھاگا بھاگا کراچی میں برطانوی فوج کے انچارج کیپٹن پریڈی کے کیمپ آفس جا پہنچا اور اسے بلوچوں کی طرف سے کیے جانے والے حملے کے متعلق بتایا۔

کیپٹن پریڈی نے ناؤمل کا شکریہ ادا کیا اور پھر تالپوروں کے ٹیکس کلیکٹر آفس پہنچ گیا وہاں سے اُن کو ساتھ لے کر ٹاؤن ہال کراچی آیا۔کیپٹن پریڈی کے حکم پر ٹاؤن ہال کی عمارت سے تالپوروں کا جھنڈر اُتارنے کے بعد یونین جیک لہرا دیا گیا۔

اس کے بعد کیپٹن پریڈی نے شہر کے دونوں دروازوں پر انگریز فوجی متعین کر دیے اس کے بعد ایک حکم نامہ چھپوا کر ٹاؤن ہال کی عمارت کے ساتھ ساتھ کھارادر، میٹھادر کی دکانوں اور گھروں پر چسپاں کرادیا اس پر تحریر تھا۔

"آج بتاریخ ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء سے کراچی شہر مکمل طور سے برطانوی عمل داری میں آگیا ہے"

یوں بغیر کسی مزاحمت کے کراچی انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔انگریزوں کے دور میں سندھ اور کراچی کو اس نئی انتظامیہ نے جو تنظیمی بنیادیں فراہم کیں ان کا تذکرہ از بس ضروری ہے۔

کراچی اپنی بندرگاہ کی وجہ سے انگریزوں کے دل میں گھر کر گیا اور کراچی کی تعمیر وترقی انگریزوں کے دور سے ہی باقاعدہ ہوئی حیدر آباد کی سخت گرمی سے گھبرا کر انگریز جلد ہی اس شہر کو مستقل مستقر بنانے پر مجبور ہوگئے سارے نظم ونسق کا کراچی منتقل ہونا کراچی کے لیے سودمند ثابت ہوا اور کراچی کی شکل بدلتی چلی گئی۔

کراچی نے اس سے پہلے کلھوڑو، تالپوروں کے ادوار دیکھ رکھے تھے لیکن اس حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں کہ انگریزوں کی تہذیب کی جدت کے سامنے یہ دونوں ادوار پھیکے پڑ گئے۔ انگریزوں کی جاندار تہذیب وتمدن کی چھاپ شہر کے لیے سودمند ثابت ہوئی وہ شہر جو کسی طور بھی جدید نہیں کہا جاسکتا بہت جلد ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

وہ شہر جو فصیلوں اور دروازوں کے اندر مقید اور خوابیدہ تھا اس دور میں انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور آہستہ آہستہ پورے عالم میں مشہور ہوگیا۔

کراچی کی اسی تبدیلی اور نئی جون اختیار کرنے پر محمد حنیف رضا اپنی کتاب "Karachi the show window of Sind" میں لکھتے ہیں۔

> "This was the period when Karachi began to take the shape of modern town. Quite a few public buildings came up and many roads were laid out. These roads wer name after the name of British Officials who were then controlling the destiny of Karachi." 14

> ترجمہ: "اسی عرصے کے دوران کراچی ایک جدید شہر کی شکل میں اُبھرا۔ نئی عمارتیں اور سڑکیں بنائی گئیں۔ ان سڑکوں کے نام کراچی کے اُس وقت کے مختلف منتظمین کے نام پر رکھے گئے"

کراچی انگریزوں کے زیرنگین آنے سے پہلے اپنی بندرگاہ کی وجہ سے تجارتی، معاشی سرگرمی کی ابتداء کر چکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے انگریز اس کی طرف یوں راغب بھی ہوئے۔ انگریزوں کے اقتدار نے اس تجارت کو مزید مہمیز دی اور کراچی کی دوسرے ممالک سے تجارت کئی گنا بڑھ گئی۔

کراچی پر مکمل برطانوی قبضے کے بعد بھی شروع میں حیدرآباد دارالخلافہ رہا لیکن جلد ہی حیدرآباد کی گرمی سے گھبرا کر کراچی کا انتخاب کیا گیا۔ یوں انگریزوں کی تمام انتظامی مشینری ستمبر ۱۸۴۳ء تک حیدرآباد سے کراچی منتقل کردی گئی۔

سندھ کا پہلا گورنر چارلس نیپیئر چار سال سال تک سندھ کا گورنر رہا۔ چارلس نیپیئر کے بعد سندھ کی جدا صوبے کی حیثیت ختم کر کے اس کو بمبئی میں ضم کردیا گیا۔

ساتھ ہی ساتھ چارلس نیپیئر کے بعد سندھ کے سربراہ کو کمشنر ان سندھ یا کمشنر سندھ کہا جانے لگا۔

چارلس نیپیئر کے بعد سندھ کے ۱۶ (سولہ) انگریز کمشنر اور ۱۹۳۶ء میں سندھ کے دوبارہ صوبہ بن جانے کے بعد تین گورنرز مقرر ہوئے یہ دور ۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک محیط اس سو سال کے دوران کراچی کا ہر شعبہ، ہر محکمہ جیسے تعلیم، صحت، تجارت، ضلعی انتظامیہ، عمارات، سڑکیں، بندرگاہ، پولیس وغیرہ ترقی کی نئی منازل طے کرنے لگا۔ چارلس نیپیئر سے استعفیٰ لینے کا فیصلہ یوں ہوا کہ اب انگریزوں کو کسی فوجی سربراہ کے بجائے کراچی اور سندھ کے نظم ونسق چلانے کے کسی سول شخص کی خدمات درکار تھیں لہذا چارلس نیپیئر کو واپس بلا کر ان کی جگہ پہلے انگریز کمشنر ان سندھ رابرٹ کیتھ پرنگل (Mr. Robrt Keith Pringle) کی تعیناتی عمل میں لائی۔

یوں یہ سلسلہ چل نکلا برطانوی دور بلا شبہ ایک طویل، متحرک اور کراچی کو ایک میگا سٹی بنانے کی بنیاد فراہم کرنے والا دور تھا۔ مختصراً اس دور میں کراچی کی ترقی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ضروری ہے تا کہ کراچی کی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی ایک تصویر سامنے آجائے۔

کراچی کی تعلیم برطانوی عہد میں

برطانوی عہد سندھ کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے تعلیم کے لحاظ سے نہایت سود مند ثابت ہوا۔ انگریزوں نے اس عہد میں عوام کو سہولیات دینے کے لیے مختلف منصوبے شروع کیے جن سے عوام کی زندگی قدرے بہتر ہوئی۔ سندھ کہانی میں کیول رام رتن ملکانی اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> سندھ کو انگریزوں کے عظیم ترین تحائف میں جدید تعلیم اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابری کی پالیسی شامل تھی۔ مسلمانوں کی حکومت میں ہندوؤں کو گھوڑے پہ سوار ہونے، زمین کی ملکیت رکھنے اور فوج میں شامل ہونے کی ممانعت تھی۔ ۱۸۴۳ء میں جب ہندوؤں کی آبادی ۲۵ فی صد تھی، ان کی ملکیت میں ایک ایکڑ بھی زمین نہ تھی، جب کہ ۱۹۴۷ء میں وہ ۴۰ فی صد اراضی کے مالک تھے۔ لیکن یہ تمام نتائج محض برطانوی نظام کی برکت سے نہ تھے اس میں مقامی آبادی کے عملی ذوق وشوق کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ مسلمانوں میں آغا خان اور محمد علی جناح نے جو سندھ میں پیدا ہوئے تھے سیاست میں شہرت حاصل کی۔ مرزا قلیچ بیگ نے تعلیم، ایڈمنسٹریشن اور ادب کے میدانوں میں نمایاں مقام پایا۔ حسن علی آفندی نے کراچی کا سندھ مدرسہ قائم کیا جس نے سندھی مسلمانوں کی ہر چند کہ بے حد قلیل مڈل کلاس کو جنم دیا۔ غلام محمد

بھرگڑی پہلے سندھی بیرسٹر بنے۔[۱۵]

سندھی کو سرکاری زبان قرار دینے کے بعد اگلا مرحلہ سندھی رسم الخط کا تھا۔ ہندو اس کے لیے دیوناگری کو پسند کرتے تھے جب کہ مسلمانوں کے لیے عربی رسم الخط مناسب تھا۔ انگریزوں نے اس مسئلے کو بھی بخوبی حل کرلیا اور مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق اور دیارام گدومل جیسے ہندوؤں کی معاونت سے سندھی کے لیے عربی رسم الخط کو چن لیا گیا۔ اس گھمبیر مسئلے سے نبٹنے کے بعد انگریز تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ انگریزوں نے مختلف علاقوں میں سکولوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا۔

اس سلسلے میں جو سب سے پہلا سکول قائم کیا گیا وہ ۱۸۴۱ء میں فوجی چھاؤنی کراچی صدر کے علاقے میں تھا۔ اس سکول میں صرف انگریز بچے تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔

اس کے بعد کراچی کے کلکٹر کیپٹن پریڈی کی کوششوں سے چرچ مشنری سوسائٹی سکول (سی، ایم، ایس ہائی سکول) ۱۸۴۵ء میں قائم ہوا اس کی موجودہ عمارت ۱۸۵۲ء میں تعمیر ہوئی۔ زمین کراچی میونسپلٹی نے فراہم کی۔

۱۸۵۵ء میں کراچی کے باسیوں کے لیے ایک اور سکول قائم کیا گیا اس کا نام نارائن جگن ناتھ ویدیا ہائی سکول تھا۔ (این جے وی ہائی سکول) اس سکول کا قیام حکومت اور کراچی میونسپلٹی کے اشتراک سے عمل میں لایا گیا۔ اس سکول کا نام سندھ کے پہلے ڈپٹی انسپکٹر تعلیم جگن ناتھ ویدیا کے نام پر رکھا گیا۔

۱۸۵۹ء کو ایک پارسی سکول پارسی بچوں کے لیے جناب شاپور جی ہرمز جی سپاری والا نے قائم کیا۔ اس کام کے لیے انھوں نے اپنا ذاتی گھر عطیہ کردیا اور سکول کا نام اپنی آنجہانی بیگم کے نام پر "بائی ویر بائی جی سپاری والا" B.V.S بی وی ایس رکھا۔ یہ سکول جلد ہی ترقی کی منازل طے کرنے لگا اور تشنگان علم کی پیاس بجھانے میں مصروف ہوگیا۔

۱۸۶۱ء میں عیسائی (NUNS) کے ایک گروپ نے "سینٹ جوزف کانونیٹ" سکول قائم کیا جس میں مسلم اور غیر مسلم سب لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اس سکول میں لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی۔

مسلمانوں کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ انگریزی سیکھے بغیر ترقی کرنا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اگر سرکاری نوکری حاصل کرنی ہے تو اس کے لیے سرکار کے نظام کی پورے طور پیروی کرنی ہوگی۔ اس عمل سے ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس عمل کو مہمیز دینے کے لیے سرسید کی تحریک نے بھی اہم کام کیا۔

"جناب حسن علی آفندی نے انگریزی تعلیم کی ترویج کے لیے دہلی میں سرسید احمد خان سے ملاقات کی اور ۱۸۸۴ء میں محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ کی ایک شاخ کراچی میں قائم کی۔ حسن علی آفندی اس شاخ کے صدر اور مولوی اللہ بخش سیکریٹری مقرر ہوئے۔"[۱۷]

اسی طرح سکولوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو اس دور میں قائم ہوئے۔ تعلیم کی اہمیت کراچی کے رہنے والے تمام طبقات میں بڑھ رہی تھی۔ ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی غرض ہر کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ آگے بڑھ بڑھ کر تعلیم اور اس کے فروغ میں حصہ بٹا رہے ہیں۔ ذیل میں چیدہ چیدہ سکولوں کی فہرست ہے جو کہ ہم نے عثمان دموہی کی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں سے مرتب کی۔

ہندو سندھی سکول قائم شدہ ۱۸۶۹ء

دھن پات ملیتری پاٹھ شالا ۱۹۱۰ء

ایڈورڈ جیکسن اینگلو ورنا کولر سکول ۱۹۰۸ء

وسطانی سکول ۱۹۱۴ء

خالصہ اینگلو ورنا کولر اسکول ۱۹۱۵ء

ماما پارسی ہائی اسکول ۱۹۱۸ء

ایس سی شاہانی سکول ۱۹۳۳ء

کراچی اکیڈمی ۱۹۱۴ء

کراچی کے اعلیٰ تعلیمی ادارے

۱۸۸۷ء تک کراچی میں کوئی اعلیٰ تعلیمی ادارہ نہ تھا۔ کراچی کے طلبہ میٹرک کے بعد بمبئی، لاہور یا پھر دوسرے شہروں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جاتے۔ اس زمانے کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے شہر کے بااثر لوگوں نے حکومت وقت کے سامنے یاداشت پیش کی کہ کراچی کے طلبہ کے لیے کالج کی منظوری دی جائے۔

جن لوگوں نے یہ یاداشت پیش کی ان محسنین کراچی میں پیش پیش دیارام گدومل، دیارام جیٹھ مل، سیٹھ تریکم داس، دیوان وادھومل، پسٹن جی بہرام جی کوتوال، اودھم رائے مول چند وغیرہ شامل تھے۔

اس یاداشت کے بعد ستمبر ۱۸۸۶ء میں حکومت کی جانب سے کراچی میں ایک کالج قائم کرنے کی اجازت ملی۔ یہ کراچی کا مشہور ڈی جے کالج تھا۔ ۱۷ جنوری ۱۸۸۷ء کو لارڈ ری گورنر بمبئی نے اس کالج کا افتتاح کیا۔اس کالج کا نام "سندھ آرٹس کالج" رکھا گیا۔

شروع میں ایک عمارت کرائے پر لے کر کالج شروع کیا گیا جو بعد ازاں ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۲ء کو سٹریچن روڈ پر نئی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ کالج تقریباً ایک لاکھ چھیالیس ہزار روپے کی رقم سے تیار کیا گیا۔ یہ رقم سندھ کے مخیّر حضرات اور برطانوی حکومت نے فراہم کی۔

دیارام جیٹھ مل نے اس کالج کی تعمیر میں دامے، درمے، قدمے، سخنے غرض ہر طرح مدد کی۔ اس وجہ سے ان کی وفات کے بعد "سندھ آرٹس کالج" کا نام بدل کر "دیارام جیٹھ مل کالج" رکھا گیا جو ڈی جے کالج کے نام سے معروف ہوا۔

سندھ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن تعلیم حاصل کرنے والے اکثر ہندو تھے۔اس کالج سے سندھ کے نامی گرامی لوگوں نے تعلیم حاصل کی، جن میں سے چند نام ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

جی ایم سید سندھ کے مشہور سیاسی راہ نما۔
بھوج سنگھ گرودینومل پہلجانی سندھ اسمبلی کے سپیکر بنے۔
دیپ چند تیج بھنداس اوجھا کراچی میں اوجھا سینی ٹوریم کے بانی۔
غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے پہلے وزیر اعلیٰ۔ قائداعظم کے رفیق۔
صاحب سنگھ چنداسنگھ شاہانی۔ پہلے سندھی جنھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔
حبیب اللہ درویش ایم اے کرنے والے پہلے مسلمان طالب علم، سماجی کارکن
درگا داس ایڈوانی ۱۹۳۷ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے میئر مقرر ہوئے۔ ۱۸

یہ فہرست عثمان دموہی کی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں سے مرتب کی گئی ہے۔

ڈی۔جے کالج گویا سندھ میں ایک تعلیمی انقلاب کا نام تھا۔ اس کالج نے ایک طرف سندھ کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا وہیں کراچی کے لوگوں کو بہترین پلیٹ فارم مہیا کیا تاکہ وہ کراچی کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر سکیں۔

ڈی۔جے کالج کے بعد کراچی میں انجینئرنگ کالج قائم کیا گیا۔ یہ کالج ایک مخیّر پارسی نادرشاہ ایڈلجی

ڈنشا کے خطیر، عطیہ سے تعمیر کیا گیا۔ نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا نے تقریباً دو لاکھ روپے اس کالج کے لیے مہیا کیا۔ یہ کالج یونیورسٹی کے طور پر اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ اس کالج کی تعمیر ۱۹۲۱ء میں عمل میں لائی گئی۔

کراچی میں قانون کی تعلیم کے لیے ۱۹۲۵ء میں ایس سی شاہانی لاء کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نام تو اس کا سندھ کالجیٹ بورڈ لاء کالج تھا لیکن پرنسپل ایس سی شاہانی کے نام پر ایس سی شاہانی لاء کالج رکھ دیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد تمام ہندو اساتذہ ہندوستان چلے گئے تو مجبوراً کالج کو بند کرنا پڑا۔

طب کی تعلیم کے لیے ۱۹۴۶ء میں ڈاؤ میڈیکل کالج قائم کیا گیا۔ طلبہ کو ایم بی بی ایس کی ڈگری تعلیم مکمل کرنے پر دی جاتی۔ اس کالج کا افتتاح گورنر سندھ مسٹر ڈاؤ نے کیا انھیں کے نام پر اس کا نام ڈاؤ میڈیکل کالج رکھا گیا۔

سندھ میں ڈاکٹروں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کالج نے شاندار کردار ادا کیا ہے۔

سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی صورتحال

سندھ میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ سندھ میں غیر مسلموں کی تعداد ۲۰ فی صد سے زیادہ نہ تھی لیکن ان میں محنت اور ہمت سے آگے بڑھنے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ مختلف سکولوں کے بننے سے غیر مسلموں نے ان سے استفادہ کیا اور تعلیمی میدان میں مسلمانوں پر سبقت لے گئے۔ مسلمان طلبہ کا تناسب سکولوں اور کالجوں میں بے حد کم تھا۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو مدنظر رکھ کر ان کے لیے علی گڑھ جیسے عظیم ادارے کی بنیاد رکھی۔

سید امیر علی نے ۱۸۷۷ء میں کلکتہ میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے نام سے مسلمانوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم نے سندھ کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جناب حسن علی آفندی اس تنظیم کے سرگرم رکن تھے۔

اس تنظیم نے اس وقت کے وائسرائے ہندے لارڈ رپن کو ایک یادداشت پیش کی جن میں مسلمانوں کی انگریزی تعلیم سے عدم دلچسپی کے مختلف نکات پیش کیے گئے اس یادداشت کے نتیجے میں حکومت برطانیہ برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ابتری کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن کے سربراہ ولیم ولسن ہنٹر ہے۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سندھ کے بارے میں درج ذیل رائے بیان کی۔

"۸۲-۱۸۸۱ میں بمبئی ریذیڈنسی میں کل اسکول جانے والے بچوں میں مسلمان بچوں کا تناسب صرف ۲ء۱۱ فیصد تھا جب کہ کالجوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد انتہائی کم یعنی صرف ۴ء۱ فیصد تھی۔ سندھی مسلمانوں کی تعلیمی بدحالی کی وجہ ان کی مالی پس ماندگی کو قرار دیا گیا۔"[۱۹]

سندھ کی تعلیمی پس ماندگی کو کم کرنے میں جسٹس امیر علی اور حسن علی آفندی کا کردار سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ حسن علی آفندی نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش شروع کیں اور ان کی مساعی سے سندھ مدرسۃ الاسلام کا قیام عمل میں لایا گیا جو مسلمانوں کی علمی پیاس بجھانے میں سرگرم عمل ہوگیا۔

شروع میں بولٹن مارکیٹ کے قریب ایک مختصر عمارت کرایے پر حاصل کی گئی اور ۳۰ اگست ۱۸۸۵ء کو جمعۃ المبارک کے مبارک دن یہ عظیم مدرسہ قائم ہوا۔ مدرسے کی جدید عمارت کے لیے جناب حسن علی آفندی نے سندھ، برصغیر پاک و ہند کے کونے کونے سے چندہ اکٹھا کیا اور یوں ۴ نومبر ۱۸۸۷ء کو نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ستمبر ۱۸۹۰ء کو اس کی تکمیل ہوئی۔

نومبر ۱۸۹۰ء کو یہ مدرسہ نئی عمارت میں منتقل ہوا۔ اس مدرسے نے جلد ہی سندھ کے سکولوں، کالجوں میں اپنا ایک نام بنالیا۔ اس نے شبانہ روز ترقی کی اور سندھ کی دھرتی سے وہ سپوت پیدا کیے جنھوں نے برصغیر کی تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح اس مدرسے کے طالب علم رہے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالمجید سندھی، سر شاہ نواز بھٹو، سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر غوث بخش بزنجو، جی الانہ، اے کے بروہی، ہاشم گزردر، جی ایم سید، غلام محمد بھرگڑی نے بھی اسی ادارے سے تعلیم پائی۔

تعلیم کی یہ روایت جو سندھ مدرسۃ الاسلام نے شروع کی تھی اس کا منتہا سندھ یونیورسٹی کی صورت میں سامنے آیا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو کراچی میں سندھ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۵۳ء میں کراچی کے لیے علیحدہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جو یونیورسٹی آف کراچی کہلائی۔

برطانوی دور میں کراچی کی معاشی ترقی اور بندرگاہ

۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی عرصے میں جب سندھ پر انگریزوں کا قبضہ رہا سندھ کے جس شہر نے

سب سے زیادہ ترقی کی وہ کراچی ہی تھا۔کراچی اپنی جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے ہمیشہ سے معقول آمدنی پیدا کرنے والا شہر تھا۔انگریزوں کی آمد سے اس عمل کو مزید مہمیز ملی۔کراچی ابتدا سے ہی تجارتی شہر تھا۔یہاں سے مسقط،کویت،عرب کے دوسرے علاقوں کے لیے تجارتی جہاز آتے جاتے تھے۔کراچی کی بندرگاہ جو اس زمانے میں زیادہ بڑے جہازوں کے لیے موزوں نہ تھی اس پر بہت زیادہ کام کیا گیا۔گہرائی میں اضافہ،کیماڑی واٹر بریک بنانے سے بندرگاہ آہستہ آہستہ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بننے لگی۔

احمد حسین صدیقی اپنی کتاب گوہر بحیرہ عرب میں لکھتے ہیں۔

> ۱۸۶۱ء میں بندرگاہ کی حفاظت اور ترقی کے لیے مزید کام کیے گئے جن میں اہم کام بندرگاہ کے پانی کی تہہ کو گہرا کیا گیا۔کیماڑی گروئن بنائی گئی اور نیٹی جیٹی بنائی گئی لیکن بندرگاہ میں ٹھہرے ہوئے جہاز مون سون ہواؤں سے اٹھنے والی موجوں سے محفوظ نہ تھے۔لہٰذا جہازوں کی حفاظت اور طوفانی موجوں کا زور توڑنے کے لیے منوڑہ پوائنٹ سے پندرہ سو فٹ دور تک سمندر میں چھ فٹ چوڑی ایک موج شکن(Break Water) تعمیر کرائی گئی۔اس دیوار کی تعمیر ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی اور چار سال بعد ۱۸۷۴ء میں مکمل ہوئی۔۱۸۸۲ء میں بڑے جہازوں کے لیے جیٹی بنائی گئی۔۱۹۳۰ء میں ویسٹ وہارف کو تعمیر کرنے کے لیے جدید طریقوں پر منصوبہ بندی کی گی چنانچہ ۲۸ء۔۱۹۲۷ء میں پہلے دو برتھ پھر مزید دو برتھ ۱۹۲۹ء میں ویسٹ وہارف پر تعمیر کی گئیں۔ ۲۰

انہی اقدامات کی بدولت کراچی کی بندرگاہ ۱۹۴۷ء تک ایک مصروف بندرگاہ کا روپ دھار چکی تھی۔ انگریزوں کے عنان اقتدار سنبھالنے سے بندرگاہ پر خصوصی توجہ دی گئی جس وجہ سے کراچی کی تجارتی سرگرمیاں بے حد تیز ہوگئیں روزگار کے مواقع بڑھنے لگے اور شہر جدید سے جدید تر ہوتا چلا گیا۔

۱۸۹۰ء میں کراچی چیمبر آف کامرس کا قیام عمل میں آیا۔ابتدا میں یورپین تُجّار نے جو اس وقت تجارت پر چھائے ہوئے تھے اس کام میں سرگرمی دکھائی لیکن بعد میں مقامی تاجروں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کیا اور ۱۹۰۰ء تک کراچی چیمبر آف کامرس کے ۳۲ ممبران بن چکے ہیں جن میں چھ مقامی بھی تھے۔

انگریزوں کے دور میں ریل کی شکل میں ایک تیز رفتار سواری مقامی لوگوں کی رسائی میں آچکی تھی۔۱۸۶۱ء میں کراچی سے کوٹری تک ۱۰۰ میل لمبی ریل کی پٹڑی بچھائی گئی۔مختلف دریاؤں پر پل بنائے گئے

جس سے تجارت میں آسانی اور تیزی پیدا ہوئی۔ اسی طرح ۱۸۶۱ء میں امریکی خانہ جنگی کی وجہ سے سندھ کی کپاس کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ یہ سارا مال کراچی کی بندرگاہ کے توسط سے ہی دیار غیر پہنچایا جاتا۔

انگریزوں نے بندرگاہ سے ملحقہ علاقوں سے بندرگاہ تک سامان رسد پہنچانے کے لیے بڑی بڑی سڑکیں، اندرون سندھ اور پنجاب کے تاجروں کے لیے دریائے سندھ میں جدید اسٹیمر چلائے گئے جس سے سامان مزید تیزی اور حفاظت سے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچے گا۔

بندرگاہ کے دھانے پر پہنچنے والے جہازوں کی راہ نمائی کے لیے لائیٹ ہاؤس تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر ۱۸۸۹ء میں مکمل ہوئی۔

ان عوامل کی وجہ سے کراچی جو اپنی ابتدا میں ایک ملاحوں اور مچھیروں کی چھوٹی سی بستی تھی اب اپنی جون بدل رہا تھا نت نئی ایجادات کراچی پہنچ رہی تھیں جس سے کراچی کے عوام فائدہ اٹھا کر انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ کے قیام کے بارے میں عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

> کراچی بندرگاہ کے معاملات میں مقامی لوگوں کی شمولیت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بمبئی لجسلیٹو کونسل نے ۱۸۸۶ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ ایکٹ نمبر ۶ مجریہ ۱۸۸۶ء پاس کیا۔ اس ایکٹ کے تحت ۱۸۸۷ء میں ہاربر بورڈ کو توڑ کر کراچی پورٹ ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ابتدا میں اس کے ممبران کی تعداد ۹ تھی۔ جن میں چار ممبران حکومت کے نامزد تھے۔ اس کا نواں ممبر کلکٹر کراچی تھا۔ جو اس کا چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو تھا۔ اسے بھی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ یہ کراچی بندرگاہ کے تمام انتظامی امور کا ذمہ دار تھا۔ چیئرمین عہدے کی مدت کا تعین حکومت کرتی تھی مگر ممبران جنھیں ٹرسٹیز کہا جاتا تھا کے عہدوں کی مدت دو سال تھی۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کو بندرگاہ میں تعمیرات کرانے، بندرگاہ کی کسی جگہ کو لیز پر دینے اور معاہدات کرنے کا اختیار حاصل تھا۔[۲۱]

کراچی پورٹ ٹرسٹ کے قیام کے بعد بندرگاہ میں تعمیراتی کام، مختلف برتھوں کی تعمیر، لائیٹ ہاؤس میں جدت، جہازوں کو کھینچنے والے کرین، جہازوں کی تعمیر اور مرمت کے لیے گودی کی تعمیر، جہازوں کے لنگر

انداز ہونے کے لیے گنجائش بڑھانا، برتھوں سے ملحق سمندر کی گہرائی کو ۲۷ فٹ تک رکھنا، غرض ہر وہ کام جس سے اس بندرگاہ کو عالمی معیار کی بندرگاہ بنایا جاسکے۔

کراچی میں بینکنگ سیکٹر کی ابتداء

بڑھتی ہوئی تجارت کے تحت کراچی میں بینکنگ سیکٹر کا بھی آغاز ہوا۔ بینکوں کے قیام سے قبل ہندو مہاجن سود پر قرضے فراہم کرتے تھے لیکن جب تجارت بڑھی تو تاجروں، صنعت کاروں کو بڑے پیمانے پر قرضے حاصل کرنے پڑے جس کے تحت کراچی میں بینکاری کو فروغ ملا کیونکہ ہندو مہاجن اتنے بڑے پیمانے پر قرضے فراہم کرنے سے قاصر تھے۔ برطانوی حکومت نے اس عمل کو سہولت فراہم کرنے کے لیے بینکوں کے قیام کی راہ ہموار کی اور کراچی میں پہلا بینک ۱۸۵۸ء میں آگرہ اینڈ ماسٹر مین بینک تھا۔

۱۸۶۱ء میں آگرہ اینڈ یونائیٹڈ سروس بینک نے اپنی مستقل ایجنسی کراچی میں کھولی۔

اس کے بعد کراچی میں آہستہ آہستہ بینکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔

چارٹر بینک آف انڈیا۔

سندھ پنجاب اینڈ دہلی بینک۔

بینک آف بامبے۔

پنجاب بینک۔

وغیرہ

یہ فہرست عثمان دموہی کی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں سے مرتب کی گئی ہے۔

کراچی میونسپل کارپوریشن

انگریزوں کے تسلط میں جانے کے بعد جہاں کراچی کے باقی شعبہ جات نے ترقی پائی وہیں کراچی کی صفائی ستھرائی، پانی کی فراہمی، محکمہ جیل خانہ جات، ڈاک و تار ٹیلی فون کے محکمے بھی آہستہ آہستہ بہتری کی جانب گامزن ہونے لگے۔

کراچی میونسپل کارپوریشن اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ کراچی تالپوروں کے زمانے میں ایک بستی تو تھی

لیکن بنیادی سہولیات کی فراہمی کا کوئی سرکاری مربوط نظام نہ تھا۔

شہر کوڑے سے اٹا ہوتا تھا۔ پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ شہری گھر کے باہر کوڑا پھینکنے کے عادی تھی، گلیوں میں پانی کھڑا رہتا تھا۔ شہر میں بغیر کسی ترتیب کے آبادی بڑھنے سے شہریوں نے شہر کی فصیل توڑ کر اردگرد آباد ہونا شروع کیا۔ انگریز اس سارے عمل کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ چارلیس نیپیئر گورنر سندھ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک کنزروینسی بورڈ (Conservency Board) قائم کیا۔

عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں اس بورڈ کے مقاصد کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

(۱) شہر کی صفائی کے لیے انتظامات کرنا۔

(۲) گندے پانی کے نکاس کا بندوبست کرنا۔

(۳) شہریوں کو پینے کے لیے صاف پانی مہیا کرنا۔

(۴) رات کے وقت شہر میں روشنی کا انتظام کرنا۔[۲۲]

بعد میں آنے والے کمشنر ان سندھ نے انھی خطوط پر کام کو آگے بڑھایا۔ چونکہ آبادی کے بڑھنے سے اور صفائی ستھرائی کا مناسب انتظام نہ ہونے سے شہری بیمار رہنے لگے تھے اس لیے شہر کی صفائی ستھرائی کے عارضی اقدامات کے ساتھ ساتھ سندھ اور کراچی کے انگریز حکمران اس مسئلے کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کے منصوبے بناتے رہے یہی منصوبے آگے چل کر کراچی میونسپل کارپوریشن کی بنیاد بنے۔

اس ادارے کا قیام تو ۱۹۳۳ء میں عمل میں آیا لیکن اس سے پہلے یہ مختلف ناموں سے اہلیانِ کراچی کی خدمت کرتا رہا۔

۱۸۴۶ء	کنزروینسی بورڈ
۱۸۵۱ء	میونسپل کمیشن
۱۸۷۸ء	سٹی میونسپلٹی
۱۹۲۵ء	بورڈ میونسپلٹی
۱۹۳۳ء	میونسپل کارپوریشن

پاکستان کے قیام کے وقت حکیم محمد امین میونسپل کارپوریشن کے میئر تھے اور یہ کراچی کے پینتالیسویں میئر تھے۔

بلدیہ کراچی نے ابتدائی زمانے سے قیام پاکستان تک مختلف شعبوں میں اپنی کارکردگی کے ذریعے بہتری لائی اور کراچی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت رہا کہ اس کو ایسے میئر اور صدر (میونسپل کارپوریشن) کے ملے کہ جنھوں نے واقعتاً کراچی سے محبت کی کراچی کو دل سے چاہا۔ جن کی بدولت کراچی گندگی کے ڈھیر سے ایک میگاسٹی بننے کے قابل ہوا۔

پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب اُہے ڈینھ اُہے شینھ (وہ دن، وہ شہر) میں اُس کراچی کو اس کے میونسپل کے صدر کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> کیا حال سناؤں پرانے کراچی کا؟ لفظوں کے لباس میں اس ماحول کو سامنے نہیں لاسکتا۔ وہ کراچی شہر نہ تھا گلشن تھا، گلستان تھا۔ آبادی ڈھائی تین لاکھ تھی۔ صفائی پورے برصغیر میں پہلے نمبر پر، دو تین لاکھ کی آبادی خوش حال، صاف ستھری اور عمدہ تھی جسے اپنے شہر کی شان کا پورا احساس تھا۔۔۔ بڑی بات یہ ہے کہ نہ جیب کتروں کا خوف تھا نہ چھرا بازوں کا، نہ لٹیروں کا نہ مسجد سے جوتیاں چرانے والوں، نہ مکھیوں کا نہ مچھروں کا، اس قسم کے لوگوں یا کیڑے مکوڑوں کو جرأت ہی نہ تھی کہ کراچی کا قصد کریں۔ ۲۳

آگے چل کر کراچی بلدیہ کے صدر جمشید مہتا نسروانجی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> مسٹر جمشید مہتا کراچی میونسپلٹی کے صدر تھے اور سالہا سال بلا مقابلہ اس عہدے پر منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۳۰ کے آس پاس میں بندر روڈ سے گزر رہا تھا۔ دیکھا کہ جمشید مہتا پیدل ایک زخمی گدھے کو لے کر ہسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی موٹر ان کا ڈرائیور پیچھے پیچھے چلاتا آرہا تھا۔ تماشا دیکھنے کے لیے میں بھی ہسپتال کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ جمشید نے اپنے سامنے گدھے کی مرہم پٹی کرائی اور ڈاکٹر سے بار بار کہتے رہے زخم کو آہستہ صاف کرے تاکہ بے زبان کو ایذا نہ پہنچے۔ مرہم پٹی ختم ہوئی تو ڈاکٹر کی ہدایت کی کہ گدھے کو ان کے ذاتی خرچ پر ہسپتال رکھا جائے اور دانے گھاس کے لیے کچھ رقم بھی ہسپتال میں جمع کرادی۔ دوسری طرف گدھے کے مالک سے کہا جب تک گدھے کا علاج پورا نہ ہو جائے اور وہ کام کرنے کے

قابل نہ ہو جائے ،تب تک وہ اپنی مزدوری کا حساب ان سے لے لیا کرلے اور یہ کہتے ہوئے
کچھ نوٹ پیشگی ہی اسے دے دیے۔ ۲۴

بلدیہ کراچی نے صفائی ستھرائی کے انتظامات، بلدیاتی تعلیمی اداروں کا قیام رہائشی منصوبے، پانی کی فراہمی کے منصوبے، سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر نکاسی آب کے منصوبے، شہر کو بجلی کی فراہمی، ہسپتالوں کی تعمیر، مختلف مارکیٹوں کی تعمیر، عدالتی نظام، غرض شہر کی بناوٹ کے سارے کاموں میں اپنا حصہ ڈالا۔ ظاہر ہے انگریزوں کے دور میں اس سارے عمل میں انگریزوں کی اشیر آباد تو اس ادارے کو حاصل رہی ہوگی تب ہی یہ ادارہ اتنا شاندار کام کر پایا۔

برطانوی دور میں سڑکوں اور شاہراؤں کی تعمیر

تجارتی عمل کو مہمیز دینے کے لیے کسی بھی شہر میں اچھی سڑکوں کا ہونا از بس ضروری ہے۔ برطانوی دور میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سڑکوں کی تعمیر بڑے پیمانے پر کی گئی ان سڑکوں کے نام اس وقت کے انگریز حکمرانوں کے نام پر رکھے گئے جو قیام پاکستان کے بعد تبدیل کر دیے گئے۔

ذیل میں ان مشہور سڑکوں کی ایک فہرست دی جارہی ہے جو اس زمانے میں تعمیر ہوئیں۔

یہ فہرست جناب عثمان دموہی کی کتاب سے مرتب کی گئی ہے۔

پرانے نام	نئے نام
الفنسٹن سٹریٹ	زیب النساء سٹریٹ
موتی لال نہرو روڈ	جگر مرادآبادی روڈ
برنس روڈ	محمد بن قاسم روڈ
پرنس سٹریٹ	چاندبی بی روڈ
شاستری روڈ	ایس ایم سید روڈ
بندر روڈ	محمد علی جناح روڈ
ہیرس روڈ	آغا خان روڈ

کچہری روڈ	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ
فریئر سٹریٹ	ڈاکٹر داود پوتہ روڈ
نیپئیر روڈ	میر کرم علی تالپور روڈ
ولبھ بھائی پٹیل روڈ	نواب اسماعیل خان روڈ
میکلوڈ روڈ	آئی آئی چندریگر روڈ
وکٹوریہ روڈ	عبداللہ ہارون روڈ
ہولاک روڈ	ایوان صدر روڈ
نیوکوئنس روڈ	مولوی تمیز الدین خان روڈ
مشن روڈ	بابائے اُردو روڈ
بونس روڈ	فاطمہ جناح روڈ
گرانٹ روڈ	حسرت موہانی روڈ
فیریئر روڈ	شاہراہ لیاقت

یہ ساری سڑکیں مختلف ادوار میں مختلف کمشنران سندھ کے عہد میں تعمیر ہوئیں مگر ان کی تعمیر سے شہر کی حالت تبدیل ہوتی چلی گئی۔ شہر کے باسی زیادہ تیزی سے سفر کرنے کے اہل ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ کراچی میں ٹرام، بس، کاریں بھی سڑکوں پر نظر آنے لگیں اس طرح برصغیر میں ریل کی آمد بھی ایک بہت بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بنی۔ ریل کی آمد سے نہ صرف یہ فاصلے کم ہوئے بلکہ لوگوں کا کراچی کی طرف آنے کا عمل بھی تیزی پکڑ گیا۔ سندھ کے زمین دار، وڈیرے سندھ کی گرمی سے گھبرا کر کراچی کا رخ کرنے لگے اور انگریزوں کی تہذیب، بود باش، ذرائع آمد و رفت اور اشیائے خورد و نوش سندھ کے دیہاتوں تک جانے لگیں۔ ریل کا آغاز کراچی کے لیے ایک بڑے ارتقائی عمل کی ابتدا تھی۔ کراچی کی موجودہ شکل جیسی کے ہے۔ انگریز دور کی اس پر عظمت ایجاد کا اس میں معتد بہ حصہ ہے۔

برطانوی دور کے کراچی کی چند نامور ہستیاں

قائداعظم محمد علی جناح

بانی پاکستان، محسن پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کھارادر کی نیو نہم روڈ پر واقع عمارت وزیر مینیشن میں پیدا ہوئے اور سندھ مدرسۃ الاسلام کے مختلف اوقات میں طالب علم رہے۔

جمشید نسروانجی رستم جی مہتا

کراچی میونسپلٹی کے صدر بابائے کراچی، کراچی کے بے مثال اور انتھک خادم، بے شمار کام آپ کی کراچی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کراچی کے حقیقی محسن ہیں۔

محمد ہاشم گزدر

کراچی کے بے مثال سپوت آپ کے میئر شپ کے زمانے میں انڈس واٹر سپلائی سکیم منظور ہوئی۔ سندھ اور کراچی کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔

حسن علی آفندی

کراچی کے لیے تعلیمی میدان میں بے مثال کام کرنے والے حسن علی آفندی، سندھ مدرسۃ الاسلام کے بانی، پورے ہندوستان سے چندہ حاصل کر کے کراچی کے لوگوں کے لیے عظیم مدرسہ قائم کیا۔ ان کے بھی کراچی پر بے شمار احسانات ہیں۔

ایڈلجی ڈنشا

پارسی برادری سے تعلق، مخیّر اور سخی آدمی، کراچی میں بے شمار سکول، ہسپتال لائبریریاں آپ کے تعاون سے قائم ہوئیں، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں۔

ہرچند رائے وشنداس

میونسپل کارپوریشن کے گیارہ برس تک مشیر رہے۔ کراچی کے لیے پارک، کھیل کے میدان، سڑکیں، ہسپتال آپ کے دور میں بنے۔

جی الانہ

ادیب، شاعر، مورخ، مدیر، سماجی کارکن اور سیاستدان تھے۔ قائداعظم کے قریبی ساتھی، کئی کتابوں کے مصنف

مسٹر جیمز اسٹریچن

انگریز انجینئر جس نے کراچی کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ واٹر سپلائی، بجلی کے کنکشن، مختلف عمارات، گھر گھر سہولتیں پہنچانے ہیں۔ ان کا کردار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

چارلیس نیپیئر

ایک غاصب مگر جدید کراچی کا خالق، بندرگاہ کی تعمیر و ترقی، قانون پر عمل داری، حیدر آباد سے دارالخلافہ کراچی لایا۔ کئی کتابوں کا مصنف۔

دیارام گدومل

سیشن جج، حق و انصاف کے علم بردار، ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود وہی فیصلہ کرتے جو حق اور سچ ہوتا۔ ہندو لڑکیوں کے لیے آشرم قائم کیا۔

ان شخصیات کے علاوہ بھی کراچی کی ترقی اور موجودہ کراچی کے خدوخال واضح کرنے والی ان گنت شخصیات ہیں جو علیحدہ ایک مقالے کی متقاضی ہیں وقت اور موضوع کی تحدید کی وجہ سے ان کا تذکرہ ترک کیا گیا ہے۔ یہ شخصیات صرف برطانوی عہد تک کا احاطہ کر رہی ہیں۔

برطانوی دور میں سیاست اور سیاسی پارٹیاں

سندھ برطانوی حکومت کے زیر تسلط آنے کے بعد ۱۸۴۷ء میں اپنی صوبائی حیثیت برقرار نہ رکھ سکا اور بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ بنا دیا گیا۔ بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ بننے کے بعد سندھ بمبئی کا ایک عام سا شہر بن کر رہ گیا۔ اب یہاں پر انگریزوں کی طرف سے کمشنر ان سندھ مقرر کیے جائے۔ اہالیانِ سندھ کے لیے سندھ کے اعلیٰ عہدے داروں سے ملنا ایک مشکل کام بن گیا کیونکہ گورنر اُن سے ایک ہزار میل دور بمبئی میں بیٹھا تھا۔ کمشنر ان سندھ گورنر بمبئی کا محتاج رہتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے عوام پر انگریزوں کے ظالمانہ قبضے کے بعد ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہوا جس کی روک تھام کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ عام آدمی پولیس اور اس کے جبر سے بے حد پریشان تھا۔ مسلمان تاجر تجارت میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ ان کے کاروبار ٹھپ ہو رہے تھے۔ سرکاری نوکریوں کے مسلمان اہل نہ تھے۔ وڈیرے اور زمیندار انگریزوں کی خوشامد سے زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ صاحب

بہادر کے لیے شکار کا بندوبست کرنا نذر، نذرانے، تحائف ان سب کا بندوبست کرنے کے لیے ہندو مہاجن سے بھاری سود پر قرض اٹھایا جاتا تھا۔ غرض مسلمانوں کا استحصال پورے زور پر تھا۔

محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں پیر حسام الدین راشدی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> سندھ کے عوام سر سے پاؤں تک ہندوؤں کے مقروض تھے۔ ان کی زمینیں ہندوؤں کے ہاتھ گروی تھیں۔ مسلمان کسان کی ساری کمائی ہندو وڈیروں کے گھر جاتی تھی۔ تجارت پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔ شہر میں اکثریت ان کی تھی۔ تمام ملازمتیں ان کے پاس تھیں۔ مطلب یہ کہ عملاً سندھ کے وہی مالک تھے۔ [۲۵]

ان حالات میں مسلمانوں سے پہلے ہندوؤں نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سندھ کی بمبئی پرزیڈنسی سے علیحدگی کی تحریک شروع کردی۔ آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہر چند رائے وشنداس نے اپنے صدارتی خطبے میں سندھ کو ایک جدا صوبہ بنانے کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ غرض مسلمان اور ہندو مل کر سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی جدوجہد میں شامل رہے۔ تقریباً ۱۹۲۰ء تک یہ دونوں اپنی پوری طاقت سے سندھ کی علیحدگی کے لیے کوشاں رہے۔

جلسے منعقد ہوتے، اجلاس بٹھائے جاتے ان میں ہندو راہ نما مدعو ہوتے تھے۔ بعد میں حالات تبدیل ہوئے ہندو بدظن ہوئے کہ اگر سندھ علیحدہ ہوا تو مسلمان اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے مفادات کا تحفظ نہیں کریں گے۔ اس لیے بعض ہندو اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئے۔

مسلمانوں کی طرف قائداعظم نے سندھ کو جدا صوبہ بنانے کی جدوجہد میں بھرپور کام کیا۔

> ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو قائداعظم کی جانب سے دستوری اصطلاحات پر غور کرنے کے لیے بلائی جانے والی کانفرنس میں سیاسی تنظیموں سے سمجھوتہ کرنے کی جو شرائط پیش کی گئی تھیں ان میں سب سے پہلی شرط سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تھی بعد میں قائداعظم نے اپنے مشہور زمانہ چودہ نکات میں بھی اس مطالبے کو شامل کیا۔ [۲۶]

یہ کوششیں آخر کار رنگ لائیں اور برطانوی حکام نے مجبوراً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کے احکامات جاری کیے۔

اس کے بعد کراچی میں سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا ہوئی۔ سیاسی عمل شروع ہوا اور سندھ کے پہلے گورنر کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔ سندھ کے گورنر "سر لینسی لارڈ گراہم" مقرر ہوئے۔

سیاسی آزادی ملنے کے بعد سندھ بھر میں سیاسی پارٹیوں کی ابتدا ہوئی مختلف پارٹیوں نے اپنے دفاتر کراچی میں قائم کیے۔ جن سیاسی پارٹیوں نے پہلے پہل اپنے دفاتر قائم کیے۔

ان میں سندھ اتحاد پارٹی، مسلم پولیٹیکل پارٹی، سندھ پیپلز پارٹی، آل انڈیا نیشنل کانگریس۔ اس کے بعد مزید پارٹیوں کے دفاتر بھی کراچی میں قائم ہوئے۔ مثلاً آل انڈیا مسلم لیگ، جمعیت علمائے ہند، آل انڈیا خاکسار پارٹی، سندھ مسلم جماعت، جی ایم سید گروپ۔

اس کے علاوہ بھی مختلف پارٹیاں میدان میں آئیں اور انھوں نے بعد کے انتخابات میں حصہ لیا۔ سیاسی بیداری کی لہر پورے ہندوستان میں جاری تھی اور کراچی بھی اس عہد میں ان تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ پورے ہندوستان میں کانگریس، مسلم لیگ کے مابین جاری کش مکش کراچی کے آنگن میں بھی آن پہنچی تھی۔ صوبہ بننے کے بعد ۷ فروری ۱۹۳۷ء کو سندھ اسمبلی کے پہلے انتخابات کا انعقاد ہوا۔

کوئی پارٹی بھی اکثریت نہ حاصل کر سکی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت تو قائم ہوئی لیکن آپس کی کھینچا تانی سے صرف ایک سال چل سکی اس کے بعد اللہ بخش سومرو کی وزارت کا قیام عمل میں آیا جو دو سال بعد ختم ہوئی۔ میر بندے علی تالپور نے مسلم لیگ کی حمایت سے وزارت بنائی لیکن سیاسی استحکام میسر نہ آیا اور صرف آٹھ ماہ بعد اس کا بھی خاتمہ ہوا۔

ان کے بعد دوبارہ اللہ بخش سومرو وزیر اعلیٰ بنے تو دو سال کے عرصے میں سندھ کے اندر بیداری، قومی شعور اور بڑے مقصد سے منسلک ہونے کی وجہ سے بے چینی بڑھتی گئی۔ مسلمان اپنے آپ کو جدا قومیت کے واضح تصور کے تحت دیکھ رہے تھے لوگوں نے دھڑا دھڑ انگریزی خطابات واپس کرنے شروع کیے جس وجہ سے انگریز سرکار خاصی پریشان ہوئی اور انگریز گورنر ہوچ ڈاؤ نے اللہ بخش سومرو کی وزارت کو برطرف کر دیا۔

انگریز گورنر ہوچ ڈاؤ نے غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی ان کے لیے مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ قائداعظم نے مشاورت کے بعد غلام حسین ہدایت اللہ کی حمایت کا اعلان کیا بعد ازاں غلام حسین اپنے رفقا سمیت مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

سندھ اسمبلی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے مطالبہ پاکستان کے حق میں

قرارداد پیش کی جس کو منظور کرلیا گیا۔ یہ تاریخی واقعہ ۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو پیش آیا۔

سندھ اسمبلی کے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو منعقد کیے گئے انتخابات میں مسلم لیگ نے شاندار کامیابی حاصل کی ۔یہ ایک بڑی کامیابی تھی سندھ میں مسلم لیگ کی وزارت مستحکم ہوگی۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو حکومت برطانیہ نے برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا۔ ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کو سندھ اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں صوبائی اسمبلی نے صوبہ سندھ کو پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان کیا۔

پاکستان کے قیام کے بعد غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے پہلے گورنر اور ایوب کھوڑو پہلے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

کراچی انگریزوں کے دور سے ۱۹۴۷ء تک ایک مختصر خاکہ

پیشتر اس کے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے کراچی پر نگاہ ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کے اس سارے سفر کو جو انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء تک جاری رہا ایک نظر دیکھ لیں تاکہ آگے بڑھنا آسان ہو۔

انگریز جب سندھ پہنچے تو ان کا مقصد سندھ کے راستے افغانستان پہنچنا تھا تاکہ وہ روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو محدود کرسکیں۔ سندھ ان کے لیے ایک راستے کی مانند تھا۔لیکن جب انگریزوں کو افغانستان کے محاذ پر ناکامی ہوئی تو سندھ پر انگریزوں نے قبضہ جمالیا۔ شروع کا کچھ عرصہ حیدر آباد کو دارلخلافہ بنایا گیا پھر دارلخلافے کو کراچی منتقل کردیا گیا۔

کراچی اس زمانے میں کوئی قابل ذکر مقام نہ تھا گو کہ بندرگاہ کی وجہ سے شہر کی ایک اہمیت تھی اور انگریز اس اہمیت سے بخوبی واقف تھے لیکن اس شہر کی تجارتی اہمیت سے قطع نظر اس شہر کی حات دگرگوں تھی۔ انگریزوں نے سندھ پر ۱۸۴۳ء میں قبضہ کیا اور سندھ بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ بنادیا۔

اس دوران سندھ کی تجارت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔اس اضافے نے کراچی شہر کی حالت بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔شہر متواتر بڑھتا رہا۔ اس بڑھوتری میں آبادی اور انفراسٹرکچر دونوں شامل ہیں۔

رفعت خان ہیورڈ اس حوالے سے اپنے ایک مضمون " کراچی کے گوئن " میں لکھتے ہیں۔

۱۸۶۵ء میں ملتان اور لاہور کے درمیان ریلوئے لائن تعمیر ہونے کے نتیجے میں پنجاب کی

> تجارت بھی کراچی کے ساتھ مربوط ہوگئی اور اس شہر نے پوری وادی سندھ کی بندرگاہ کی شکل اختیار کرلی۔ امریکی سول وار کے دنوں میں مغربی ہندوستان اور پنجاب میں کپاس کی کاشت میں زبردست اضافے ،۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھلنے اور گودی کے بہتر بنائے جانے کے بعد ۱۸۷۳ء تک کراچی تمام موسموں کے لیے قابل استعمال بندرگاہ بن گیا اور ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر اس کی بنیادیں استوار ہوگئیں۔ ۲۷

انگریزوں نے برصغیر کے باقی علاقوں میں ریل کا مربوط نظام شروع کیا اس عمل سے لوگوں کو نقل وحمل کے تیز ترین وسائل میسر آئے۔ شہروں کے فاصلے کم ہوئے روزگار کے مواقع بڑھے اور برصغیر کے قصباتی شہر آبادی کے اعتبار سے بڑھنے لگے۔ کراچی شہر میں سڑکیں، سکول، کالج ہسپتال جابجا کھلنے لگے اس عمل سے شہر کی وسعت اور آبادی دونو ں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۸ء میں کراچی کو پنجاب اور دہلی سے ملانے والی ریلوئے لائن کا آخری حصہ تعمیر ہوا اس کے بعد شہر کی ترقی کی شرح بے حد تیز ہوگئی۔ اس شہر کے مدمقابل اب کلکتہ اور بمبئی تھے اور یہ شہر ان سے مقابلے کرنے کی سکت رکھتا تھا۔

کراچی کی اس تیز رفتار ترقی اور ڈرامائی تبدیلیوں کا تذکرہ رفعت خان ہیورڈ کے مضمون " کراچی کے گوئن "میں کچھ اس طرح کیا گیا ہے۔

> ۱۹۱۳ء تک آتے آتے کراچی سلطنت برطانیہ میں گندم کی برآمد کی سب سے بڑی بندرگاہ بن چکا تھا اس کی تیرہ اسٹیمر گودیوں میں بعض اوقات سالانہ دس لاکھ ٹن سے سے زیادہ گندم برآمد ہوتی تھی۔ شہر میں ۱۰۴ برطانوی اور ہندوستانی تجارتی فرمیں، ایک درجن بینک ، اتنی ہی جہازران کمپنیاں اور ان سے وابستہ صنعتیں، اسٹیم فلور ملیں، کاٹن پریس، چمڑا رنگنے کے کارخانے اور مقامی خدمات فراہم کرنے والی صنعتوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ۱۹۱۳ء تک کراچی کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار ہوچکی تھی۔ ۲۸

اس کے ساتھ شہر کے مختلف ادارے اپنے وجود کو مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔ بلدیہ کا ادارہ اور اس کے نامزد یا منتخب صدور شہر کی بڑھوتری میں اپنا حصہ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ کراچی کے لیے مختلف منصوبے جن میں بجلی کی فراہمی، نکاسی آب، فراہمی آب بنتے اور کامیاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

قدیم شہر جو صدر اور آس پاس کے علاقوں پر مشتمل تھا اب پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ آبادی میں اضافے

کے نتیجے میں شہر کے تعمیر شدہ رقبے میں تین سمتوں میں پھیلاؤ نظر آتا ہے۔

شمال مشرق کی سمت جہاں دریائے لیاری کی جانب سرکاری باغات تھے (یعنی بعد کے لیاری کوارٹر اور گارڈن کوارٹر) مشرق کی سمت جہاں پرانی فوجی چھاؤنیاں، کیماڑی اور کلفٹن کی مضافاتی بستیاں واقع تھیں اور ائیر فیلڈ کی جانب ڈرگ روڈ پر۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ جنگ عظیم اول اور دوم کا زمانہ ہے۔ کراچی بھی دنیا بھر میں ہونے والی کساد بازاری سے متاثر نظر آتا ہے اس دوران سکھر بیراج کی تعمیر سے سندھ کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ کراچی دوسری جنگِ عظیم میں مشرق قریب کے محاذوں کے لیے سپلائی اور بحری جہازوں کی مرمت کا بڑا مرکز بن گیا۔

اسی دوران کراچی ۱۹۳۶ء میں بمبئی پریزیڈنسی سے الگ ہوا اور نئے صوبے کا صدر مقام بننے سے حالات میں بہتری آئی۔ سرکاری نوکریاں میسر آئیں، پھر سیاسی عمل شروع ہوا اور مختلف وزارتوں کے تجربے کرتا ہو کراچی ۱۹۴۷ء میں داخل ہوا۔

اس مختصر احوال سے کراچی کی ۱۰۰ سالہ تصویر کی ہلکی سی منظر کشی کی گئی ہے آنے والی سطور میں کراچی کا ۱۹۴۷ء سے تا حال ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا تا کہ مقالے کے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

کراچی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک

کراچی کی مشکلات کا زمانہ ختم ہونے میں نہیں آتا مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں کے زخم سہتا ہوا کراچی ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آزادی کے ساتھ پاکستان کا دارالحکومت بنتا ہے۔

موضوع کا تعلق بھی آزادی کے بعد تا حال لکھا گیا کراچی کے متعلق اردو ناول ہے۔ یہ دور جس میں کراچی شہر برطانوی قبضے کے بعد آزادی کی فضا میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اس شہر بے مثال کا تذکرہ اب اور سیاسی حوالے سے ہوگا۔ تا کہ اس شہر کے بسنے والوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس شہر کے باسی کن مشکلات سے گزرے ان کے روز و شب کس فکر میں بسر ہوئے۔ ان کے محلے، خاندان، علاقے میں کیا کیا واقعات پیش آئے یہ سارے اب موضوع کا حصہ ہوں گے۔

کراچی کی تاریخ کو پاکستان کے قیام کے بعد پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے تا کہ اجمال اور تفصیل کو ملحوظ خاطر رکھ کر واقعات ایک زمانی تسلسل سے آپ کے سامنے آجائیں۔

(۱) ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک

(۲) ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک

(۳) ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک

(۴) ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک

(۵) ۱۹۸۷ء سے تا حال

پاکستان کی آزادی کے ساتھ ہی کراچی کو ملکی دارالخلافے کے طور پر منتخب کیا گیا۔

کراچی اس وقت ایک خوبصورت، زندگی سے بھرپور اور معاشی لحاظ سے جاندار شہر تھا۔ شہر میں ہندوؤں کی اکثریت ان کے علاوہ سکھ، پارسی، عیسائی اور دوسری غیر مسلم اقلیتیں آباد تھیں۔

شہر کا انتظام و انصرام ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے ایک غیر مسلم شہر کے طور پر ہی چلاتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے اس شہر کی ایک تصویر جناب اے بی ایس جعفری کی کتاب شہر آرزو، کراچی کی داستانِ غم میں کچھ یوں نظر آتی ہے۔

> جس وقت پاکستان بنا کراچی میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ اس شہر کا تمام تر نظم ونسق غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا اور وہ سے ایک غیر مسلم شہر کے طور پر چلاتے تھے۔ زیادہ تر آبادی ہندو تھی۔ اس کے علاوہ پارسی، سکھ، عیسائی دوسری اقلیتیں تھیں۔ کراچی ایک خوشحال بندرگاہ تھی اور اس کا شمار برصغیر کے بڑے صنعتی اور مالیاتی مرکزوں میں ہوتا تھا۔ یہ برصغیر کا سب سے صاف ستھرا اور منظم شہر مانا جاتا تھا۔ یہاں زندگی پرسکون اور آرام دہ تھی۔ ۲۹

تقسیم کے بعد ہندوؤں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہر سے ہجرت شروع کی۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے کمال ہنرمندی سے سکھوں اور ہندوؤں کو ہندوستان منتقل کرایا۔ اسی طرح پاکستانی صوبہ پنجاب سے بھی سکھ ہجرت کر گئے۔

اسی طرح ہندوستان سے مسلمان بھی پاکستان کے مختلف علاقوں میں پہنچنے لگے۔ ان مہاجرین میں بمبئی۔ کاٹھیاوار، برصغیر کے دوسرے کاروباری مراکز جیسے دہلی، کانپور، مدراس، حیدرآباد، دکن اور مختلف دوسرے شہروں سے مہاجرین پاکستان بالخصوص کراچی پہنچنے لگے۔

سندھ مسلم اکثریتی صوبہ تھا۔ یہاں پر مسلمانوں کی آبادی ۷۵ فیصد تھی لیکن یہ آبادی مسلم وڈیروں اور ہندو ساہوکاروں کے ہاتھوں غلام بنی ہوئی تھی۔ مسلمان کاشت کاروں کی زمین ہندوؤں کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔

ہندوؤں کی تعداد سندھ میں قریب قریب ۲۵ فیصد تھی لیکن وہ تقریباً آدھی زمین کے مالک تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت جو بہت پست تھی، کسی بھی آسامی کو پر کرنے کے لیے کم سے کم قابلیت کے مسلمان بھی دستیاب نہیں تھے۔

کراچی میں ہندوؤں کی اکثریت کی وجہ سے غریب مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ مسلمانوں کے علاقوں میں بنیادی سہولتوں کا فقدان تھا۔ اے بی ایس جعفری اپنی کتاب "شہر آرزو، کراچی کی داستان غم" میں لکھتے ہیں۔

> کراچی کے علاقے لیاری میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی۔ وہاں لوگوں کو سال بہ سال زمین کی لیز دی جاتی تھی۔ کراچی میونسپل کارپوریشن یہاں بنیادی سہولتیں مثلاً پانی، بجلی، سڑکیں، وغیرہ فراہم کرنے کی ذمہ دار نہیں تھی۔ اس کے برعکس شکار پور کالونی، جمشید روڈ اور کچھ دوسرے علاقوں میں جہاں دولت مند ہندو آباد تھے، انھیں ۹۰ سال کی لیز دی جاتی اور تمام شہری سہولتیں فراہم کی جاتیں۔ ۳۰

اور اسی وجہ سے شاید جی ایم سید سندھ کے مشہور قوم پرست لیڈر نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۳۱ ویں اجلاس میں جو کراچی منعقد ہوا ہندوستان کے رہنے والوں سے درج ذیل اپیل کی۔

> ہندو سندھ میں رہنے کے باوجود بھارت کے ہندوؤں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ اس لیے سندھ کے مسلمان بھی امید رکھتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمان ان (یعنی سندھی مسلمانوں) کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔ بھارت کے مسلمان ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ سندھ کے رہنے والے زراعت سے وابستہ ہیں اور تجارت میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لیے بھارت کے مسلمان سندھ میں آکر اپنے تجربے اور مہارت سے تجارت میں سندھی مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کر سکتے ہیں اور سندھ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ۳۲

جی ایم سید کے پیش نظر شاید سندھی مسلمانوں کی محرومیاں ہوں گی اس لیے انھوں نے ہندوستان کے

مسلمانوں سے مدد مانگی۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کا عرصہ پاکستان کے لیے سیاسی عدم استحکام کا زمانہ تھا۔ قائداعظم کی وفات ان کے بعد لیاقت علی خان کی شہادت یہ دو ایسے سانحے تھے۔ جن سے آج تک خون رس رہا ہے۔ مسلمانوں کے یہ دو عظیم راہ نما ابتدائی عرصے میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد ۱۹۵۸ء تک پاکستان کی کشتی حوادث میں ہچکولے کھاتی رہی۔ لیاقت علی خان کی وفات کے بعد وزیراعظم خواجہ ناظم الدین اور گورنر جنرل غلام محمد بنے ان کے بعد تو جیسے قطار ہی لگ گئی وزیراعظم یکے بعد دیگرے تبدیل ہوتے رہے۔ خواجہ ناظم الدین کے بعد محمد علی بوگرہ اُن کے بعد چوہدری محمد علی پھر حسین شہید سہروردی پھر ابراہیم اسماعیل چندریگر اُن کے بعد فیروز خان نون پھر ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب کا دور شروع ہو گیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک اس سارے عرصے میں سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے ملک کی مجموعی صورتحال ابتر رہی۔ اس کے اثرات پورے ملک پہ پڑے اور کراچی تو خاص طور پر متاثر ہوا، مہاجرین کی آمد جاری تھی وسائل کی کمی ان کو کہیں بسانے کی راہ میں حائل تھی۔

ہندوؤں کے چلے جانے سے مڈل کلاس کا مکمل انخلا ہو چکا تھا اور شہر میں اس خلاء کو پر کرنے کے لیے ہنر مند، تجربہ کار اور مختلف پیشوں میں مہارت رکھنے والے افراد کی سخت کمی تھی۔

ہندوستان کے تمام علاقوں سے مہاجر پاکستان آئے زیادہ تر شہری علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ ہندوستان کا وہ مسلمان جو زرعی زمین رکھتا تھا اُن کی اکثریت پاکستان نہیں آئی۔ کیوں کہ ان کی زندگی ان کی زراعت کے گرد گھومتی تھی۔ مہاجرین کی اکثرت باشعور تھی یہ پڑھے لکھے ہنر مند لوگ تھے، پاکستان ان کی خوابوں کی زمین تھا۔ یہ لوگ خود شعوری طور پر ہجرت کا دکھ برداشت کر رہے تھے۔ ان کی جدوجہد سے پاکستان نے انگریز سامراج سے آزادی حاصل کی تھی ان کے لیے پاکستان کی طرف ہجرت ایفائے عہد کا درجہ رکھتی تھی۔

ڈاکٹر اسرار اپنی کتاب استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ میں لکھتے ہیں۔

> یہاں وہ لوگ ایک لسانی قومیت کی شکل میں سامنے آئے یا لائے گئے جو "ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی"! پر عمل پیرا ہو کر محض اسلام کے نام پر ہندوستان کے کونے کونے سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور جنھوں نے رنگ و نسل، شکل و صورت، وضع قطع اور تہذیب و ثقافت کے جملہ امتیازات کو نظر انداز کر کے اس ملک کا رخ کیا تھا جو اسلام کے نام پر

وجود میں آ رہا تھا اور ان علاقوں کو خیر آباد کہہ دیا جن میں وہ پشت ہا پشت سے آباد تھے۔ جہاں ان کے جدی پشتی دلنشین مکان اور آباؤ اجداد کی قبریں تھی اور جہاں کی گلی کوچوں سے اُن کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ ۳۲

مہاجرین کی آمد سے کراچی کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو کراچی کی آبادی کم وبیش پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور ۱۹۵۱ء تک یہ آبادی گیارہ لاکھ کا حدف عبور کر چکی تھی۔ اتنی بڑی نقل مکانی کے ساتھ بے پناہ مسائل بھی کراچی پہنچ چکے تھے۔ مہاجرین کی آبادکاری کیوں کر ممکن بنائی جائے؟ کیسے ان کو اس شہر میں بسایا جائے؟ یہ بڑے سوال تھے جن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہندو کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا تھا ان کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائیدادیں جو اندرون سندھ تھیں ان مہاجرین میں تقسیم کی گئیں۔ اس تقسیم کے دوران ہر طرح کی بے قاعدگیاں اور بدنظمیاں دیکھنے کو ملیں جن کا شہر کے مستقبل پر برا اثر پڑا اور سندھی مہاجر تنازعہ جو بعد میں بھڑکتے شعلوں میں تبدیل ہوا اس کی ہلکی سی جھلک اس عرصے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ملکی سطح پر سیاسی عدم استحکام بدستور جاری تھا اور ۱۹۵۴ء میں پورے مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملا کر ون یونٹ بنا دیا گیا اور تمام صوبے ایک بڑی وحدت میں ضم کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ملکی دستور پر کام جاری رہا اور آخر کار ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان میں پہلا آئین نافذ ہوا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس آئین کے تحت میجر جنرل سکندر مرزا ملک کے پہلے صدر اور چوہدری محمد علی پہلے وزیر اعظم بنے۔

اس آئین کے نفاذ کے بعد بھی ملک سیاسی طور پر مستحکم نہ ہوسکا اور صرف تین سال کے عرصے میں چار مرکزی حکومتیں اقتدار میں آئیں۔ محلاتی سازشیں جاری رہیں اور ان کا انجام ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اس وقت ہوا جب آئین منسوخ کر کے ملک بھر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور صدر ایوب نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔

اس ساری سیاسی ہلچل کی وجہ جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک جاری رہی۔ قائداعظم کی بے وقت وفات، لیاقت علی خان کی شہادت کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کی جماعت کا تحریک سے ایک مضبوط سیاسی جماعت تک سفر نہ کرسکنا بھی ہے۔

مسلم لیگ نے تحریک چلائی ملک آزاد کروالیا لیکن مسلم لیگ ایک جماعت کے طور پر منظم نہ ہو پائی اس پر مسلط جاگیردار، وڈیرے اور سیاسی اکابرین قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کیا ہوگا کا اندازہ نہ کر سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو کمی اس وقت رہ گئی تھی مسلم لیگ وہ کمی آج تک پوری نہ کر پائی اور اس کی جڑیں عوام میں

میں مستحکم نہ ہوسکیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کراچی کے بارے میں عارف حسن کا ایک اقتباس جو کراچی کی کہانی جلد اوّل مرتبہ اجمل کمال میں شامل ہے حالات کی کچھ یوں منظر کشی کرتا ہے۔

> ۱۹۵۰ء میں شہر کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کراچی امپرومنٹ ٹرسٹ (KIT) قائم کیا گیا جسے ۱۹۵۷ میں توسیع کے بعد کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کا نام دیا گیا۔ شہر کو درپیش اہم ترین انتظامی مسئلہ یہ تھا کہ شہر میں آبسنے والے لاکھوں مہاجرین کو کس جگہ آباد کیا جائے اور وفاق کا انتظامی مرکز کس مقام پر ہو۔ یہ مہاجرین شہر کے مرکزی علاقوں میں آبسے تھے۔ چنانچہ شہر کی وحدت برقرار تھی۔ ۱۹۵۲ء میں ٹرسٹ نے سویڈن کی ایک کنسلٹنگ فرم (MRV) کی مدد سے کراچی کے لیے ایک ماسٹر پلان تیار کیا جسے گریٹر کراچی پلان کہا جاتا ہے۔ یہ منصوبہ دارالحکومت کے لیے ایک انتظامی علاقے کے قیام پر مشتمل تھا جسے تیز رفتار سڑکوں کے ذریعے پرانے شہر سے منسلک کیا جانا تھا۔ اس منصوبے نے شہر کی وحدت کا احترام کیا جس میں عوام کے رہائشی علاقے انتظامی دفتروں اور اعلیٰ سرکاری اور سفارتی عہدے داروں کی رہائش کے قریب ہی واقع تھے اور شہر کا ایک مشترکہ مرکز تھا جو کسی ایک طبقے کے لیے مخصوص نہ تھا۔ منصوبے کے تحت مہاجرین کے لیے دریائے لیاری کے ساتھ ساتھ کثیر منزلہ اپارٹمنٹ ہاؤس بنائے جانے تھے۔ جہاں سے ان کی روزگار کی جگہوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ انتظامی مرکز کو کنٹری کلب روڈ (موجودہ یونیورسٹی روڈ) پر تعمیر کیا جانا تھا اور لوکل ریلویز کے ذریعے ماس ٹرانزٹ کے ایک نظام کا خاکہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ مگر پاکستانی حکومت کے نقطہ نظر کے مطابق شہر کی عام آبادی اور انتظامی مرکز کے درمیان فاصلہ ہونا ضروری تھا اور اعلیٰ عہدے دار یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ دونوں میں سے کسے شہر کے اندر رکھا جائے اور کسے شہر کے باہر منتقل کیا جائے۔ یہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کا زمانہ ملک میں سخت سیاسی عدم استحکام کا زمانہ تھا چنانچہ گریٹر کراچی پلان پر عمل نہ کیا جاسکا۔ ۳۳

ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد میجر جنرل ریٹائرڈ سکندر مرزا کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس دور کا اختتام اس عمل پر ہوا کہ کراچی کی جگہ اسلام آباد کو دارالحکومت کے لیے منتخب کیا گیا اور دارالحکومت کی منتقلی کا کام شروع ہوا۔ گویا کراچی کے لیے جو اختصاص تھا وہ بھی ختم ہوگیا، لیکن کراچی ایسا شہر ہے جو ہار ماننے پر قطعاً تیار نہیں۔

کراچی کی ترقی کی رفتار حیرت انگیز طور پر تیز رہی ہے۔ اس شہر کا خمیر ایسا ہے کہ یہ تکالیف اور مصائب سے گزر کر زیادہ نکھر کے سامنے آتا رہا ہے۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک

۱۹۶۹ء تک صدر ایوب ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ یہ دور کراچی کے رہنے والوں کے لیے چند ایسی یادیں دے گیا جن سے اس شہر کے چھلنی سینے میں مزید شگاف پڑے۔ کراچی ایک مزاحمتی شہر ہے اور ہوا کے مخالف چلنے کے لیے مشہور ہے۔

صدر ایوب نے اقتدار میں آتے ہی ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کیا اور نئے آئین کا ڈول ڈالا۔ انھوں نے سیاستدانوں کو مختلف قوانین کے ذریعے تختہ ستم بنایا۔ پروڈا اور ایبڈو جیسے بدنام زمانہ قوانین متعارف کرائے اور سیاستدانوں کو کوچہ سیاست سے بے دخل کر دیا۔ اس دور میں کراچی کو سندھ سے جدا کرنے کے بعد اسے ملکی صنعتکاری کے عظیم مرکز میں تبدیل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس فیصلے کے سندھی آبادی پر برے اثرات مرتب ہوئے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی کراچی میں مہاجرین کی آمد سے سندھی آبادی کراچی میں اقلیت میں بدل چکی تھی اب اس فیصلے کے نتیجے میں سندھ کے اندر سامراجی سرمایہ کی امداد سے نجی سرمایہ داری میں بے پناہ ترقی ہوئی۔

ایوب دور میں اس سرمایہ کاری سے کیا نتائج برآمد ہوئے ان کے بارے میں ڈاکٹر فیروز احمد اپنے مضمون "سندھ کے قومی مسائل کی سیاسی بنیادیں" مشمولہ: پاکستان میں قومی تضاد اور سندھ کا مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> ایوب دور میں سندھ کے اندر غیر قومی سرمایہ دار کی اکثریت مہاجر، پنجابی سرمایہ داروں کی تھی۔ لیکن اسی دور میں مہاجر، پنجابی اور پٹھان سرمایہ داروں اور افسر شاہی کے سندھ میں مشترکہ استحصالی مفادات بن گئے۔ جس کی وجہ سے اُن کے اندرونی تضاد بہت کم اور مشترکہ مفادات کا اتحاد مضبوط رہا۔ پٹھان نوآباد کار صنعتوں میں غیر ہنر مند مزدور اور غیر صنعتی مزدور بنا۔ غیر صنعتی پٹھان مزدود کا زیادہ حصہ عمارت سازی اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں میں داخل ہوا۔ پنجابی نوآبادکاروں کا بڑا حصہ صنعتوں میں داخل ہوا اور چھوٹا حصہ تجارت میں داخل ہوا۔ مہاجر

نو آبادکار نے شہری مڈل کلاس کی تشکیل کی، جو کہ تجارت اور شہری منڈی پر چھا گیا۔[۳۴]

سندھ کا دیہی معاشرہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کے وسط سے پہلے تک مکمل دیہی اور جاگیردارانہ تھا۔ وڈیرہ زمین پر اجارہ رکھتا تھا سندھ میں پنجاب کے برعکس خودمختار کسان نہ ہونے کے برابر تھے کیوں کہ زمین کے مالکانہ حقوق جاگیردار کے پاس تھے۔

ہاریوں کے حقوق نہ ہونے کے برابر تھے۔ زمینداران کو صرف اتنا اناج فراہم کرتا تھا جس سے ان کی سانس کی ڈور چلتی رہے۔ زمینداروں کے علاوہ قبائلی سردار اور مذہبی پیر بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔

یہ سردار لوگوں سے سالانہ ٹیکس اور پیر نذرانہ وصول کرتے تھے اس کے علاوہ نظم ونسق اور انتظامی امور بھی ان وڈیروں کے ہاتھ میں تھے سزا اور جزا کا قانون ان کے چشم ابرو پر حرکت میں آتا تھا۔

یہ وڈیرے اتنے بااثر تھے کہ ہاریوں، مزارعوں کے جسم وجان کے ساتھ ان کی سوچوں کے بھی مالک تھے اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی اپنا ووٹ کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا تھا ایسا کرنے والے کو علاقے سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔

سندھ میں سڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کراچی کے لیے اجناس، دادو یا لاڑکانہ کی بہ نسبت پنجاب سے لانا زیادہ آسان تھا۔

ان سارے حالات میں مڈل کلاس کا ظہور ایک ناممکن عمل تھا اس خلا کو مہاجر اور پنجابی آبادکاروں نے پر کیا۔

ایوب خان کے دور کے بارے میں مشہور سماجی علوم کے ماہر عارف حسن اپنے مضمون " کراچی کی صورتحال تناظر اور تجزیہ "میں لکھتے ہیں۔

> ایوب خان کے دور میں کئی نئے تصورات اور ادارے سندھ میں متعارف ہوئے۔ خاندانی منصوبہ بندی، ویلج ایڈ پروگرام، ٹیلی کمیونیکیشن، سڑکوں کی تعمیر، ہینڈ پمپوں کی تنصیب، زرعی ترقیاتی بینک وغیرہ چونکہ دیہی آبادی کے شعور کو بلند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان پروگراموں کا جو حصہ جاگیرداروں کے حق میں جاتا تھا اس پر عمل ہوا اور دوسرے حصے رد

کر دیے گئے۔ پھر بھی ان پروگراموں کا دیہی معاشرے پر کچھ اثر ضرور پڑا۔ جاگیرداروں کے لڑکے بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کراچی، لاہور اور حیدر آباد آ گئے۔ ہاریوں کو سرکاری محکموں میں کام ملا، بہت سے لوگ کراچی کی ملوں میں کام کرنے آئے اور ٹریڈ یونین تحریکوں سے متعارف ہوئے۔[۳۵]

ان سب تبدیلیوں سے سندھ بالعموم اور کراچی بالخصوص متاثر ہوا۔ کراچی کی آبادی گزشتہ ادوار کی طرح اس دور میں بڑھتی رہی اور اس بڑھتی آبادی کے پیش نظر نئے نئے علاقے گھنی آبادیوں سے پُر ہونے لگے۔

سیاسی تناظر کی طرف نگاہ کی جائے تو صدر ایوب نے ۱۹۶۲ء میں نیا آئین نافذ کیا اس آئین کے نفاذ کے دو سال بعد انتخابات کا کہا گیا لیکن مشیروں کی سفارش پہ یہ عرصہ تین سال کر دیا گیا۔

یہ آئین نافذ ہونے کے بعد بھی تبدیلیوں کی زد میں رہا اور کئی بار تبدیل ہوا اور ہر بار یہ تبدیلی ملکی مفاد کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی مفاد کو مدنظر رکھ کر کی گئی۔ یوں ۱۹۶۵ء کے انتخابات کا مرحلہ پیش آیا۔ فوجی آمر چاہے جتنا بھی شاطر کیوں نہ ہو سیاست کی بساط پر اس کی ناؤ ہمیشہ سیاستدانوں کے ہاتھوں ڈوبتی رہی ہے کیونکہ فوجی چھاؤنی کی زندگی اور شہر کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہی کچھ صدر ایوب کے ساتھ ہوا۔

حزب مخالف کے تمام نامی گرامی لوگ اس بات پر اکٹھے ہو گئے کہ مل کر انھوں نے صدر ایوب کو شکست دینی ہے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، میاں ممتاز دولتانہ، شیخ مجیب الرحمٰن، مولانا بھاشانی، خان عبدالولی خان، چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سرفہرست تھے۔ ان سب راہ نماؤں کی نمائندہ پارٹیاں جیسے کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے "کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز" کی تنظیم قائم ہوئی جس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ صدر ایوب کو صدارتی انتخابات میں شکست دینا۔

ان سب نے مل کر فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار نامزد کیا۔ صدر ایوب نے صدارتی الیکشن جیتنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا اور درست، غلط کی تمیز یکسر مٹا دی۔ الیکشن کے بعد ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو جو نتیجہ برآمد ہوا وہ صدر ایوب کے حق میں تھا۔

اس انتخاب میں کراچی اور ڈھاکا نے صدر ایوب کے خلاف ووٹ دیا۔ صدر ایوب اس بات کو بالکل برداشت نہ کر سکے۔ اُن کے فرزند ارجمند گوہر ایوب نے اس شہر کے باسیوں سے جو انتقام لیا اس کی تفصیل قدرت اللہ شہاب نے اپنی سرگزشت شہاب نامہ میں کچھ یوں بیان کی ہے۔

انتخابات میں ڈھاکا اور کراچی نے بھاری اکثریت سے صدر ایوب کے خلاف ووٹ ڈالے تھے۔ڈھاکا کے متعلق تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے لیکن کراچی میں ان کے فرزند ارجمند گوہر ایوب نے اہالیان شہر کی گوشمالی کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو جشن فتحیابی کے نام پر کراچی میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔جس کی قیادت گوہر ایوب کے ہاتھ میں تھی۔ان سب کے ڈرائیور اور سواریاں زیادہ تر پٹھانوں پر مشتمل تھیں۔صدارتی الیکشن سے کئی ماہ قبل کراچی میں ضلع ہزارہ سے پٹھانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور جشن فتحیابی کے روز وہ شہر کی فضا پر ایک دہشتناک غبار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔لیاقت آباد اور چند دوسرے علاقوں میں جلوس اور شہریوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس کا بدلہ چکانے کے لیے رات کے اندھیرے میں ان بستیوں پر شدید حملے کیے گئے۔آگ لگائی گئی اور کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔اس نقصان کا درست اندازہ کسی کو نہیں لیکن شہیدان لیاقت آباد کی یاد منانے کے لیے ہر سال ۵ جنوری کو ایک تقریب منائی جانی لگی۔کئی روز تک کراچی میں خوف و ہراس جاری رہا۔[۳۶]

اس طرح کے واقعات مزید بھی رونما ہوتے رہے۔میمن مسجد میں جب گوہر ایوب نے تقریر کرنے کی کوشش کی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور گوہر ایوب کو پولیس کی حفاظت میں وہاں سے نکالا گیا۔

کراچی نے اپنا فیصلہ دے دیا تھا اور انتخابات کے بعد صدر ایوب کا راج سنگھاسن بری طرح ڈولنے لگا تھا۔کراچی کے لوگوں نے آمر کو رد کر دیا تھا اور اس کے بعد صدر ایوب کا ہر دن زوال کی طرف اٹھ رہا تھا اور پھر وہ دن بھی آیا جب ۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کو صدر ایوب کو شدید دل کا دورہ پڑا اور ان کے کمانڈر ان چیف جنرل یحیٰی نے اپنی نگاہیں کرسی صدارت پر گاڑ دیں۔

ان حالات میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بھی صدر ایوب کی مخالفت پر کمر کس لی اور معاہدہ تاشقند کے حوالے سے کچھ راز افشا کرنے کی دھمکی دینے لگے۔

طلبہ نے احتجاج شروع کیا دوسری طرف مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونے شروع ہوئے اور نوبت بہ ایں جارسد کے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحیٰی خان نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔

۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک

اسی دوران ۱۹۷۱ء کا وہ دل خراش واقعہ پیش آیا جس نے ہر پاکستانی کا دل خون سے بھر دیا۔ بنگلہ دیش کا جداوطن کے طور پر ظہور۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک کے دور کو اگر بھٹو صاحب کے دور سے یاد کریں تو غلط نہ ہوگا سندھ اس دور میں توجہ کا مرکز رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک ذہین اور بڑے راہ نما تھے۔ ان کے دور میں کئی اہم فیصلے سندھ سے متعلق کیے گئے جن کی وجہ سے سندھ کے حالات میں کچھ تبدیلی ہوئی۔

بھٹو نے اپنی ابتدا روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے سے کی جو بعد کی دہائیوں میں بھی ایک مقبول نعرہ رہا۔ بھٹو بذات خود ایک وڈیرے تھے اور ایوب خان کے عہد میں وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھال چکے تھے اور اس وقت کے بڑے راہ نماؤں سے ملنے جلنے سے ان کا ذہنی افق بہت کشادہ ہو چکا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے کراچی میں بہت سے سندھی وڈیروں کو پلاٹس دیے کہ سندھی وڈیرے سرمایہ داری، کارخانے بنانے اور صنعت کی طرف آئیں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ یہ سارے پلاٹس ان لوگوں نے ذاتی آسائش کے لیے ہی استعمال کیے اس کے ساتھ ساتھ سندھی زبان کو لازمی قرار دینا، کوٹہ سسٹم کا نفاذ بھی اسی دور کے اہم واقعات ہیں۔

بھٹو صاحب نے مغربی پاکستان کو ۱۹۷۱ء کے گہرے سانحے کے بعد سنبھالا تو لوگوں میں بے حد مقبول ہوئے لیکن ان کا انجام پاکستان پیپلز پارٹی کے لیے آج بھی ڈراؤنا خواب ہے۔

جناب ضیاء الحق نے اُن کو پھانسی کی سزا ملنے کے بعد پھانسی کے پھندے پر چڑھایا اور اس کے بعد پوری کوشش کی کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا نام ونشان مٹایا جائے۔

۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۷ء تک

۱۹۷۷ء کے بعد سے ضیاء الحق کا دور پاکستان کے لیے فوجی آمریت کا دوسرا دور تھا۔ ایوب خان کے جانے کے صرف ۹ برس بعد جناب ضیاء الحق نے عنان حکومت سنبھال لی۔ ضیاء الحق کا دور کراچی کے لیے بہت ناگوار ثابت ہوا۔ اس دور کے کانٹے آج تک چنے جا رہے ہیں لیکن راستہ صاف ہونے میں نہیں آ رہا۔ اس دور میں افغان جہاد اسلحہ، مہاجر پٹھان تصادم، مہاجروں کا منظم ہوکر جماعت بنانا اور کراچی کی سیاست میں کُلّی طور پر دخیل ہونا سب شامل ہے۔

ضیاء الحق کے دور کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" میں لکھتے ہیں۔ اس پیراگراف کے لیے انھوں نے تین منفی نتائج کی سرخی جمائی ہے۔

مقدم الذکر ملک گیر اثرات میں سے پہلا یہ ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ سے فطری اور منطقی طور پر سیاسی محرومی کا احساس دوبارہ شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا اور اس بار چونکہ فوری تقابل بہت نمایاں تھا کہ کہاں بھٹو دور کی عوامی سیاست کی گہما گہمی اور کہاں مارشل لا کا قبرستان کا سا سکوت۔ لہذا اس مرتبہ اُس کا احساس بھی بہت شدت سے ہوا۔ بالخصوص سندھ میں تو اس نے غالب کے جوہر اندیشہ کی سی حدت اختیار کر لی۔ ریگزار سندھ واقعۃً نفرت اور بغاوت کی آگ میں جلنے لگا۔ ۳۷

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ۔

مارشل لا کے تسلسل کا تیسرا نتیجہ جو سندھ میں نکلا کہ اس عرصے کے دوران مہاجرین اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے ردعمل میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ اُن کی جوابی کاروائی میں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مطابق جارحانہ انداز بھی پیدا ہوگیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک تو اس دور میں بھی کوٹہ سسٹم اور دیہی اور شہری کی تقسیم جوں کی توں برقرار رہی۔ دوسرے مارشل لا نے براہ راست عمل دخل کو بالخصوص سندھ میں لاء اینڈ آرڈر اور امن امان کے زیادہ بڑے اور اہم معاملات تک محدود رکھا اور نسبتاً چھوٹے اور بظاہر غیر اہم واقعات کے ضمن میں صرفِ نظر ہی نہیں غضِ بصر سے کام لیا۔ لہٰذا انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ غیر سندھی نوجوان پر تعلیم اور معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ کرتے چلے جائیں اور نوبت بایں جارسید کہ لاڑکانہ اور نواب شاہ کے کالجوں میں پنجابی اور مہاجر طلبہ کے داخلے کے فارم پھاڑ ڈالے گئے۔ ۳۸

اسی ضمن میں مہاجرین کے ردعمل کے بارے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔

"چنانچہ سندھ میں آباد، اُردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کے بھی کچھ ایسے ہی احساسات اور جذبات ہیں جن کی کوکھ سے پہلے تو جنم لیا بعض مہاجر طلبہ تنظیموں اور نیو سندھی کلچرل ایسوسی ایشنوں نے جو نسبتاً دھیمی بھی تھیں اور دفاعی انداز کی حامل بھی اور بعد ازاں ان ہی احساسات وجذبات کی کوکھ سے برآمد ہوئیں مہاجر اتحاد تحریک (MIT) اور مہاجر قومی موومنٹ (MQM) ایسی فعال و متحرک بلکہ طوفانی انداز کی حامل تحریکیں جن کا اثر ونفوذ دیکھتے

ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔[۳۹]

کراچی شہر کی تاریخ میں یہ دور بالعموم اور پاکستان کی تاریخ میں بالخصوص بہت بڑی اور جوہری تبدیلیوں کا خالق ہے۔ اس دور میں کراچی کے ساتھ ساتھ ملک پاکستان کی سمت بھی تبدیل ہوئی افغان جہاد اس کے اثرات ملک پر اسلامی اقدار، حدود آرڈیننس، ظہر کی نماز کا لازمی ہونا (سرکاری اداروں میں) زکوٰۃ کی وصولی لیکن شیعہ احتجاج کے بعد ان کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ سنی، شیعہ تقسیم کا گہرا ہونا اور اسلام کے ایک سخت بیانیے کا ملک میں نفاذ اہم واقعات ہیں۔

پی۔ٹی۔وی اور ریڈیو پاکستان کے ذریعے خاص قسم کے پروگراموں کی نشر و اشاعت کی گئی اور رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ غرض ضیاء دور نے کراچی پر اپنی گہری چھاپ مرتب کی اور معاشرے کے تار و پود کو بری طرح متاثر کیا۔ عارف حسن اپنے ایک مضمون میں ضیاء دور کے کراچی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

یہ مضمون نکولا خان(Nichola Khan) کی کتاب "Cityscapes of viloence in Karachi" سے لیا گیا ہے۔

> When Zia took power, he posted police around the district,a moral policy which resulted in a burgeoning extrotion racket. Consequently the industry became dispressed accross the city.The film industry packed up, unable to survive the new censor code and the suffocating social atmosphere. In a conversation I had with the South Asian film maker Zia Sarhad, he wondered if the freedom permitted to cheap and vulgar films in the regional languages was granted to keep the masses happy" Heralding the near death of Pakistan's film industry, by 1989 Karachi's 119 cinemas had been reduced to 22[40]

ضیاء دور میں کراچی کے حالات ثقافتی طور پر بے حد تبدیل ہوئے۔ شہر کی گہما گہمی، رنگا رنگی اور جیتی جاگتی زندگی کو جبر کے ہتھکنڈوں سے خاصا نقصان پہنچایا گیا۔ کراچی جو مختلف ادوار سے گزر کر یہاں تک پہنچا تو اس شہر نے زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ یہ شہر تقسیم کے فوراً بعد دارالحکومت کے لیے منتخب ہوا (۲۲ مئی ۱۹۴۸ء) کو اور صرف ۷ سال بعد ہی مغربی پاکستان کو ون یونٹ (۱۹۵۵ء) بنا دیا گیا اور پھر ۱۹۷۰ میں کراچی دوبارہ صوبہ سندھ میں ضم ہوا۔

۱۹۸۷ء سے تا حال (چند بڑے واقعات)

آزادی سے پہلے یہ شہر ہندو اکثریت کا شہر تھا جو تقسیم کے بعد ان کی ہجرت سے اور مسلمانوں کی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے کراچی آمد پر مسلم اکثریتی شہر میں تبدیل ہوا۔ شہر کی اس نئی جہت سے سندھ کے رہنے والوں اور خاص طور پر کراچی کے سندھیوں کو شروع میں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑا کیونکہ ہجرت کی مذہبی تعبیر کے مطابق وہ اپنے مہاجرین بھائیوں کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھے لیکن حالات زیادہ دیر تک ایسے نہیں رہے باہمی شکر رنجیاں بڑھنے لگیں جو آگے چل کر بڑے حادثات کا سبب بنیں۔

ایک اور تبدیلی ملک کے دوسرے علاقوں سے لوگوں کا روزگار کے حصول کے لیے کراچی آنا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرنا بھی ہے۔ جب خیبر پختون خواہ کے پٹھان اور افغان جہاد کے بعد افغانیوں کی ایک کثیر تعداد نے یہاں کا رخ کیا اور شہر کے مختلف علاقوں میں مستقل ٹھکانے بنانے شروع کیے۔ ان مہاجرین کی آمد سے شہر ایک نئی تبدیلی سے دوچار ہوا جس نے فضا میں ہلچل مچادی آپسی مناقشے شدت اختیار کر گئے۔

آبادی کے اس اضافے کی وجہ سے سیاسی، معاشی، سماجی کش مکش پیدا ہوئی۔ شہر کے تینوں بڑی قومیتوں یعنی مہاجر، پٹھان اور سندھی لوگوں نے شہر پر اقتدار اور حکمرانی کے لیے ایک خونی کھیل شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ اصل مسئلہ شہر پر قبضے کا ہے جسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ اس شہر پر قبضہ سب کا مطمع نظر رہا ہے کبھی ڈھکے چھپے لفظوں میں اور کبھی واشگاف انداز میں۔

مہاجر قومی موومنٹ (آغاز، قیام، موجودہ صورتحال)

پاکستان کی آزادی قائداعظم کی جان دار قیادت اور مسلم لیگ کی سیاسی کامیابی کا نتیجہ تھی۔ پاکستان مسلم لیگ کی کاوشوں سے آزاد ہوا۔ مسلم لیگ کا جو دھڑا طالب علموں کو منظم کرتا تھا وہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے (MSF) نام سے موسوم ہوا۔

لیکن آزادی کے بعد جیسے مسلم لیگ اپنا حقیقی وجود برقرار نہ رکھ سکی بالکل اسی طرح مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بھی تحلیل ہوتی گئی۔ ان کے منظر سے ہٹنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں (DSF) ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن سامنے آئی جو ۱۹۴۸ء میں راول پنڈی اور ۱۹۵۰ء میں کراچی تک پہنچی اس تنظیم پر بائیں بازو کے لوگوں کے اثرات زیادہ تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم اسلامی جمیعت طلبہ (IJT) بھی تقسیم کے بعد قائم ہوئی لیکن اپنے ابتدائی دور میں (IJT) کا زیادہ زور مذہبی معاملات کی طرف تھا سیاسی معاملات میں ان کا اتنا عمل دخل نہیں تھا۔ کراچی یونیورسٹی میں یہ اپنی ایک شناخت رکھتی تھی لیکن ۱۹۷۰ء تک سیاسی افق پر بائیں بازو کی طلبہ تنظیمیں چھائی ہوئی تھیں۔

اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سابقہ امیر منور حسن اور (IJT) کے ناظم (۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۷ء) تک بائیں بازو کی سیاست میں شامل رہے اپنے ابتدائی دور طالب علمی میں اور بعد میں وہ مولانا مودودی کی فکر سے متاثر ہو جماعت اسلامی کی طرف پلٹے۔

ان کے متعلق لارینٹ گائیر Laurent Gayer اپنی کتاب *Karachi ordered disorder and the struggle for the city* میں لکھتے ہیں۔

> Munawer Hassan the current amir (now former) of the JI and a former Nazim-e-Ala of the IJT (from 1964 to 1967), was himself involved with the left during his early student years. As a student at the central Government College in Karachi in the 1960's as he claims to have turned three acitivists of the IJT before being in turn "Converted" to political Islam after reading Maudadi's Dawat-e-Islami aur uske Mutalibat[41]

جماعت اسلامی کے سابقہ امیر منور حسن اور اسلامی جمیعت طلبہ کے سابق ناظم اعلیٰ "ترجمہ:
(۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۷ء) اپنے ابتدائی طالب علمی کے دور میں بذات خود بائیں بازو کی سیاست میں شامل تھے۔ ان دنوں وہ سنٹرل گورنمنٹ کالج کراچی میں پڑھ رہے تھے۔ اور جیسا کہ وہ پڑھنے سے "دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات" خود بتاتے ہیں کہ مولانا مودودی کی کتاب "پہلے انھوں نے اسلامی جمیعت طلبہ کے تین کارکنوں کو بائیں بازو کی طرف راغب کیا تھا۔

بائیں بازو کی سیاست بہت مؤثر انداز میں ملکی اور عالمی سیاست پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ حتیٰ کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور مغربی اقوام کی تیسری دنیا کے لیے ظالمانہ پالیسیوں پر احتجاج بھی کرتی نظر آتی تھی۔ اسی تناظر میں ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو ایک احتجاج کے دوران کئی طلبہ ہلاک ہوگئے۔ جس پر بہت ہنگامے برپا ہوئے، اور یہ دن ہر سال ان کی یاد میں منایا جانے لگا۔ اس واقعے کے بارے میں لارینٹ گائی *Karachi ordered disorderand struggle for the city* میں لکھتے ہیں

> Left activists imprinted a stong international outlook on the

students movement, at least in west Pakistan. under their leadership, students protested against the reaproachment between Pakistan and the United States, as well as against the polices of the western block accross the third world (The 1956 suiz crises was for instence, the occasion of an intense mobilisation). This agitation was severely repressed on 8th January 1953 a demonstration organised by the DSF Democratic Student Federation and the Inter-collogiate Body (ICB) turned violent, and seven students were killed in Police Firing[42]

"ترجمہ: بائیں بازو کے سیاسی کارکن ایک مضبوط عالمی تناظر رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ مغربی پاکستان میں ان کے راہ نما امریکہ اور پاکستان کے باہمی روابط پر احتجاج بھی کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ مغرب کی تیسری دنیا کے ملکوں کے بارے میں پالیسیاں بھی ان کے احتجاجی ایجنڈے میں شامل ہوتی تھیں۔(مثال کے طور پر سوئز کینال کا مسئلہ جس پر پُرزور احتجاج ہوا اس احتجاج کو بڑی شدت سے کچل دیا گیا)۸جنوری ۱۹۵۳ءکو ڈیموکریٹک سٹوڈنس فیڈریشن اور بین الکلیاتی تنظیم کا احتجاج بہت خون ریز ہوگیا اور پولیس کی فائرنگ سے ۷ طلبہ ہلاک ہوگئے۔"

اس واقعے پر طلبہ کی تنظیموں نے بے تحاشا احتجاج کیا اور تمام کالجز، یونیورسٹیز میں ۸جنوری کا دن یوم شہدائے جنوری کے نام سے منایا جانے لگا۔

کراچی یونیورسٹی اور طلبہ تنظیمیں ایک مختصر جائزہ

کراچی یونیورسٹی کا قیام ۱۹۵۱ءکو عمل میں لایا گیا۔شروع میں اس کی کلاسز بابائے اردو روڈ پر قائم ہندو لڑکیوں کے مڈل سکول میں شروع کی گئیں۔ طالب علموں کے احتجاج پر اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے کراچی یونیورسٹی کو شہر سے ۱۲ کلومیٹر دور ایک کشادہ جگہ پر اپنا کیمپس کھولنے کی اجازت دے دی۔ ۱۹۵۳ء سے یونیورسٹی نے آرٹس اور سائنس میں داخلے شروع کیے۔کراچی یونیورسٹی نے بہت تیزی سے ترقی کی اور بہت جلد ملک کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی کے طور پر سامنے آئی۔آج کل یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد ۲۴۰۰۰ سے زیادہ ہے اور ۸ بڑے شعبے کام کر رہے ہیں۔

کراچی یونیورسٹی سے قبل طلبہ کی سیاسی تنظیمیں زیادہ تر ڈاؤ میڈیکل کالج DJ سائنس کالج اور سندھ

مسلم آرٹس کالج تک محدود تھیں۔

۱۹۵۷ء سے کراچی یونیورسٹی کے طلبہ نے زیادہ تیزی اور شدت سے سیاسی جلسوں، سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔

کراچی یونیورسٹی کے طلبہ کی یہ سیاسی ہلچل وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی گئی۔ پہلے سے موجود تنظیموں کے علاوہ نئی نئی تنظیمیں وجود میں آنے لگیں اور طلبہ تنظیموں کے درمیان سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات باقاعدگی سے منعقد ہونے لگے۔

ان انتخابات میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF)، اسلامی جمعیت طلبہ (IJT) اور ۱۹۷۲ء کے بعد پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن (PSF) جس کا تعلق پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا بڑا اہم کردار ادا کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۶ء تک بائیں بازو کے اتحاد کو یونین الیکشن میں برتری رہی اور ان کے طالب علم یونین کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ اس کے بعد (IJT) بھی زیادہ کھل کر سامنے آئی۔ اسلامی جمعیت طلبہ نے سائنس کے طلبہ کی مدد سے اپنا کردار بڑھالیا۔ بائیں بازو کی جماعتوں میں زیادہ تر آرٹس کے طلبہ شامل ہوتے تھے۔

> "یہی بائیں بازو کے طالب علم آگے چل کر آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (AMPSO) میں تبدیل ہوئے جو کہ مہاجر قومی موومنٹ اور بعد میں متحدہ قومی موومنٹ کی شکل میں کراچی کی سیاست پر ایک عرصے سے چھائی ہوئی ہے۔"[۴۳]

۱۹۷۰ء تک بائیں بازو اور اسلامی جمعیت طلبہ کے حامیوں کے مابین جو کھینچا تانی اور کشمکش جاری تھی اس میں اکثر معاملہ نوک جھونک سے لڑائی تک جا پہنچتا لیکن یہ لڑائیاں دھینگا مشتی اور مکے، ڈنڈے تک محدود تھی اور کسی بڑے حادثے کا سبب نہ بنتی تھی۔

۱۹۷۲ء کے بعد یہ صورتحال برقرار نہ رہی اور اس صورتحال کے متعلق لا رینٹ گائیر اپنی کتاب *Karachi Ordered disorder and struggle for the city* میں لکھتے ہیں۔

> "Violence gradually esclated in the following years particularly after the rise of IJT's militia, the thunder squad which started making its presnes felt at K.U from 1972 on words.[44]

ترجمہ: آنے والے سالوں میں تشدد آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اس کی وجہ اسلامی جمعیت طلبہ کا تھنڈر سکواڈ نامی گروہ تھا جو ۱۹۷۲ء کے بعد کراچی یونیورسٹی میں اہم حیثیت اختیار کر چکا تھا۔"

اس کے بعد جیسے جیسے معاملات آگے بڑھتے گئے کراچی یونیورسٹی میں حالات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ وہ لڑائیاں جو مکے ڈنڈے سے شروع ہوئی تھیں اب اپنا دائرہ کار بڑھا رہی تھیں۔

طلبہ کو مختلف قسم کے ہتھیار مہیا ہو رہے تھے۔ جن میں پستول، کلاشنکوف اور سٹین گن جیسے مہلک ہتھیار شامل تھے۔ یہ ہتھیار سب سے پہلے IJT کے مسلح ونگ تھنڈر سکواڈ نے استعمال کیے ان کو یہ ہتھیار کیسے ملے اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ علاقہ غیر کی خیبر ایجنسی سے یہ ہتھیار منگوائے گئے جب کہ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ جماعت اسلامی کے بڑوں نے یہ ہتھیار طلبہ کو دیے کچھ بھی ہو طلبہ کی یہ لڑائیاں اب بڑے اور وسیع پیمانے پر لڑی جانے لگیں جن میں خون ریزی کا پہلو بھی شامل ہو گیا۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے یوں مسلح ہو جانے کے بعد ان ہتھیاروں کا پہلی دفعہ استعمال ۱۹۷۹ میں ہوا اس واقعے کے متعلق ہیرالڈ The Herald کے شمارے ۱۹۸۸ء کا یک مضمون اس صورتحال کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

"This Sophisticated weaponry was put to use for the first time on the occassion of the oath-taking ceremony of the Karachi University Students Union (KUSU) on 12th August 1979. When a group of progressive students organised a protest against the ceremony (The Union was then dominated by IJT), militents of the thunder squad fired at them with sten guns injuring eighteen of them (including two women)[45]

ترجمہ: یہ جدید ہتھیار پہلی مرتبہ کراچی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی تقریب حلف برداری کے موقع پر ۱۲ اگست ۱۹۷۹ء کو استعمال کیے گئے۔ جب ترقی پسند طلبہ کے ایک گروپ نے اس تقریب کے موقع پر احتجاج کیا۔ (یونین اس وقت جمعیت کے کنٹرول میں تھی) تھنڈر سکواڈ کے مسلح لوگوں نے ان لوگوں پر فائرنگ کی اور اٹھارہ لوگوں کو جن میں دو عورتیں شامل تھیں زخمی کر دیا۔ [۴۵]

اس واقعے کے بعد بائیں بازو اور پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے حمایتی طلبہ کے دھڑوں نے بھی ان ہتھیاروں کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ شروع میں تو ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔

اکرم قائم خانی جو پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک رکن تھے ایک انٹرویو جو انھوں نے لارینٹ گائیر کو

دیا جو ان کی کتاب Karachi orderded disorder and struggle for the city میں شامل ہے بڑی تفصیل سے ایک ایسے واقعے کا حال بتاتے ہیں۔ جب انھوں نے IJT (اسلامی جمعیت طلبہ) سے ایک ہتھیاروں کی کھیپ چھینی۔ اس واقعے کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

> میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنے علاقے (شاہ فیصل کالونی) کی طرف جارہا تھا کہ میں نے سٹوڈنٹس فیڈریشن کی گاڑی دیکھی (اس وقت فیڈریشن پر جماعت اسلامی (IJT) کا غلبہ تھا) میں بہت حیران ہوا کہ یہ ہمارے علاقے میں کیا کررہے ہیں۔ میں نے دوست کو کہا کہ
>
> ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ جب ہم نے ان کا پیچھا کیا تو انھوں نے گاڑی ایک گھر کے سامنے روک لی۔ اور دو بوریاں سامان کی اس گھر میں رکھ دیں۔ میں نے کہا ہمیں کچھ کرنا چاہیے ہم نے اپنے دوست احباب بلا لیے جو تقریباً بیس، تیس کے قریب ہوں گے۔ ہم نے صبح سویرے اس گھر کا محاصرہ کرلیا تقریباً آٹھ بجے سید نامی ایک شخص جو جماعت اسلامی (IJT) کا رکن تھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اور گھر سے سامان نکالنے لگا جب اس نے پہلی بوری لا کر گاڑی میں رکھی تو ٹیپو (مشہور زمانہ پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا رکن) آگے بڑھا اور زور سے پکارا او سید! اور ساتھ ہی فائرنگ شروع کردی ہمارے پاس ایک پستول اور بیس گولیاں تھیں۔ سید اس اچانک حملے سے گھبرا کر بھاگ نکلا اور ہم نے اس گاڑی میں رکھی بوریوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ ان بوریوں میں اسلحہ بھرا تھا، پستول، سٹین گن، گولیاں سینکڑوں کی تعداد میں اس دن کے بعد پورے مہینے تک جمعیت کے لڑکے یونیورسٹی میں نظر نہ آئے کیونکہ انھیں علم تھا کہ اب ہمارے پاس بھی اسلحہ موجود ہے۔ [۴۶]

کراچی یونیورسٹی میں ہتھیاروں کی اس ریل پیل سے اس وقت کی حکومت بخوبی آگاہ تھی۔ حکومت نے (ضیاء الحق) ان کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کیوں نہیں کی؟ حکومت چشم پوشی سے کام کیوں لیتی رہی؟ یہ وہ سوال ہیں جو کراچی کے ہر شہری کو پوچھنے چاہیں کیوں کہ کراچی کی موجودہ صورتحال کی ذمہ داری ان دنوں کی حکومت پر عائد ہوتی ہے جس نے نوجوانوں کو تعلیم اور ملکی ترقی کی طرف راغب کرنے کے بجائے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بے دردی سے استعمال کیا۔

آج کراچی کے شہری جس کرب سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں اس میں اس وقت کی حکومت کا بھی وافر

حصہ ہے۔ کراچی یونیورسٹی ایسا لاوا بن رہی تھی جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ ان دنوں جولڑکے وہاں پڑھ رہے تھے انھوں نے آنے والے تیس چالیس سالوں میں کراچی کو سنبھالنا اور چلانا تھا اگر ان کو نفرت کا سبق نہ پڑھایا جاتا تو کیا کراچی اس آگ اور خون سے گزرتا جو کراچی کے باسیوں نے برداشت کیا ہے؟ شاید ایسا نہ ہوتا۔

ضیاء دور حکومت میں جماعت اسلامی اور اسلامی جمیعت طلبہ کی پشت پناہی کی گئی اور بائیں باز و کی تنظیموں کو اپنی حد میں رکھنے کے لیے مذہبی تنظیموں کی آبیاری کی گئی۔ وقتی مقاصد تو حاصل کر لیے گئے لیکن جو کیکٹس اس وقت اگائے گئے انھوں نے کراچی کے ہر گھر کو کانٹوں سے بھر دیا۔ قتل و غارتگری کی بنیاد کراچی یونیورسٹی میں ہی رکھی گئی اس لیے قدرے تفصیل سے ان باتوں کا تذکرہ کیا گیا۔

کراچی یونیورسٹی میں طلبہ تنظیموں کا قیام، ان کے دائرہ کار کا بڑھنا ان کاروائیوں کا شہر پر اثر، ہر گھر ہر گلی ہر محلے میں ان اثرات کا محسوس ہونا یہ وہ عوامل تھے جو بہت اہمیت رکھتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ ان کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا جائے۔ اب کراچی کی اس طالب علم تنظیم کا تذکرہ جس کے بغیر شہر کی پچھلے تین سے چار دہائیوں کی تاریخ نامکمل ہے۔

APMSO سے MQM اور پھر MQM سے متحدہ کا سفر اس جماعت نے گزشتہ تیس سے چالیس برسوں میں طے کیا ہے۔ اس تنظیم نے شہر پر اپنی گرفت اس قدر مضبوطی سے جمائی ہے کہ پرندہ بھی ان کے علم کے بغیر شہر کراچی میں پر نہیں مار سکتا تھا۔ یہ سب کچھ کب، کیسے اور کیوں ہوا؟ یہ بیان کرنا بے حد ضروری ہے۔

شہر کراچی کی تفہیم کے کئی زاویے اور نقطہ نگاہ ہیں یہاں کی زمینوں پر غیر قانونی قبضے، کچی آبادیاں ان کا پھیلاؤ، قبضہ مافیا، چائنا کٹنگ، پانی اور دوسرے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سب پر بات کی جاسکتی ہے لیکن ان سب کا تعلق براہ راست شہر پر حکمرانی کرنے والی جماعت سے جاملتا ہے۔ اس لیے جب تک اس جماعت کی نفسیات، جماعت کا بننا ان جیسے عوامل کے جواب نہیں دیں گے سارے جواب ادھورے رہیں گے۔

اس لیے متحدہ قومی موومنٹ کے آغاز، ابتداء، اٹھان، کامیابی اور پھر آخر کار زوال پر گفتگو کریں گے۔

مہاجرین کی سیاسی بیداری

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مہاجرین کی پاکستان آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد لاکھوں میں ہوگئی۔ یہ مہاجرین کسی ایک علاقے سے نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے سے پاکستان پہنچے تھے۔ ان میں غالب اکثریت تو دہلی، یوپی،

بہار، سی پی اور حیدر آباد دکن کے خالص اردو بولنے والے لوگوں کی تھی اس کے علاوہ راجپوتانہ، بمبئی، مدراس، کرناٹک اور کیرالہ تک کے علاقوں کے لوگ شامل تھے۔

جب یہ لوگ اپنا گھر بار، جائیداد، املاک اور عزیز رشتہ داروں کو چھوڑ کر کراچی پہنچے تو سندھ کے باسیوں نے روایتی مہمان نوازی اور ہجرت اور مہاجر سے متعلق دینی اور مذہبی تعبیر کے حوالے سے ان لوگوں کی مہمان نوازی کا ہر ممکن خیال رکھا لیکن یہ صورتحال تادیر برقرار نہ رہی اس بات کو ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد سندھ میں آنے والے مہاجرین کا سندھی مسلمانوں نے نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا اور انھیں تمام ممکن سہولتیں اور مراعات بہم پہنچائیں لیکن افسوس یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور دو اہم اسباب کی بناء پر اولاً (Anti-Climax) اور پھر ضابطہ ردعمل (Reaction) کی صورت حال پیدا ہوتی چلی گئی۔ اولاً اس بنا پر کہ بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں کا معاملہ ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء پر ختم نہیں ہوا بلکہ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی تواتر سے جاری رہا ہے اور اس طرح آبادی میں مہاجرین کا تناسب مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ نتیجۃً قدیم سندھیوں کے تحت الشعور میں یہ خوف کلبلانے لگا کہ وہ کہیں اپنے صوبے میں ہی اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ [۴۷]

وقت گزرنے کے ساتھ دیگر مختلف مسائل کے ساتھ ساتھ لفظ مہاجر بھی تحقیر کا ذریعہ بنتا چلا گیا اور مہاجرین کی دوسری نسل کو عجیب وغریب القابات جیسے ہندوستانی، مکڑا اور تلیئر سے پکارا جانے لگا۔ ان کی عزت نفس کو بہت شدید زک پہنچائی گئی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ مہاجر قومیت کا احساس ان مہاجرین میں بہت شدت سے ابھر کر سامنے آیا اور یہ لوگ مہاجر قومیت کا تشخص منوانے میں جت گئے۔

اور اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم جوان لوگوں نے اٹھایا وہ جون ۱۹۷۸ء میں APMSO کا قیام تھا۔ APMSO یعنی آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اس تنظیم نے اپنا جو پہلا پمفلٹ تیار کیا اُس میں انھوں نے اس سوال کو بڑی شدومد سے اٹھایا کہ

میری آواز سنو

میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟

اپنی شناخت کو منوانے کے لیے ان لڑکوں نے جب کراچی یونیورسٹی میں مختلف طلبہ کو اکٹھا کر کے ان سے بات چیت کی کوشش کی تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ برا بھلا کہا گیا اور "آیا آیا مہاجر آیا" کے نعرے لگائے اس عمل میں اسلامی تنظیمیں پیش پیش تھیں۔

اُس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ یہ مفلوک الحال لڑکے آگے چل کر ملکی سیاست میں کس درجہ اہم کردار ادا کریں گے۔

APMSO کا قیام اچانک ہی عمل میں نہیں آ گیا تھا بلکہ اس سے پہلے بائیں بازو کی تنظیمیں مہاجرین کے لیے آواز اٹھاتی رہیں تھیں لیکن منظم انداز میں اس کام کو APMSO نے ہی آگے بڑھایا۔

مہاجروں کو اتنی شدت سے اپنی جدا قومیت پر اصرار کیوں ہوا؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں۔ کئی جہتیں ہیں جو اس بات کو تفصیلاً بیان کیے بغیر سمجھنی مشکل ہیں۔

شہر کراچی کی صورتحال تقسیم کے بعد ہر لمحہ تبدیلی کے عمل سے گزری اس کے باسی اس صورتحال کے عینی شاہد ہیں۔ مہاجرین کی آمد اور ارادی آمد نے صوبہ سندھ کے لوگوں کو اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ وہ اپنے علاقوں میں اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائیں اور سندھی زبان و ثقافت جس پر ان کو ناز ہے وہ کہیں ان کے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔ دوسری طرف مہاجرین جو کہ اپنا گھر بار، مال املاک، دوست رشتہ دار سب چھوڑ کر آئے تھے یہاں اپنے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر ناراض بھی ہیں اور ان کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی موجود ہے کہ ان کی تہذیب و تمدن، ثقافت، بود باش، زبان سندھیوں سے برتر اور فائق ہے۔

مہاجر قومی موومنٹ کے قائد جناب الطاف حسین اپنی آپ بیتی (سفرِ زندگی) جو ۱۹۸۸ء میں چھپی اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مہاجرین کی آمد سے سندھ میں "تہذیبی انقلاب" اور "ذہنی بیداری" آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کی سادہ، دیہاتی، پرخلوص تہذیب کا موازنہ ہندوستان کے مختلف شہروں کی متحرک اور شہری تہذیب سے کرتے ہیں تو ان کو یہاں کی تہذیب قدرے ہیٹی نظر آتی ہے۔ نقطہ نظر کے اس فرق نے بھی دونوں قومیتوں کو ایک دوسرے سے دور کیا اور ایک دوسرے کے لیے مخاصمانہ جذبات پیدا ہوئے۔

سندھ کے لوگ تو پورے صوبے اور مختلف شہروں میں اپنی ثقافتی تمدن کے اظہار کے لیے آزاد تھے۔ اس لیے ان کے ہاں مہاجروں سے مغائرت کے بعد مختلف تنظیمیں بنیں لیکن چونکہ ان قدیم سندھیوں کو بقا کا

مسئلہ درپیش نہ تھا اس لیے ان تنظیموں کا تسلسل اور بڑھوتری کا عمل زیادہ متحرک نظر نہیں آتا۔

اس کے برعکس مہاجر قوم کی تنظیم (APMSO) جو آگے چل کر مہاجر قومی موومنٹ اور بعد ازاں متحدہ قومی موومنٹ کہلائی اپنے قیام کے بعد سے ہی اپنے نظریات، خیالات اور ان کے پرچار میں بہت شدت کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔

آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO)

مہاجر قومی موومنٹ کی ابتدائی مشکلات

مہاجر قوم کی شناخت، حقوق اور سیاسی پہچان کے لیے APMSO سے پہلے بھی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں اور گاہے گاہے ان آوازوں میں شدت بھی آتی رہی ہے۔

۱۹۶۰ء کے اواخر میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (NSF) کے ایک ماسکو نواز دھڑے کے سربراہ امیر حیدر کاظمی نے ایک بزنس مین ایم اے بشیر کی اس مانگ کی حمایت کی کراچی کو ایک جدا صوبہ بنایا جائے۔

اس عرصے میں نواب مظہر خان نے مہاجر، پشتون، پنجابی متحدہ محاذ بنایا اس کا گڑھ حیدر آباد تھا۔

اس تنظیم نے سندھی زبان کو لازمی قرار دیے جانے کے فیصلے پر احتجاج کیا اس احتجاج کی حمایت کراچی کی "قومی متحدہ طلبہ محاذ" نے بھی کی جس سے کراچی کے کچھ حصوں پر کرفیو نافذ کرنا پڑا۔

۱۹۷۲ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت سندھ اور اسلام آباد میں قائم ہوئی تو "لسانی جھگڑے" میں شدت آتی گئی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے سندھی زبان کو تعلیم اور انتظامی ڈھانچے میں زیادہ شدت سے استعمال پر زور دیا جس سے کراچی شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔

کراچی میں رہنے والے سندھیوں کی املاک کو نقصان پہنچایا گیا اور اردو بولنے والے لوگوں نے اپنے علاقوں لیاقت آباد، پاپوش نگر اور گلبرگ وغیرہ میں سندھی دکان داروں کی دکانوں کو نقصان پہنچایا۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سندھی زبان کو بھی خاصا نقصان پہنچایا گیا۔ ۷ جولائی ۱۹۷۲ کو جب سندھ کی صوبائی اسمبلی نے متنازعہ بل جس میں سندھی زبان کو جماعت چہارم سے بارہویں تک اردو کے ساتھ لازمی قرار دیا تھا پاس کیا تو اس دوران تقریباً بائیس (۲۲) لوگ ہنگاموں میں مارے گئے۔ سندھ بھر میں مظاہرے شروع

ہوئے۔

جولائی ۱۹۷۲ء کے بعد محمد الحق عثمانی جو نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے انھوں نے "اردو قومی کونسل" کے نام سے ایک تنظیم شروع کی اس تنظیم نے مہاجر قومیت کو سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان کی طرح پانچویں قومیت کہا۔ یہ شاید پہلی مرتبہ تھا کہ مہاجر قومیت کی بات ملک کی باقی چار اکائیوں کی طرح کی گئی۔

اردو بولنے والے اور شہر کے نام ور اخباروں میں لکھنے والوں جیسے رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور کئی دوسرے لوگوں نے بھی مختلف تنظیموں میں شمولیت اختیار کی اور کراچی کو جداگانہ شناخت دینے کی باتیں ہونے لگیں۔

اردو بولنے والے طلبہ ان تمام تحریکوں میں پیش پیش تھے اور ان کو پہلی مرتبہ شناخت کا احساس بھی مل رہا تھا وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنی جداگانہ اہمیت رکھ سکتے ہیں اسی دوران سلیم حیدر نے سندھ میڈیکل کالج میں "مہاجر میڈیکوز ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی اور سلیم حیدر نے بھی آگے چل کر مہاجروں کی پہلی سیاسی جماعت "مہاجر اتحاد تحریک" کی بنیاد ڈالی۔

APMSO اور اسی طرح کی دوسری تنظیموں کے بننے سے مہاجروں کو خود اپنے خول سے باہر نکلنے کا موقع ملا اور "مہاجر اتحاد تحریک" کے بعد وہ تاریخی دن آتا ہے جس دن مہاجروں کی سب سے بڑی پر اثر اور نمائندہ جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا یعنی "مہاجر قومی موومنٹ" MQM کی داغ بیل ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء کو ڈالی گئی۔

اس تفصیلی تمہید میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ مہاجر قومی موومنٹ کے بننے میں کتنا عرصہ لگا یعنی زمین تیار ہوتی رہی اور آخر کار مہاجر قومی موومنٹ کا قیام عمل میں آیا۔

شروع میں APMSO اور MQM کے ساتھ لوگوں کا رویہ متعصّبانہ تھا۔ MQM کے لڑکوں کو لونڈے لپاڑے کہہ کر بھگا دیا جاتا تھا۔ جب یہ لوگ مہاجر قومیت کی بات کرتے تو کوئی ان کو سنجیدگی سے نہ لیتا اور ان کو نظر انداز کیا جاتا۔ چاہے مہاجر قوم کے بڑے بڑے سرمایہ دار ہوں یا چھوٹے دکان دار کوئی بھی ان کو تحریک کے لیے چندہ دینے کو تیار نہ تھا۔

اس بات سے یہ لوگ بہت دل برداشتہ بھی ہوتے۔ حالات قطعی موافق نہ تھے۔ ان باتوں کا تفصیلی اظہار جناب الطاف حسین اور سلیم شہزاد نے اپنی اپنی سوانح عمریوں میں تفصیلاً کیا ہے۔

سلیم شہزاد اپنی سوانح عمری شعور کا سفر میں لکھتے ہیں۔

> جب ہم چندہ مانگنے مختلف دکانداروں کے پاس جاتے تو وہ ہمیں کہتے بھائی معاف کرو اور جب ہم آگے بڑھتے تو سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ گلی کے لونڈے آجاتے ہیں پیسے مانگنے پھر جا کر عیاشی کریں گے۔ ہم یہ باتیں سنتے تو بہت دل دکھتا کیونکہ یہ تو ہماری مدد کرنے کے بجائے ہم پر الزام تراشیاں کر رہے ہیں۔ [۴۸]

ان ساری نفرتوں، حقارت آمیز رویوں اور شناخت کے المیے نے اس تنظیم کی جڑوں میں ایک انجانا خوف بھر دیا تھا۔ یہ تنظیم دوسری تنظیموں سے بالکل جدا اور منفرد تھی اس کے چاہنے والے اس کے منتظم اس کو کچھ نئے ڈھب سے آگے بڑھا رہے تھے۔ اس تنظیم نے آگے چل کر سیاسی اُفق پر وہ کامیابیاں سمیٹیں کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

مہاجر قومی موومنٹ اور قائد تحریک سے وفاداری

MQM کی ساخت دوسری سیاسی اور سماجی تنظیموں کی طرح نہ تھی بلکہ یہ تنظیم سیاسی سے زیادہ فوجی نظم و ضبط کی قائل نظر آتی ہے۔ سلیم شہزاد اپنی کتاب شعور کا سفر میں اسکا تفصیلی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

مزید تفصیل میں جانے سے پہلے اس حلف نامے پر ایک نظر جو کہ ہر شخص کو MQM کا ممبر بننے کے لیے بھرنا پڑتا۔ یہ حلف نامہ کیا بیان کرتا ہے۔

> میں ۔۔۔ اللہ موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں خدا کے پاک کلام اور اپنی ماں کی قسم کھا کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں MQM اور الطاف حسین کا تاحیات وفادار رہوں گا۔ میں اپنی ماں کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ کوئی سازش MQM یا الطاف حسین کے خلاف یا کوئی عمل جس سے تحریک کو اور قائد کو نقصان پہنچے میرے علم میں آیا تو میں فوراً الطاف حسین یا مرکزی راہ نما کو بتاؤں گا۔ چاہے سازش کرنے والا میرا بھائی، بہن، ماں، باپ، دوست، رشتے دار کوئی بھی ہو۔ میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں تحریک کے ہر راز کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کروں گا۔ [۴۹]

ایک قوم جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک اپنے آبائی وطن، گھر بار، زمین، جائیداد، عزیز رشتے دار سب چھوڑ کر نئے وطن کو اپنا وطن مان کر اس کی تعمیر و ترقی کے خواب دل میں بسائے سرحد پار کرتی ہے۔ تین دہائیوں بعد اپنے خول میں یوں بند ہوتی ہے کہ اُسے اپنے اردگرد کچھ نظر نہیں آتا یا وہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس حلف نامے

میں بھی سیاسی تنظیم سے زیادہ ایک نظم وضبط کی پابند جماعت سامنے آتی ہے جو آنے والے دنوں میں شہر بھر میں خوف کی فضا بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تحریک کی قائد کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عمران فاروق (۵۰) کا کتابچہ نظم و ضبط کے تقاضے بھی تحریک کو بہت زیادہ شدت کے ساتھ صرف ایک نقطے پر متفق اور محدود کرتا نظر آتا ہے اور وہ ہے قائد کے ساتھ غیر مشروط وفاداری۔

MQM چونکہ مہاجرین کو شناخت اور قومیت کا احساس دلانے کے لیے سامنے آئی تھی اس لیے ان لڑکوں نے اس مقصد کے لیے ہر حربہ استعمال کیا طاقت، تشدد، جلاؤ گھیراؤ، قتل و غارتگری، غرض کوئی بھی عمل جو ان کو جدا قوم بنادے اور ایسا ہوا بھی کہ MQM نے پورے کراچی پر بلاشرکت غیرے حکومت کر کے دکھائی۔

MQM کی ساری جدوجہد اپنے قائد کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ہر کارکن نے اپنے لیڈر کا وفادار رہنا ہے چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔ عام پاکستانی کے لیے اس بات کو سمجھنا بہت مشکل ہے کہ MQM کیوں اتنی زیادہ قائد کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مہاجر قوم ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک جس کرب سے گزری جس تحقیر کا اسے سامنا کرنا پڑا وہ عام پاکستانیوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ MQM کے لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا لوگوں نے صرف اخبار میں پڑھا ہے لوگوں پر بیتا نہیں ہے۔

جب کہ دوسری طرف MQM کے ہر کارکن کی داستان ایسی ہے کہ جو لہو رلانے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے MQM کا لیڈر سے والہانہ پیار سمجھا جا سکتا ہے۔ تحریکوں میں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کسی بھی بڑے مقصد کی تحریک کا مطالعہ کریں تو قائد کا کردار اور اس سے عام کارکنوں کا پیار یہی کہانی سناتا ہے۔

ایم کیو ایم کی مفاد پرستانہ سیاست

سیاست میں عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ سیاسی پارٹی بنائی ہی اس لیے جاتی ہے کہ اپنے نظریات، خیالات کے مطابق حکومت کر کے دکھائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سیاسی جماعت اپنا منشور بناتی ہے۔ کارکنوں کو متحرک کرتی ہے اور پھر اقتدار تک پہنچتی ہے۔ ایم کیو ایم کا معاملہ بھی جدا نہیں ہے۔

درج ذیل بحث لارینٹ گائیر کی کتاب "Karachi ordered disorder and the struggle for the city" اور نکولا خان کی مرتب کردہ کتاب "Cityscapes of violence in Karachi" سے اخذ کی ہے۔"

انتخابی عمل کے ذریعے جو پہلی کامیابی ایم کیوایم کو ملی وہ ۸۸۔۱۹۸۷ء میں حاصل ہوئی اُس دن سے لے کر ۲۰۱۳ء کے انتخابات تک کراچی میں فیصلہ کن کردار صرف اور صرف ایم کیوایم کا رہا ہے۔ ایم کیوایم کو تا حال کراچی کی سیاست میں مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔

ایم کیوایم صرف چند مواقع کے سوا جیسا کہ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء جب پاکستان پیپلز پارٹی سندھ اور اسلام آباد پر اکیلی حکمرانی کر رہی تھی ہمیشہ حکومت میں شامل رہی ہے۔

حکومت میں مختلف سیاسی پارٹیوں سے لین دین کے معاملے میں ایم کیوایم سخت سودے بازی کے لیے مشہور ہے اور حکومت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا شاید ان کی مجبوری ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء کے دوران ایم کیوایم کا کئی مرتبہ حکومت سے نکلنا اور پھر چند دنوں بعد شامل ہونا ہے۔

ایم کیوایم کے لیے بہترین وقت جام صادق علی کی وزارت میں (۹۲۔۱۹۹۰ء) اور پرویز مشرف کی صدارت میں (۰۸۔۲۰۰۲ء) تک رہا ہے۔ اس دوران ان کو کراچی کی حکمرانی عطا کی گئی اور بدلے میں اپنے لیے وفاداری مانگی گئی۔ ایم کیوایم نے اس دوران کراچی پر اپنا قبضہ مستحکم کیا۔

اپنے لوگوں کو من پسند نوکریاں دیں۔ شہر میں اپنے چاہنے والوں کے لیے سہولیات کو بڑھایا اور سیاسی طور پر اپنے آپ کو خوب مستحکم کیا۔ کراچی کی سیاست میں چاہے شہری حکومتیں ہوں یا صوبائی اور قومی حلقے ایم کیو ایم نے اپنے دائرہ اختیار کو بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

سیاسی ہتھکنڈوں کے ساتھ ساتھ ایم کیوایم نے کچھ غیر قانونی طریقے بھی برملا استعمال کیے اپنے مخالفین کو کچلنے اور ان کی تادیب کے لیے ایم کیوایم مشہور رہی ہے۔

جماعت اسلامی کی طرح اس کے مسلح جتھے بھی پارٹی کمانڈ پر لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں۔ صولت مرزا ان میں سے ایک ہے جس کو خاصی شہرت ملی۔

ایم کیوایم کے لیے (ماضی، حال، مستقبل) چند بڑے خدشات

ایم کیو ایم کے لیے زندگی کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہی اپنے قیام سے پہلے، بعد میں اور آئندہ بھی ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ ایم کیو ایم کی منصوبہ بندیاں لوگوں کو اور مخالفین کو اس کے خلاف اکساتی رہتی ہیں۔ ایم کیو ایم اپنے قیام کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کے خلاف قوم پرست سندھیوں کے خلاف نبرد آزما نظر آتی ہے۔ پھر پاکستان مسلم لیگ (ن)، فوج، خفیہ ادارے اس کے خلاف محاذ جنگ کھولتے نظر آتے ہیں۔ حکیم سعید کے قتل کے بعد کا آپریشن ہو یا ۱۹۹۲ء کا آپریشن اس جماعت کی بیخ کنی کی کوششیں جاری رہی ہیں۔

اس جماعت کے خلاف ۱۹۸۶ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۸ء میں فوجی آپریشن کیے گئے جو اس جماعت کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ اب تک کی سب سے بڑی سیاسی شکست (اگر اس کو شکست کہا جاسکتا ہے) تو ایم کیو ایم کا ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں تحریک انصاف کے مقابلے میں پھیکا پڑنا ہے۔ گو کہ تحریک انصاف کوئی قابل ذکر سیاسی نقصان نہ پہنچا سکی لیکن عوام کا تحریک انصاف کو انتخابات میں بڑی تعداد میں ووٹ دینا ایم کیو ایم کے لیے ایک لمحہ فکریہ ضرور تھا۔ پہلی مرتبہ عوام نے بڑی شدت سے ایم کیو ایم کے خلاف ووٹ کا استعمال کیا۔ تحریک انصاف اس کامیابی کو لے کر آگے نہ چل سکی وہ اور بحث ہے لیکن ایم کیو ایم کے سیاسی خاتمے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ کار گر نہ ہوا۔

حالیہ دنوں میں الطاف حسین کی تقاریر (ملک دشمن) کے بعد مصطفیٰ کمال کی پاک سرزمین پارٹی پھر فاروق ستار اور خالد مقبول صدیقی کے درمیان جاری لڑائی ایم کیو ایم کو بہت کمزور کر رہی ہے۔

آنے والے دنوں میں ایم کیو ایم کو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے انتخابی نتائج (۲۰۱۸) کے آنے کے بعد ایم کیو ایم شاید کسی اچھے وقت کا انتظار کرنے لگی ہے۔

حاصل کلام

اپنے مقالے کے پہلے باب میں شہر کراچی کے سماجی، سیاسی، معاشی خدوخال اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ آگے چل کر جب اردو کے کراچی کے بارے میں لکھے جانے والے بڑے ناولوں کا تذکرہ کریں تو کراچی کی تفہیم قدرے آسان ہو جائے۔ یہ سفر سندھ کی ابتدائی تاریخ سے ہوتا ہوا حالیہ دور پر ختم ہوتا ہے۔

کراچی شہر جو انگریزوں کے سندھ پر قبضہ کرنے سے پہلے کوئی قابل ذکر علاقہ نہ تھا۔ سیٹھ ناؤمل ہوت چند کے ہمراہ چند ہزار لوگوں پر مشتمل ایک قلعہ بند بستی تھا آج تقریباً دو کروڑ تیس لاکھ نفوس پر مشتمل پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر ہے۔ چارلس نیپئیر (Charles Napier) نے سندھ پر ۱۸۳۹ء اور

کراچی پر ۱۸۴۳ء میں قبضہ کیا اس کے بعد کراچی کہانی شروع ہوتی ہے اور تا حال جاری ہے۔

چارلیس نیپئیر کی زیر قیادت کراچی نے ایک ساحلی بستی سے ایک بڑی بندرگاہ کا سفر شروع کیا اور اس بندرگاہ نے جنگ عظیم اول اور دوم میں بڑی خدمات پیش کیں ۔ اس شہر نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، سیاسی، سماجی، معاشی ہر حوالے سے توقع سے بڑھ کر کارکردگی دکھائی۔

اس شہر کی آبادی سرعت سے بڑھی اور اس کا تناسب اس وقت تو حد سے باہر ہو گیا جب ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔تقریباً پندرہ سے بیس لاکھ لوگ مہاجرین کی شکل میں اس شہر میں آئے اور شہر کی آبادی کا تناسب جو آزادی سے پہلے ہندوؤں کے حق میں تھا سراسر مسلمانوں کے حق میں ہو گیا تقسیم سے پہلے کراچی ہندو آبادی کا شہر تھا شہر میں ۹۶ فی صد ہندو رہتے تھے جو تقسیم کے بعد صرف دو فی صد رہ گئے۔

شہر میں قدیمی بلوچ بھی آباد تھے جن کی آبادی بھی وقت کے ساتھ بڑھتی رہی ۱۹۶۰ء کے بعد روزگار کے حصول کے لیے آنے والے پٹھان بھی اس شہر کا حصہ بنتے گئے جس سے شہر میں ثقافتی رنگا رنگی بھی نظر آنے لگی۔گو مسائل نے بھی جنم لیا لیکن یہ شہر کبھی مسائل سے نہیں گھبرایا یہ شہر ہار ماننے کو قطعاً تیار نہیں۔

پٹھانوں کے ساتھ ساتھ پنجابی، ہزارے وال، بلوچ آتے گئے اور شہر میں کچی آبادیوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔آج کراچی میں پشاور سے زیادہ پٹھان اور بلوچستان کے بلوچوں سے زیادہ بلوچ آباد ہیں۔

ان لوگوں کی آمد سے سیاسی حرکیات میں بھی تبدیلی آئی، معاشی طور پر پٹھان ٹرانسپورٹ کے شعبے میں پنجابی تعمیرات، بلوچی بندرگاہ پر کام کاج کرتے نظر آتے ہیں لیکن سیاسی طور پر پٹھان عوامی نیشنل پارٹی(ANP) اور بعد میں تحریک انصاف کو ووٹ ڈالتے نظر آتے ہیں۔

مہاجرین نے ایم کیو ایم کی آمد سے پہلے مذہبی جماعتوں کو اور بعد میں صرف ایم کیو ایم کو منتخب کیا۔شہر کی فضا تقسیم کے بعد ہی مکدر ہونا شروع ہو گئی تھی ۔ابتدا سندھی، مہاجر تنازع سے ہوئی جب مہاجرین کی بڑھتی تعداد نے سندھیوں کے اس خوف کو ہوا دی کہ وہ اپنے علاقے میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔مہاجرین کی آمد سے شہر پر تبدیلیوں کے دوازے کھل گئے۔

یہ شہر ۱۹۴۸ء میں دارلحکومت بنا پھر ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ بنایا گیا اور پھر ۱۹۵۸ء میں دارلحکومت بھی اسلام آباد منتقل ہو گیا۔

سندھی اپنے کلچر، زبان، ثقافت کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں تو مہاجرین کے خوف سے انھوں نے حفاظتی اقدامات اٹھانے شروع کیے جب ذوالفقار علی بھٹو سامنے آئے تو سندھی لازمی زبان قرار پائی۔کوٹہ سسٹم کا نفاذ ہوا یہ سب ردِعمل تھا تا کہ خود کو اپنے کلچر اور زبان کو بچایا جا سکے۔

ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ضیاء الحق نے اسلام کو بطور آلہ کار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا تو شہر میں مزید بدامنی، احتجاج، طلبہ تنظیموں کی لڑائیاں، جماعت اسلامی اور مہاجر قومی موومنٹ جیسی تنظیمیں ابھرنے لگیں۔

ضیاء دور میں ہی ایم کیو ایم بنی اور پھر شہر کے اندر قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔الطاف حسین نے مہاجرین کو حقوق دلاتے دلاتے بہت سے لوگوں کے حقوق غصب کرنے بھی شروع کر دیے۔

ایم کیو ایم اپنی مقبولیت کی معراج پر پہنچی اور تمام الیکشن منعقدہ ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۷ء، ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۳ء میں کراچی سے تقریباً تمام نشستیں قومی اور صوبائی اسمبلی کی جیتنے میں کامیاب ہوئی۔

ایم کیو ایم کے ساتھ پشتونوں کے جھگڑے آگے چل کر طالبان اور جہادیوں کے شہر میں آنے سے اُن کے ساتھ قتل و غارتگری جاری رہی۔ جہادی شہر کی معیشت میں اپنا حصہ مانگنے لگے شہر میں پہلے سے موجود بھتہ خوروں کو یہ بات پسند نہیں تھی اس لیے شہر ایک دفعہ پھر خاک و خون میں نہلا دیا گیا۔

شہر کی زمینوں پر قبضے کی بھی الگ داستان ہے شہر جو قبضہ گروپوں کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا تھا اور جو لوگ جیسے پروین رحمان ان کے سامنے آتا وہ مار دیا جاتا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کی نمائندہ جماعت ہے اور قومی اور صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرتی رہی ہے لیکن ۱۹۸۹ء کے بعد کراچی شہر پر ایم کیو ایم کا راج رہا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ایم کیو ایم کا زور توڑنے کے لیے مختلف آپریشن بھی کرائے لیکن ایم کیو ایم کا زور کم نہ ہوا۔اس ساری زور آزمائی اور چھینا جھپٹی نے شہر کو تباہ حال کر دیا ہے۔

اس شہر کے باسی شروع دن سے آج تک ایک خوفناک اداسی کا شکار ہیں۔اس شہر نے جہاں لوگوں کو روزگار دیا وہیں کتنے ہی والدین سے ان کے جوان بچے، بچوں سے باپ، ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے بھائی چھین بھی لیے ہیں۔ یہ شہر دکھ سکھ کا جھولتا پنڈولم ہے جہاں معلوم نہیں کب خوف کی چادر تن جائے۔اس شہر کے باسیوں نے ہر دفعہ زخم کھا کر جینے کی نئی امنگ سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔شہر کی گزشتہ تین دہائیاں کیسے گزریں ایک سے دوسری نسل کو ورثے میں کیا ملا اس کا احوال صرف اخبارات اور اخباری کالمز میں نہیں ملتا بلکہ

اس کا احوال ہمیں اہل قلم کے ہاں نظر آتا ہے۔

شوکت صدیقی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، زاہدہ حنا، فہمیدہ ریاض، خالد محمود اختر اور محمد امین نے اس شہر کو کس طرح دیکھا اور دکھایا ہے۔

یہ وہ موضوعات ہیں جن پر اگلے ابواب میں تفصیلی بات کی جائے گی۔ پہلے باب کا اختتام پروین شاکر کی ایک نظم پر کیا جاتا ہے جو لکھے گئے کئی صفحات پر بھاری ہے۔

کراچی
ایک ایسی بیسوا ہے
جس کے ساتھ
پہاڑوں، میدانوں اور صحراؤں
سے آنے والا
ہر سائز کے بٹوے کا آدمی
رات گزارتا ہے
اور صبح اٹھتے ہی
اس کے دائیں رخسار پر
ایک تھپڑ رسید کرتا ہے
اور دوسرے گال کی توقع کرتے ہوئے
کام پر نکل جاتا ہے
اگلی رات کے نشے میں
سرشار

حوالہ جات و حاشیہ

۱۔ احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب کراچی، محمد حسین اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء ص ۴

۲۔ ایضاً

۳۔ سید ادیب حسن، کراچی اور اس کی بندر گاہ، عظمیٰ پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء ص ۱۷

۴۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۳۳

۵۔ کھتری عبدالغفور کانڈا کریا، کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی، کھتری پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۴ء ص ۲۹

۶۔ ناؤمل ہوت چند، "یاداشتیں" مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم رفیق احمد نقش، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۳۰

۷۔ سید مظہر جمیل، جدید سندھی ادب میلانات، رجحانات اور امکانات، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۱۷۵

۸۔ ناؤمل ہوت چند، "یاداشتیں" مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم رفیق احمد نقش، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۳۲

۹۔ ایضاً ص ۳۳

۱۰۔ سید ادیب حسین، کراچی اور اس کی بندر گاہ، عظمیٰ پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء ص ۴۹

۱۱۔ ایضاً ص ۴۴

۱۲۔ ایضاً ص ۴۵

۱۳۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۴۵

۱۴۔ M. Hanif Raza *"Karachi The Show Window of Sindh"* Edition Mysique, Kaachi 1984, P-29

۱۵۔ کیول رام رتن مل ملکانی، "سندھ کی کہانی"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم اجمل کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۹۰

۱۶۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۲۱۲

۱۷۔ کھتری عبدالغفور کانڈا کریا، کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی، کھتری پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۳۵۷

۱۸۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۲۲۵۔۲۲۶

۱۹۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء ص ۲۳۰

۲۰۔ احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب کراچی، محمد حسین اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء ص ۱۱۹

۲۱۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۲ء ص ۲۸۳

۲۲۔ ایضاً ص ۲۹۷

۲۳۔ پیر علی محمد راشدی "وہ دن، وہ لوگ" مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم، اجمل کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۱۱

۲۴۔ ایضاً ص ۲۱۲

۲۵۔ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۲ء ص ۴۱۴

۲۶۔ ایضاً ص ۴۱۵

۲۷۔ رفعت خان ہیورڈ، "کراچی کے گوئن"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم اجمل کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۱۱

۲۸۔ ایضاً ص ۲۱۲

۲۹۔ اے بی ایس جعفری، "شہر آرزو کراچی کی داستان غم"، مترجم برہان الدین حسن رائل بک کمپنی، لاریٹ پیکجز کراچی، ۱۹۹۷ء ص ۲۹

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۱۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۵۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۳۔ عارف حسن، "کراچی شہر تغیرات کی زد میں"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم افضال احمد سید، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۴۳۳

۳۴۔ ڈاکٹر فیروز احمد، "سندھ کے قومی مسائل کی سیاسی بنیادیں"، مشمولہ: پاکستان میں قومی تضاد اور سندھ کا مقدمہ، مترجم منیر چانڈیو، مرتبہ جامی چانڈیو، سنٹرل فار پیس اینڈ سول سوسائٹی، حیدر آباد، ۲۰۱۰ء ص ۹۲

۳۵۔ عارف حسن، "کراچی کی صورتحال تناظر اور تجزیہ"، مترجم افضال احمد سید، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد دوم، مرتبہ اجمل کمال، سٹی بک پریس شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۶۰۱

۳۶۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۲۶، ۱۰۲۷

۳۷۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستا اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء ۷۴

۳۸۔ ایضاً ص ۷۹

۳۹۔ ایضاً ص ۸۰

۴۰۔ Arif Hasan "From the Demise of Cosmopolitansim to its *Revival*. Trends and Repercussions for Karachi" included in the *"Cityscapes of Violence in Karachi"* Oxford University Press New York, 2017, P-180

۴۱۔ Laurent Gayer *"Karachi Ordered Disorder and the Struggle for the City"* Oxford University Press New York, 2014, P-55

۴۲۔ ibid.P-55

۴۳۔ ibid.P-59

۴۴۔ ibid.P-61

۴۵۔ Student Violence *"The rising Graph"* The Herald, October 1988, P-66

۴۶۔ Laurent Gayer *"Karachi Ordered Disorder and the Struggle for the City"* Oxford University Press New York, 2014, P-62

۴۷۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۵۴

۴۸۔ سلیم شہزاد، شعور کا سفر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص

۴۹۔ ایضاً ص ۲۹

۵۰۔ ڈاکٹر عمران فاروق ایم کیو ایم کے سرکردہ لیڈر تھے اور الطاف حسین کے بعد وہ مرکزی قائد تھے۔ وہ پاکستان میں تقریباً دس سال زیر زمین روپوش رہے جب آپریشن کلین اپ شروع کیا گیا۔ افواہیں تھیں کہ وہ ایم کیو ایم کے مسلح ونگ کے انچارج تھے۔ ۱۹۹۹ میں وہ لندن آئے اور پھر ۲۰۱۰ء کو انھیں لندن میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے قاتل ہنوز گرفتار نہیں ہوئے۔

باب دوم

کراچی کی معاشرتی زندگی اور اُردو ناول

تقسیم کے بعد کراچی کی سماجی، سیاسی، معاشی زندگی میں تغیر برپا ہوا۔ ایک پرسکون اور جمے جمائے شہر کا منظر نامہ تیزی سے بدلتا چلا گیا۔ اس تبدیلی نے اس شہر کے رہنے والوں کو اپنے ٹرانس میں جکڑ رکھا ہے۔ اگر شہر کی معاشرتی زندگی کو دیکھیں تو دو بڑے ادوار نظر آتے ہیں۔ ایک دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوکر ۱۹۸۰ء کی دہائی تک جاری رہتا ہے دوسرا دور ۱۹۸۰ء کے آخری سالوں سے شروع ہوکر تا حال جاری ہے۔ ان ادوار میں شہر کے لوگوں پر کیا بیتی ان کی زندگیاں کسی طرح متاثر ہوئیں۔ شہر بنتے اور بستے ہوئے جس کرب سے گزرتے ہیں ان کا احوال شہریوں کی زندگیوں پر یوں مرتسم ہوتا ہے کہ شہر کی کیفیت شہری کا روزمرہ احوال بن جاتی ہے۔ اس شہر نے کھلی فضا سے آغاز کیا اور گھٹن پر اس کا خاتمہ ہوا۔

شہر کی فضا میں بارود کی بو گھلتی گئی شہر مردہ ہوتا گیا۔ ہنستا، مسکراتا جگمگاتا شہر کیسے اور کیونکر بجھ گیا؟ ان سوالوں کے جواب شہر والوں کی زندگی میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں اردو لکھنے والوں نے ان سوالوں کے جواب کھوجے ہیں۔ ادب ظاہر ہے اخبار کی طرح ظاہری پرت پر اظہار خیال کا نام نہیں۔ ادب تو تہہ میں چھپی گتھیوں کو کھوجنے اور رستے زخموں کی حقیقت جاننے کا عمل ہے۔ اردو کے بڑے لکھاریوں نے کراچی کی اس کراہتی، سسکتی، روتی، بلکتی کیفیت کی شاندار منظر کشی کی ہے۔

کراچی کے باسی اس لحاظ سے داد و تحسین کے حق دار ہیں کہ اس شہر کی محبت میں ان لوگوں نے خونچکاں حادثے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان حادثوں کے بیچ زندگی کو آگے بڑھایا۔ راہبروں، راہ زنوں کا یکساں مقابلہ کیا۔ ان کی اس ہار نہ ماننے کی ہٹ کے سامنے خونی مناظر کی ایک نہ چلی اور شہری، شہر کو سنوارنے ،سجانے میں ہمہ تن مصروف رہے۔

کراچی پر اخبارات، رسائل، مجلوں، عالمی میگزینز میں بے شمار مضامین شائع ہوئے۔ شہر کی حالت نے بہت سوں کو اپنی طرف متوجہ کیا شاعری اور نثر دونوں لکھنے والوں نے شہر کو اپنے انداز میں دیکھا اور اظہار خیال بھی کیا۔ افسانہ لکھنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے شہر پر افسانے تحریر کیے۔

اس مقالے کا موضوع کراچی پر لکھے گئے ناول ہیں تو موضوع کی تحدید کا خیال رکھتے ہوئے صرف

ناول کی حد تک خود کو محدود رکھیں گے۔ کراچی پر کئی ناول لکھے گئے اور کچھ ناولوں میں ضمناً کراچی کا تذکرہ آیا ہے۔

ان سب کو اس تحقیق کے دائرے میں شامل کیا ہے اور جہاں بھی جس نے کراچی کے کچھ منظر قاری سامنے رکھے ہیں ان کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ شہر کی حرکیات اور شہری زندگی کے جو گوشے لکھنے والا دکھانا چاہتا ہے اُن کو دیکھا اور سمجھا جائے۔ ان ناولوں کے ذریعے شہر کی تفہیم کے جو مراحل سامنے آتے ہیں ان پر گفتگو سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان تمام ناولوں کی ایک فہرست پیش کردی جائے۔

خیال رہے کہ اس منصوبے میں ضخیم ناولوں کے ساتھ ساتھ کچھ ناولٹ بھی شامل ہیں جو خالصتاً کراچی اور اس کا لینڈ سکیپ بیان کررہے ہیں۔

خدا کی بستی	شوکت صدیقی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
چاکی واڑہ میں وصال	محمد خالد اختر
ہائوسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر
ستیا ہرن	قرۃ العین حیدر
آب گم	مشتاق احمد یوسفی
ایک صدی کی کہانی	رضیہ فصیح احمد
آگے سمندر ہے	انتظار حسین
خواب رَو	جوگندر پال
نہ جنوں رہا نہ پری رہی	زاہدہ حنا
مٹھی بھر ہوا	کوکب جمیل
کراچی	فہمیدہ ریاض
کراچی والے	محمد امین

ان میں سے بیشتر ناول کراچی اور اس کا لوکیل اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ کچھ ناول ایسے ہیں جن میں کراچی کا ذکر تو ضمناً ہے لیکن وہ تذکرہ اتنا بھرپور جامع اور مکمل ہے کہ گویا سمندر کو کوزے میں بند کردیا گیا

ہے۔جیسے قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا اور مشتاق احمد یوسفی کی آب گم ان تذکروں سے صرف نظر کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا لہٰذا ان کو بھی شامل کیا گیا یا یوں کہیے ان ناولوں نے اپنے آپ کو شامل کرایا۔

بعض ناول سارے کراچی اور اس کے باسیوں کو چلتے پھرتے دکھاتے ہیں۔انتظار حسین کا آگے سمندر ہے محمد خالد اختر کا چاکی واڑہ میں وصال فہمیدہ ریاض کا کراچی زاہدہ حنا کا نہ جنوں رہا نہ پری رہی اس کی واضح مثالیں ہیں۔

دوسرے باب میں شوکت صدیقی کا خدا کی بستی انتظار حسین کا آگے سمندر ہے محمد خالد اختر کا چاکی و اڑہ میں وصال قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا اور یوسفی صاحب کا آب گم شامل ہے۔

اُردو ناول اور کراچی کی جھلکیاں

اُردو ناول میں کراچی اور کراچی کے باسیوں کی جھلکیاں زیادہ قدیم نہیں ہیں۔کراچی کی معاشرت ۱۹۴۷ء کے بعد نظر آتی ہے۔۱۹۴۷ء کئی حوالوں سے بہت زیادہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جوق در جوق لوگ پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔اس قدر بڑی نقل مکانی بذات خود ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔جمے جمائے گھر، کاروبارِ حیات، روزگار، تعلیم کے وسائل، بزرگوں کی نشانیاں چھوڑ کر ایک انجانی سرزمین کی طرف نکل کھڑا ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔

ہجرت کے اس عمل نے کراچی شہر کو لاکھوں نئے لوگوں سے روشناس کرایا یہ لوگ جب کراچی پہنچے تو ان کے ساتھ ساتھ ان کے خواب بھی کراچی آئے۔اس سرزمین کو دارالامان سمجھ کر کراچی آنے والوں پر کیا بیتی ان کے خواب پورے ہوئے؟ ان کے آنگن میں خوشیوں نے جھولے ڈالے؟ ان کے زخم مندمل ہوئے؟ یا ماضی جو مستقل ان کے ساتھ تھا، اس سے چھٹکارا ملا؟

یہ اور ان جیسے کئی سوال تھے جن کے جواب پاکستانی ادیبوں نے فراہم کیے۔قلم کاروں نے ان لوگوں کے کرب، دکھ، الم اور غم میں جھانکا ان کی زندگیوں کو غور سے دیکھا اور اس کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ اس کیفیت کا ہو بہو تاثر پیدا کر دیا ہے۔

اتنی بڑی تعداد میں لوگ مغربی پاکستان پہنچے تو پنجاب سے آئے مہاجرین کو تو پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد کر دیا گیا اور پنجاب میں صرف اتنے ہی مہاجرین کو اجازت دی گئی جتنے مہاجرین پاکستان سے ہندوستان

گئے تھے لیکن سندھ اور کراچی کا حال جدا تھا۔ یہاں ایک بڑی تعداد میں اتر پردیش، لکھنو، دکن راجپوتانہ سے آئے لوگوں کی تھی۔ ان لوگوں کی تہذیب وثقافت ایک نہ تھی۔ بود باش، رہن سہن، غم خوشی کے انداز ایک نہ تھے جب یہ لوگ نئی سرزمین پر پہنچے تو ان کے باہم ادغام سے ایک نئی کیفیت نے جنم لیا۔ چونکہ یہ لوگ ہجرت کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے لہٰذا ان کی متفقہ شناخت "مہاجر" کہلائی۔

ان لوگوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعبیر کے مطابق ایک بہت بڑی قربانی دی تھی بالکل ویسے ہی جیسے نبی کریم ﷺ کے اصحاب نے پہلے حبشہ اور پھر مدینے کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہ لوگ یہ بات سوچنے میں حق بجانب تھے کہ ان کی اس قربانی کا احساس کیا جائے گا۔ یہ خوابوں کی سرزمین کو سجانے، سنوارنے اور اپنا حصہ ادا کرنے آرہے تھے۔ ان کے پاس خوابوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ہجرت کے غم، راستے کی تکالیف، اغیار کی ریشہ دوانیوں کے باوجود یہ لوگ خوشی خوشی پاکستان پہنچ رہے تھے۔

پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کے لیے ان سب کو گھر، خوراک، روزگار فراہم کرنا کسی طور ممکن نہ تھا۔ غیر مستحکم حکومت اتنا بڑا بوجھ کیونکر برداشت کرسکتی تھی۔ شروع میں تو ان لوگوں کی خاطر مدارت کی گئی سندھ کے بڑے شہر کراچی، حیدرآباد مہاجرین کے سیلاب کا منظر پیش کرنے لگے۔

اس سارے عمل کی تفصیل سید مظہر جمیل کی کتاب آشوب سندھ اور اُردو فکشن میں کچھ یوں نظر آتی ہے۔

> ان پناہ گزینوں کے سیلابی ریلے یوپی، دلی، بہار، دکن، بمبئی، راجپوتانہ اور جنوبی ہند کے طول وعرض سے وارد ہوئے تھے جو مختلف سماجی وتہذیبی پس منظر اور جداگانہ طرز بود باش رکھتے تھے۔ جن میں مذہب کے علاوہ اگر کوئی دوسری قدر مشترک تھی تو وہ اُردو زبان تھی۔ جسے وہ اپنے اپنے علاقائی لب ولہجے میں بولتے تھے اور یہ بات گویا انھیں باور کرائی گئی تھی کہ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین ہے جہاں ان کی آئندہ نسلوں کا مستقبل محفوظ ہے۔ جب کہ مشرقی پنجاب سے آنے والے پناہ گزینوں کی اکثریت نے خطہ پنجاب ہی کو اپنی آبادکاری کے لیے منتخب کیا تھا جہاں نہ تو انھیں کسی تہذیبی مغائرت سے واسطہ تھا اور نہ لسانی افتراق کا سامنا۔ ہر چند کہ وادی سندھ نے ان پناہ گزینوں کا کھلے بازوؤں اور کشادہ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا لیکن باہر سے آنے والوں کا سیلابی ریلا ایسا تند و تیز تھا کہ یہاں کے معاشرتی

ڈھانچے میں اتھل پتھل کی کیفیت پیدا ہوکر رہ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے کراچی کے علاوہ سندھ کے دوسرے شہر بھی مہاجر آبادیوں کے جزیروں میں تبدیل ہوگئے۔[1]

مہاجرین کی آمد سے سندھ کی بالعموم اور کراچی کی بالخصوص زندگی یکسر تبدیل ہوکر رہ گئی۔ شہر ایک بہت بڑی جھونپڑیوں کی آبادی بن گیا۔ جگہ جگہ جھونپڑیوں کے جنگل اُگ آئے۔

ان آبادیوں میں بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں سب کے سب سانس لے رہے تھے۔ زندگی کا پہیہ چل رہا تھا۔ ان لوگوں کا احساس تفاخر، عزت نفس، خاندانی رعب داب سب کا سب مٹی میں مل رہا تھا۔ دو وقت کا کھانا پیدا کرنا بھی ان لوگوں کے لیے جان سے گزرنا تھا۔ باہمی یگانگت، الفت، اخوت، محبت کا رشتہ جو یہاں کے قدیمی سندھیوں نے نئے آنے والوں سے استوار کیا تھا دھیرے دھیرے اس رشتے میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ خودغرضی، لالچ، طمع، ہوس کے زہریلے ناگ اپنے پھن پھیلانے لگے تھے۔ یہ کیفیت تیزی سے تمام لوگوں کو اپنی گرفت میں لینے لگی۔ مجبور و مقہور لوگوں کا دکھ درد کا ساتھی کوئی نہ رہا۔ ان بے بس، لاچار، خانماں برباد لوگوں کی کہانی شوکت صدیقی نے اپنے ناول خدا کی بستی میں سنائی ہے۔

خدا کی بستی شوکت صدیقی کا بڑے معرکے کا ناول ہے۔ شوکت صدیقی کو اس ناول سے جو شہرت، عزت اور مالی فوائد حاصل ہوئے وہ بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہوئے ہیں۔

خدا کی بستی کو جب ٹی۔ وی ڈراما سیریل کے طور پر پیش کیا گیا تو شوکت صدیقی کو فلم سٹار جیسی قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ شوکت صدیقی لکھنو میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے مفلوک الحال طبقے کی نمائندگی بہترین انداز میں کرنے کے قابل ہوئے۔

خدا کی بستی کے تفصیلی احوال سے پیش تر اس مصنف کا احوال آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو اس قدر بڑا اور عظیم ناول لکھتے وقت کن حالات سے گزر رہا تھا۔ طاہر مسعود کو دیئے گئے انٹرویو میں جو طاہر مسعود کی کتاب یہ صورت گر کچھ خوابوں کے میں درج ہے۔ شوکت صدیقی، طاہر مسعود کے سوال خدا کی بستی کا کتنا حصہ حقائق پر مبنی ہے؟ کہ جواب میں کہتے ہیں۔

> اس وقت میں آپ سے اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھا گفتگو کر رہا ہوں۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں اپنا افسانہ تیسرا آدمی لکھتے وقت میں معاشی اعتبار سے تباہ حال ادیب تھا۔ اس زمانے میں ادیب پیسے لے کر کھا جاتے تھے۔ اس لیے ابن انشاء کو ضمانتی مقرر کیا گیا تھا کہ جب میں

اپنا مسودہ اُنھیں دوں تو وہ اس کا معاوضہ پچاس روپے تھے ادا کریں گے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جیکب لائین کے ایک تنگ کوارٹر میں رات گئے میں بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا اور وہاں بیٹھے بدقماش لوگ جوا کھیل رہے تھے۔ جوئے کی ایک کھردری قسم ہوتی ہے جسے "مانگ پتہ" کہتے ہیں۔ وہ مانگ پتہ کھیل رہے تھے اور چرس پی رہے تھے۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور میں چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے کہانی لکھنے میں مگن تھا۔ وہ کھیلتے کھیلتے مجھے مخاطب کر کے کہتے سوکت صاحب! معسوکوں کو خط لکھے جا رہے ہیں۔ خدا کی بستی کی کہانی اسی زمانے کی ہے۔[۲]

خدا کی بستی کی مقبولیت کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں شوکت صدیقی کہنے لگے۔

ناول شائع ہوتے ہی مقبول ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن تو نہایت تیزی سے فروخت ہوا اور ۱۹۶۰ء میں جب اسے آدم جی پرائز ملا تو پبلشر کے دل میں بے ایمانی پیدا ہوئی۔ میں نے اسے صرف دو ایڈیشن دیئے تھے، لیکن جب اس نے دیکھا ناول بہت بک رہا ہے تو اس نے اس کی فوٹو فلم بنالی اور اسے شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس ناول کو عوامی سطح پر اُس وقت بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی جب ٹی وی پر اس کی ڈرامائی تشکیل ہوئی۔ اس زمانے میں کسی گلی سے گزرتا تو لوگ ایک دوسرے کو بتاتے وہ دیکھو خدا کی بستی کے مصنف جا رہے ہیں۔ دکاندار چیزوں پر خود ہی رعایت دے دیتے تھے۔ اس ناول نے مجھے وہ شہرت دی جو عموماً شوبزنس کے افراد کو ملتی ہے۔[۳]

خدا کی بستی مقہور و مجبور لوگوں کی داستان

خدا کی بستی دراصل زندگی کی تلخ حقیقتوں کا بیان ہے۔ زندگی کی مشکلات، غم کے سیلاب، دکھ کے دریا کو پار کرتے لوگوں کی کتھا ہے جن کے خواب بکھرتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستے ہوئے مرجاتے ہیں۔ ان خانماں برباد لوگوں کا نوحہ ہے جو صرف زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہجرت کرنے کے بعد جب خوابوں کے دیس پہنچے تو یہاں بھی آسمان کی بے مہری نے اُنھیں ایک پل چین سے نہ رہنے دیا۔ ان سوختہ جانوں کے قصے ہیں جو زمانے کی خودغرضی کا شکار ہوئے۔

خدا کی بستی کا لوکیل(Locale)

خدا کی بستی کا لوکیل(Locale) کراچی نہیں ہے بلکہ کراچی سے تقریباً دوسو میل کے فاصلے پر واقع کوئی شہر ہے جہاں سے ٹرین کے ذریعے کراچی چند گھنٹوں میں پہنچا جا سکتا ہے۔ متن کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر "حیدر آباد" ہے۔

خدا کی بستی کا اجمالی سا تعارف سید مظہر جمیل کی کتاب آشوب سندھ اور اردو فکشن میں ملتا ہے۔ سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

> خدا کی بستی دراصل زندگی کے سوختہ اور دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے ملبے سے امیدوں، امنگوں اور حوصلوں کی نئی کونپلوں کے سر اُٹھانے اور برگ و بار لانے کی منظر کشی ہے اور ریزہ ریزہ بکھری ہوئی زندگی کو از سر نو مرتب کر کے اور مصاف زندگی کی تگ و تاز میں ٹوٹے ہوئے نظام تنفس کو پھر سے بحال کرنے کی کہانی ہے۔ یہ داستان ہے ان مفلوک الحال، بے خانماں برباد، ٹوٹے پھوٹے، خستہ تن، شکستہ دل، بے آسرا لوگوں کی جو بے زمینی ہی نہیں بلکہ اپنے سروں پر اجنبی آسمان کی بے مہری کے آزار کے بھی شکار ہیں۔ جنھوں نے ہجرت کے آتشیں دریا کو پار کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو ویسے ہی درندہ صفت وحشی رویوں کے روبرو پایا جن سے وہ بھاگے تھے۔[۴]

خدا کی بستی کے کرداروں کی بے بضاعتی

خدا کی بستی مجبور و مقہور لوگوں کی داستان ہے جو کراچی کو خوابوں کی سرزمین سمجھ کر ہجرت کے دکھ اٹھاتے کراچی پہنچے اسی طرح خدا کی بستی کے کردار جب زمانے کی ناسازگاری، اپنوں کی بے وفائی سے مجبور ہوتے ہیں تو وہ بھی کراچی کا قصد کرتے ہیں۔ کراچی جو لاکھوں لوگوں کے لیے جائے پناہ ہے جو رات کو چھت اور دن کو خوراک فراہم کرنے میں بہت فیاض واقع ہوا ہے ان کرداروں کے لیے ایک بھیانک خواب بن جاتا ہے۔

خدا کی بستی کے راجا، نوشا اور شامی کراچی سے دور دریا کنارے کسی بستی میں چھوٹے چھوٹے گھروں کے غریب مکین ہیں۔ یہ بچے زندگی کی گاڑی کو کھینچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ راجا ایک بھکاری کی ریڑھی کھینچتا ہے۔ نوشا ایک مکینک کے پاس کام سیکھتا ہے اور شامی باپ کی مار کھانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے

گھروں میں اخبار بھی پہنچاتا ہے۔تینوں کرداروں کی کہانی میں غربت اور دکھ کا پہلو مشترک ہے۔

راجا کی ماں اُسے یتیم خانے چھوڑ دیتی ہے۔نوشا کی ماں عبداللہ مکینک کے پاس جو انتہائی ظالم شخص ہے اور شامی کا باپ بات بات پہ شامی کو دھنک کر دکھ دیتا ہے۔تینوں شام کو گلی میں بیٹھ کر آپس میں کبھی تاش کھیلتے ہیں کبھی فلم دیکھنے نکل جاتے ہیں اور کبھی آپس میں لڑائیاں کرتے ہیں۔

ان کی زبان گلی کے لونڈوں کی طرح بازاری اور عامیانہ ہے۔تینوں جب اپنے اپنے حالات سے تنگ آتے ہیں تو فیصلہ کرتے ہیں کہ کراچی چلا جائے ناول میں شوکت صدیقی اس کا احوال کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> راجا کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجلاہٹ رفتہ رفتہ مٹتی جارہی تھی اور دکھ کا احساس سائے کی طرح پھیلتا جارہا تھا۔کھولی کے پچھواڑے کھنڈر میں ایک کتا خوفناک آواز سے رو رہا تھا۔بہت دیر بعد راجا کی آواز ابھری۔یار میرا تو جی چاہتا ہے اس سالے شہر کو ہی چھوڑ دیں۔بول کیا کہتا ہے؟ مگر جائیں تو کہاں؟ ابے کراچی چلیں گے۔بڑے زوروں کا شہر ہے۔کام تو وہاں پھٹ آسانی سے مل جاتا ہے۔[۵]

اور اسی رات وہ کراچی روانہ ہو جاتے ہیں۔ایک بچے کی زبان سے ادا ہونے والا یہ جملہ کہ "کام تو پھٹ آسانی سے مل جاتا ہے"

دراصل کراچی کی اس معاشی گہما گہمی کا اظہار ہے جس کے لیے کراچی مشہور ہے کراچی کے بارے میں تصور کہ غریبوں کی ماں" کوئی بھوکا نہیں سوتا" سب کے سب اس جملے میں آ گئے ہیں۔

کراچی آج اگر دو کروڑ آبادی کا شہر ہے تو اس کی وجہ معاش کا یوں آسانی سے دستیاب ہونا بھی ہے۔ کراچی نے نہ صرف مہاجرین کو جو قیام پاکستان کے بعد آئے بلکہ پنجابی، پٹھان، بلوچ، کشمیری، گلگت بلتستان سے آئے لاکھوں لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔ذریعہ معاش کی یہ فراوانی کراچی کا حسن بھی ہے اور یہی شاید اس کا سب سے بڑا قصور بھی ہے۔

راجا، نوشا اور کراچی

یہ بچے جب کراچی پہنچتے ہیں تو کہانی کراچی کے گلی کوچوں میں پھیل جاتی ہے۔

کراچی کی معاشی سرگرمیاں، جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ۔ ان گروہوں کے کارندوں کا شہر کے ریلوے اسٹیشن، بس اڈوں پر معصوم بچوں کے اغواء کے لیے ڈیرے اور ان بچوں پر کیا بیتتی ہے اس کا ذکر تفصیل سے شوکت صدیقی کے ہاں ملتا ہے۔ اختصار سے ان گلی کوچوں اور شاہراؤں کا تذکرہ جن پر خدا کسی بستی کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔

راجا، نوشا اور شامی کراچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو آدھے راستے سے شامی واپس چلا جاتا ہے۔ راجا اور نوشا کراچی ریلوئے اسٹیشن پر اُترتے ہیں تو کہانی کا بہتا دریا انھیں بہاتا ہوا ریلوے اسٹیشن سے جھگیوں کی بستی، ہاؤسنگ سوسائٹی، جمشید روڈ، عامل کالونی، گزری، کالا پل، ڈرگ روڈ، بورسٹل جیل، بندر روڈ، عثمان آباد، صدر کے ایرانی چائے خانے۔ کیماڑی، سولجر بازار، ایمپریس مارکیٹ، بولٹن مارکیٹ، فریئر گارڈن، کلفٹن، لارنس روڈ غرض کراچی کے کونے کونے کی سیر کراتا ہے۔

یہ تمام مقامات خدا کسی بستی کے کراچی والے حصے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں کی چہل پہل، لوگ، خدشات، توقعات سب کے سب ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔

خدا کسی بستی بیان ہے ان جرائم پیشہ گروہوں کا جو معصوم بچوں کو مختلف وارداتوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان سے طرح طرح کے غیر قانونی کام کرواتے ہیں۔ یہ مافیا بچوں کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ کراچی کا جرائم پیشہ طبقہ جو آج کل دیدی دلیری سے لوگوں کو سرعام لوٹتا ہے اس کی نشاندہی شوکت صدیقی پچاس کی دہائی میں صراحتاً کر چکے تھے۔

یہ کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس کی سفاکی، تلخی اور حالات کا جبر مزید نمایاں ہوتا ہے۔ راجا اور نوشا کی پہلی جائے پناہ شاہ جی کا مکان ہے شاہ جی کی نوازشات پر دونوں بچے خوش نظر آتے ہیں۔ لیکن شاہ جی کی مہربانیوں کے پیچھے چھپی خباثت جلد ہی سامنے آجاتی ہے۔ جب شاہ جی انھیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے

شاہ جی راجا کو ایک گھر میں اس نیت سے ملازم رکھوا دیتا ہے تاکہ اُس گھر چوری کی جاسکے۔ راجا کو اس گھر کے باسیوں سے انسیت ہوجاتی ہے اور وہ شاہ جی کی بات ماننے سے انکار کردیتا ہے اس پر شاہ جی اُسے اپنے گرگوں کے ذریعے پکڑ لیتا ہے اور اس پر جو وحشیانہ تشدد کرتا ہے اس کی تفصیل دل دہلا دیتی ہے۔ شوکت صدیقی بیان کرتے ہیں۔

نورا لپک کر راجا کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے چوڑے چوڑے بھدے ہاتھ سے راجا کی گردن دبوچ کر جھکائی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ پکڑ کر گردن کے اوپر چڑھا دی۔ راجا بلبلا کر کر چیخا ارے مر گیا، ہائے مر گیا۔ نورا نے راجا کی کنپٹی پر کہنی سے ضرب لگائی ۔فوراً اس کی آواز بلند ہوگئی ۔نورا نے راجا کی دوسری ٹانگ بھی اُٹھا کر گردن پر چڑھا دی۔ راجا ذرا دیر تک اس حالت میں بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئیں تھیں۔ دونوں ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی اس کی گردن سانپ کا پھن بن گئی تھی ۔راجا اس عالم میں لحہ بھر بھی ٹک کر بیٹھ نہ سکا۔ اس کا جسم کپکپایا اور وہ فرش پر منہ کے بل گرا۔ مگر اس طرح بھی چین نہ آیا تو وہ جاپانی کھلونے کی طرح ادھر ادھر جھولنے لگا۔ ہر بار وہ پہلو بدل کر بڑی دردناک آواز نکالتا ۔ارے میری گردن ٹوٹی۔ ہائے میری ٹانگیں پھٹے جارہی ہیں۔ اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں مرجاؤں گا۔ شاہ جی میری توبہ۔ شاہ جی میں تمہارے قدموں پہ پڑتا ہوں۔[۶]

خودغرضی، طمع، لالچ، ہوس اور حصول زر کا یہ ظالمانہ کھیل صدیوں سے جاری ہے لیکن خدا کی بستی میں یہ کھیل معصوم بچوں کے ذریعے کھیلا گیا۔ کچھ عجیب نہیں کہ شہر کراچی میں جب ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائیوں کے ٹارچر سیل بوری بند لاشیں اور اس قبیل کے دوسرے وحشیانہ مظالم سامنے آنے شروع ہوئے تو چاہیے تھا کہ خدا کی بستی کا دوبارہ مطالعہ کیا جاتا کیونکہ اولین نقوش اس وحشیانہ تشدد کے ان کے ہاں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ جہاں راجا، نوشا پر آئے روز تشدد ہوتا نظر آتا ہے۔

شاہ جی کے اس ظالمانہ رویے کے بعد راجا اور نوشا کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارا نہ تھا کہ اس کا ساتھ دیتے۔

شاہ جی نے راجا کی مدد سے ایک کامیاب چوری کی اور سامان گاڑی میں بھر کر راجا سمیت رفو چکر ہوگیا۔ جن کے ہاں چوری ہوئی وہ بااثر لوگ تھے اس لیے پولیس نے مستعدی دکھائی تو شاہ جی پریشان ہوگیا۔ اس نے راجا اور نوشا کو کسی دوسرے گر کے ہاتھ بیچنے کا پلان بنایا لیکن راجا اور نوشا اس سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ادھر ادھر چھپتے پھرنے کے بعد راجا اپنے پرانے مالکوں کے احسانات یاد کرتے ہوئے انھیں سب کچھ بتانے اور معافی مانگنے کے لیے دوبارہ ہاؤسنگ سوسائٹی جا پہنچا۔

راجا اور نوشا دونوں پولیس کے حوالے کر دیے جاتے ہیں اور شاہ جی اپنے کارندوں سمیت گرفتار ہو جاتا ہے۔ راجا اور نوشا کی کراچی سے شناسائی ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام بچوں کی جیل پہ ہوتا ہے۔ کہانی کا یہ حصہ بڑے چشم کشا واقعات سامنے لاتا ہے۔

غریب اور بے کس لاچار لوگوں کا پرسان حال کوئی نہیں۔ معصوموں کی آہ بکا سننے کے لیے کوئی تیار نہیں ۔ شاہ جی اور نورے جیسے کردار جا بجا بکھرے ہوئے ہیں جو کمزوروں کے سامنے شیر اور زبردستوں کے سامنے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

شوکت صدیقی نے کہانی کے اس حصے کی بنت بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ کراچی میں مافیا کی ابتداء شاید اسی طرح ہوئی ہوگی ۔ شاہ جی اور اس کے کارندے مختلف مقامات پر آوارہ بچوں کو ڈھونڈتے رہتے اور جب موقع ملتا ایسے بچوں کو مختلف جرائم پیشہ گروہوں پر بیچ دیتے ہیں ۔

یہ بچے پھر جرائم کی بھٹی میں پک کر پختہ کار قسم کے چور، اچکے، اُٹھائی گیرے بن کر نکلتے ہیں۔ آہستہ آہستہ جب شہر میں قانون کی حکمرانی کمزور ہوتی گئی یہ لڑکے مافیا کے بڑے کرداروں میں ڈھلتے گئے جنہوں نے بعد ازاں شہر میں مختلف لوگوں کی سرپرستی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔

کہانی میں یہ بات بھی نمایاں ہے کہ جب راجا اپنے مالکوں اور ان کے بچوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے اور ان کے ساتھ اُسے انسیت ہو جاتی ہے تو وہ شاہ جی کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ یعنی جرائم پیشہ لوگ بعض اوقات جرائم سے توبہ تائب ہونا چاہتے ہیں لیکن حالات انھیں پیچھے مڑنے اور اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ چاہتے نہ چاہتے اسی راستے پر رواں دواں رہتے ہیں اور آخر کار ان کا انجام خود ان کے لیے یا معاشرے کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔

راجا جب شاہ جی اور نورے کی بات ماننے سے انکار کرتا ہے تو اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ بہت بھیانک اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے ۔ انصاف کا حصول بھی کمزوروں کے بس کی بات نہیں چوری چونکہ ایک بااثر خاندان کے ہاں ہوتی ہے اس لیے پولیس پوری شدت سے بروئے کار آتی ہے اور شاہ جی کو اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیتی ہے۔

آج بھی کراچی پر نگاہ دوڑائیں تو راجا، نوشا جیسے کردار نظر آئیں گے جو معاشی ناہمواریوں کے ہاتھوں مختلف مجرموں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں اور پھر زندگی ان کے لیے ایک دردناک خواب بن جاتی ہے۔ وہ اپنے

ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا بدلہ معاشرے سے لیتے ہیں اور معاشرے کے لیے ظلم و بربریت کی نئی مثالیں قائم کردیتے ہیں۔

موجودہ کراچی جو اپنی وسعت میں ۱۹۵۷ء کی کراچی سے کہیں زیادہ ہے آبادی بڑھ چکی ہے، مسائل بڑھ چکے ہیں۔ مجرم، بھتہ خور، ٹارگٹ کلر، مافیا مختلف شکلوں میں معاشرے کے سامنے ہیں۔ بھتہ خوروں کو سیاسی پشت پناہی حاصل ہے مجرم سرکاری سرپرستی میں کام کرتے ہیں۔ سرکاری مشینری ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر ہے۔ مظلوم بے طرح پس رہے ہیں۔

شوکت صدیقی کی کہانی میں جو کراچی کا حصہ ہے اس میں زیادہ تر ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو صرف اور صرف روپیہ کمانا چاہتے ہیں چاہے اس کے لیے اُنھیں معصوموں کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں ان کے لیے اپنا مفاد سب سے بڑھ کر ہے۔ معاشرے کی بے حسی کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔ کراچی جو بہت سارے لوگوں کے لیے ایک سہانا مستقبل ہے۔ راجا اور نوشا کے لیے بھیانک حال اور ناقابل بیان مستقبل نظر آتا ہے۔

دونوں بورسٹل جیل پہنچ جاتے ہیں جہاں سے اُن کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ خدا کی بستی کا مطالعہ بذات خود بہت سے چشم کشا حقائق سامنے لاتا ہے۔ ناول کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں بہت سے خوش کن خیال آتے ہیں اور اس کا جی چاہتا ہے کہ کہانی اس کی مرضی کا موڑ لے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے ۔زندگی کی حقیقتیں بہت تلخ ہیں حالات خواہشات کے تابع نہیں ہوتے۔ کراچی میں اکثر خواب چکنا چور ہوتے ہیں۔ زندگی کے کچھ ایسے رخ دکھاتی ہے جو کہ بدصورت ہوتے ہیں انسان انھیں اپنی مرضی کے مطابق ترتیب نہیں دے سکتا۔

شوکت صدیقی صاحب سے بذات خود جب یہ سوال کیا گیا تو اُن کا جواب تھا۔

سوال: آپ کے ناول کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بدی کی قوتیں، نیکی، حسن اور صداقت کی اقدار پر غالب آتی جارہی ہیں جس کے نتیجے میں ناول کا قاری حزن، مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہوجاتا ہے۔ کیا یہ تاثر درست ہے؟

شوکت صدیقی: یہ مسئلہ اس وقت میرے سامنے شدت سے اٹھا جب اس ناول کو ٹی وی پر پیش کیا گیا۔ ٹی وی کے ارباب اقتدار نے تو اس سلسلے میں مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا لیکن ناظرین کی جانب سے خطوط اور ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا۔ مطالبہ تھا کہ سلطانہ کی ماں کو نہ مارا جائے

اور فرزند علی کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ میں نے کہا ہمارا مزاج میلوڈراما کا مزاج ہے۔ ڈراما کی بنیاد تضاد پر قائم ہے اور ناول کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ میلوڈراما کا اختتام عموماً خوش کن ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا ہے مجرم اور ظالم لوگ ہمیشہ اس دنیا میں سزا نہیں پاتے اور نہ ہی ان کا انجام دردناک ہوتا ہے۔ ظالم ظلم کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ حقیقت نگاری کا تقاضا تھا کہ معاشرے میں جو کچھ اور جس طرح ہو رہا ہے میں اسے ویسے ہی بیان کروں۔ آپ نے دیکھا ناول میں صداقت کی قوتیں حاوی نہیں ہوتیں۔ طاقتور قوتیں وہی ٹھہریں جو بدی کی قوتیں تھیں۔ خان بہادر فرزند علی پہ ترقی، خوشحالی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ پس ماندہ و مظلوم لوگ جدوجہد کے باوجود مواقع حاصل نہ ہونے پر تباہ ہو گئے۔ یہ معروضی حقیقتیں ہیں جن کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ معروضی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دن ہے تو دن ہے ہم اسے اپنی خواہشات سے نہیں بدل سکتے میں نے خواہشات کے بجائے حقائق کا اظہار کیا۔ ۷

اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زندگی کے تلخ حقائق بسا اوقات دل دہلا دینے والے ہوتے ہیں اُن کو ہو بہو پیش کرنا زندگی سے آنکھیں چار کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں راجا اور نوشا جیسے کم سن اور مظلوم نہ جانے کتنے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے ہتھے چڑھ کر اپنی اور لوگوں کی زندگیاں تباہ کر رہے ہیں حالات کا جبر انھیں جس راستے پر لگا گیا وہ راستہ انھوں نے خود نہیں چنا تھا لیکن اب وہ اسی راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں اور تاریک راہوں کے مسافر بن چکے ہیں۔

ناول کے اگلے حصے میں یہ دونوں کردار جب جیل سے سال کی قید کاٹ کر نکلتے ہیں تو زندگی کی تلخیوں میں مزید اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ جیل کے ماحول سے وہ جرائم کی دلدل میں مزید دھنس چکے ہوتے ہیں۔

جیل میں راجا اور نوشا کے ساتھ اور بھی بہت سارے بچے تھے جو اسی طرح مختلف چھوٹے موٹے جرائم میں جیل کاٹ رہے تھے، ان معصوم اذہان پر جرم کی پہلی چھینٹ پڑی تھی توجہ سے یہ معاشرے کے کارآمد فرد بن سکتے تھے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ جیل عام طور پر چھوٹے مجرم کو بڑا مجرم بنا کر معاشرے کے حوالے کر دیتی ہیں ایسا ہی ہوا۔

کہانی آگے بڑھتی ہے اور ان خستہ تنوں کی جان پر مزید زخم لگتے ہیں۔ جیل کا ماحول راجا اور نوشا

دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ راجا تو ابتدائی دنوں میں ہی پوکر نامی لڑکے سے لڑائی کے بعد شدید زخمی ہوکر ہسپتال پہنچ گیا اور نوشا پوکر نامی لڑکے کے ساتھ رہ کر عادی مجرموں جیسے ہتھکنڈے سیکھنے لگا۔

شوکت صدیقی نے جرائم پیشہ لوگوں کی ایسی درست عکاسی کی ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

نوشا کے متعلق لکھتے ہیں۔

> جیل میں نوشا نے اور تو کچھ نہیں سیکھا البتہ پوکر کی صحبت میں رہ کر اس کو لڑنے بھڑنے اور چاقو چلانے کی تکنیک معلوم ہوگئی۔ اب وہ ایسے موقعوں کے تمام ہتھکنڈے جان گیا تھا اور آئے دن کسی نہ کسی بات پر لڑکوں سے جھگڑتا رہتا۔ اس میں پہلے جو جھجک اور خوف تھا جاتا رہا اب وہ بالکل نڈر ہوکر لڑتا تھا۔ اس کے علاوہ پوکر بہت اچھا جیب کترا تھا۔ اس فن کے تمام گُر اُس نے نوشا کو بتا دیئے۔ بورسٹل جیل میں بڑی تعداد ایسے لڑکوں کی تھی جو جرائم پیشہ تھے ان میں افلاطون بھی تھا جو تالے توڑنے کا ماہر تھا اور اس فن کو بڑی فیاضی سے سکھاتا تھا۔ نوشا بھی کچھ عرصہ اس کا شاگرد رہا۔ اور کسی حد تک یہ فن سیکھ بھی گیا۔ ۸

زندگی کی تلخ حقیقتیں اور خدا کی بستی

طبقاتی کش مکش، معاشرتی ناہمواری، زندگی کی تلخیاں راجا اور نوشا جیسے بچوں کو جیل جیسے سکول میں دھکیل رہی ہیں۔ جیل جو معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا اکٹھ ہوتا ہے۔ جنھیں معاشرہ خود سے دور کر کے کال کوٹھری میں بند کر دیتا ہے اس اُمید پر کہ زندگی ان کے جیل جانے سے خوش و خرم ہو جائے گی لیکن یہ وقتی فتح ہوتی ہے۔ آخری قہقہہ اکثر بدی ہی لگاتی ہے۔

شوکت صدیقی اس سچائی سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے کہیں بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو خوش نما پردوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

کراچی کی زندگی جو ایک طرف امیروں، صاحب حیثیت لوگوں کے لیے سراسر جدا اور مختلف ہے تو دوسری طرف جھگیوں، جھونپڑیوں، کچی آبادی کے رہنے والوں کے لیے بالکل جدا ہے۔ کراچی محض چمکتی روشنیوں، رنگارنگ رنگینیوں، میلوں ٹھیلوں، بڑے بڑے شاپنگ پلازا اور آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ پہلو بہ پہلو تنگ و تاریک گلیوں، بنیادی سہولتوں سے عاری آبادیوں، گندگی اور تعفن کے ڈھیروں پر بسنے والے بے بضاعت لوگوں کا بھی شہر ہے جن کے لیے "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

انہی لوگوں میں شوکت صدیقی کے کردار ہیں ان کے نام مختلف ہوسکتے ہیں۔ حلیے جدا ہوسکتے ہیں شہر، علاقہ کوئی دوسرا ہوسکتا ہے لیکن یہ کردار موجود ہیں کوئی ان کی موجودگی سے انکار نہیں کرسکتا۔ کراچی کے ٹارگٹ کلر، بھتہ خور، اغواء برائے تاوان کے مجرم، بینک لوٹنے والے یہ سب آسمان سے نہیں ٹپکے یہ اسی دھرتی کے سپوت ہیں جن کو جیل میں بند کرکے معاشرے نے سوچا کہ باقی شہری محفوظ ہوگئے۔ جب کہ ایسا نہیں ہوا یہ سب شوکت صدیقی کے ناول کے چھپنے سے بعد کی باتیں ہیں، لیکن ناول کے مصنف کی نگاہِ دوربیں سے انکار نہیں کرسکتے جو معاشرے کی تہہ میں چھپے ناسوروں کو وقت سے پہلے نہ صرف دیکھ لیتا ہے بلکہ اپنے قلم سے اپنے پڑھنے والے کو بھی مطلع کرتا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

کہ مصداق وقت کی یہ پرورش بظاہر نظر نہیں آتی لیکن کہیں نہ کہیں گھڑی کی سوئیاں وقت کے گزرنے کا احساس دلاتی رہتی ہے اور پھر وہ آتش فشاں جو زیرِ زمین پکتا رہتا ہے اچانک ایک دھماکے سے پھٹ جاتا ہے اور لاوا چاروں اور بہہ نکلتا ہے۔

نوشا جیل سے رہا ہونے کے بعد پوکر کے ہمراہ اس کے استاد پیڈرو کے پاس پہنچتا ہے جو ایک ماہر جیب کترا ہے اور جیب کتروں کا ایک پورا گینگ چلا رہا ہے۔

نوشا کو شاہ جی کے بعد دوسرے جرائم پیشہ گروہ کا سہارا ملتا ہے۔ جہاں اس کی مجرمانہ سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ رہنے سے اُس میں بھی اُن جیسی صفات پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ کہانی کا یہ بڑا جان دار حصہ ہے یہاں پہ شوکت صدیقی کی اپنے موضوع پر ماہرانہ گرفت نظر آتی ہے۔ کراچی کے یہ جرائم پیشہ لوگ کیسے جرم کرتے، اپنا شکار تاڑتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں یہ سب بہت خوبی سے بیان ہوا ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں کا یہ اشتراک عمل کچھ یوں ہے کہ ان لوگوں نے اپنے علاقے بانٹ رکھے ہیں جیسے درندوں نے جنگل میں اپنے علاقے مخصوص کیے ہوتے ہیں اور یہ حد بندی کا اس حد تک خیال کرتے ہیں کہ اپنے قیمتی سے قیمتی کارندے کی قربانی دے دیتے ہیں لیکن اپنے اصول سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

آج کے کراچی کو بھی غور سے دیکھا جائے تو ہر گروہ کا اپنا اپنا علاقہ ہے جہاں دوسرے جاتے ہوئے

خوف محسوس کرتے ہیں لوگوں نے اپنی جدا بستیاں بسا رکھی ہیں۔ آگے چل کر کراچی کی لغت میں "جونو گوایریاز" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اس کی جڑیں بھی بہت قدیمی اور پرانی ہیں جن پر شوکت صدیقی کی نگاہ تھی۔

پٹھان، مہاجر، بلوچ (لیاری) علاقے اس کی زندہ مثالیں ہیں یہاں پر دوسرے علاقے کے لوگوں کا آنا جانا منع ہے۔ مہاجرین کے علاقے باقاعدہ چیک پوسٹوں اور بیریئر سے پہچانے جاتے ہیں۔ کٹی پہاڑی کے ایک طرف پٹھان اور دوسری طرف مہاجر، غرض کراچی کی موجودہ صورتحال اچانک پیدا نہیں ہوئی بلکہ تقسیم پاکستان کے بعد یہ صورت بننی شروع ہوگئی تھی جس کا عملی ظہور دو تین دہائیوں بعد ہوا۔

نوشا، پوکر اور استاد پیڈرو کے ساتھ رہ کر جیب کتری کے مزید گُر سیکھتا ہے یہیں اس کی ملاقات پروفیسر صاحب سے ہوتی ہے اور استاد پیڈرو جب اُسے اپنے گروہ سے نکالتا ہے تو وہ پروفیسر کے ہاں پناہ لیتا ہے لیکن پروفیسر صاحب بھی اُسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ نوشا کی ملاقات راجا سے ہوتی ہے جس کی ٹانگ کٹ چکی ہے اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کر رہا ہے۔

غرض ناول کے اس حصے میں نوشا کی بدنصیبی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی قدم قدم پر مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوتے ہیں۔ کراچی جو غریبوں کی ماں کہلاتی ہے ان دونوں کے لیے سوتیلی ماں بن جاتی ہے راجا کے زخم ناسور بن گئے ہیں۔ نوشا کو نہ جرائم پیشہ لوگ قبول کرتے ہیں نہ ہی اُس کو کوئی شریف لوگ قبول کرنے کو تیار ہیں۔ دھتکارے ہوئے لڑکے کراچی کی گلیوں، چوراہوں میں بے آسرا پڑے ہیں۔

استاد پیڈرو کے ہاں سے نکالے جانے کا عمل کیسے وقوع پذیر ہوا یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں۔ نوشا نے اپنے علاقے سے باہر ایک شخص کی جیب کاٹی تو اس علاقے کے غنڈے نے استاد پیڈرو سے شکایت کی اور رقم برآمد ہونے پر نوشا کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا پھر گروہ سے نکال دیا گیا۔

شوکت صدیقی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> "اوئے تو استاد اللہ رکھا کے علاقے میں کیوں گیا تھا؟ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ بولٹن مارکیٹ کے اس پار کا علاقہ اپنا نہیں پر تم سالو اپنی ماں کے یار ہو۔ ابے تو اپنی باندگی دکھانے کھارادر کیوں گیا تھا؟"[۹]

آگے چل کر نوشا جب جھوٹ بولتا ہے اور اس کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو استاد پیڈرو اس پر تشدد کرنے کے بعد سے اس سے کیا کہتا ہے۔

نوشا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھر کر منہ پہ آگئے تھے۔ وہ منہ بسور کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا تھا مگر استاد پیڈرو اس کی حالت زار سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ مڑ کر چکرم کر اشارہ کیا۔ سالے کو تھوڑا سا زندہ طلسمات پلا کر چلتا کر۔ چکرم کمرے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ قارورے کی شیشی لیے کمرے میں داخل ہوا اس میں زرد زرد پیشاب بھرا تھا شیشی دیکھتے ہی نوشا دہائی دینے لگا۔ استاد اللہ کے لیے چھوڑ دو مر جاؤں گا۔ اب غلطی کروں تو جان سے مار دینا۔ وہ گڑگڑاتا رہا۔ فریاد کرتا رہا مگر ایک نہ سنی گئی۔ استاد پیڈرو کی ہدایت پر ایک جیب کترا نوشا کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دبوچ لیا۔ دوسرے نے اس کا منہ چیر دیا چکرم نے قارورے کے کئی قطرے اس کے حلق میں ڈال دیئے۔[10]

استاد پیڈرو کی دیدہ دلیری کا کیا عالم ہے؟

نوشا اُسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ استاد نے ڈانٹا۔ سالے! آنکھیں کیا دکھا رہا ہے۔ جا کر تھانے میں رپٹ لکھا دیجیو کہ استاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلا رہا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو پر یہ بھی سن لے کہ دو ہزار نقد بھتا دیتا ہوں۔ سالے کسی اور ہوا میں نہ رہنا تو یہ سمجھ رہا ہو کہ میں استاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔[11]

ان اقتباسات میں وضاحت کے ساتھ ان جرائم پیشہ لوگوں کی آپس میں ملی بھگت، اشتراک عمل اور جرم کے لیے معاونت نہ صرف نظر آتی ہے بلکہ ایک دوسرے کے لیے دلی احترام کا جذبہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے اور دوسرے کے علاقے میں جانے سے گریز کرتے ہیں اور جو ان کی اس بات کو نہ مانے اُس کا حال نوشا جیسا ہوتا ہے۔

قانون نافذ کرنے والے ادارے ان کے پشت پناہ ہیں۔ یہ اُن کو ہر مہینے بھتے کی رقم دیتے ہیں اور وہ ان کا مفادات کا خیال کرتے ہیں۔

گویا یہ ایک ایسی تکون ہے جس کا ہر زاویہ ایک دوسرے سے باہم پیوست ہو کر اس کی مضبوطی کو بڑھا رہا ہے۔ یہاں پر نوشا جیسے لوگ صرف ایک کردار ہیں ان کی عملی اہمیت سرے سے نہیں۔

کہانی میں نوشا کراچی کی گلیوں، عثمان آباد، صدر اور ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے کبھی ریلوے اسٹیشن پر رات

بسر ہورہی ہے کبھی کہیں تھک ہار کر پروفیسر کلیم کے پاس پہنچا تو انھوں نے شروع میں تو رہنے کو جگہ دی لیکن جب انھوں نے اس کا میل جول اپنی بیٹی نادرہ سے بڑھتا دیکھا تو نوشا کو گھر سے نکال دیا۔

بقول اُن کے تم معاشرے کا انتقام مجھ سے نہ لو۔ نوشا کی داستان غم ابھی ختم نہیں ہوئی۔ نوشا دل برداشتہ ہوکر گھر جانے کی سوچتا ہے تو راجا سے ملنے آتا ہے وہاں یہ دونوں دوست مل کر زمانے کی ناسازگاری پر جی بھر کر روتے ہیں۔ ان دولڑکوں نے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح آنکھوں میں خواب سجا کر کراچی کا رخ کیا تھا لیکن کراچی نے ان کے ارمانوں کا خون کردیا معاشرے نے ان کو قبول کرنے سے انکار کردیا در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد یہ لڑکے ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو پڑتے ہیں۔ یہ آنسو ہمارے پورے معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہیں۔ نوشا، راجا ان جیسے کتنے لڑکے اپنی جوانی میں ارمانوں، امنگوں کے زمانے میں لوگوں کی مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے کراچی جیسے بڑے شہر میں ان کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔

یہاں پر بہت زیادہ جذباتی منظر دیکھنے کو ملتا ہے راجا اور نوشا کے جدا ہونے کا منظر راجا بلک بلک کر روتا ہے اور نوشا کو رکنے کے لیے کہتا ہے۔ تو وہ سفر جو راجا، نوشا اور شامی نے ایک حسین مستقبل کے لیے اکٹھے شروع کیا شامی کے واپس جانے کے بعد راجا اور نوشا نے اکٹھے گزارا۔ اس سفر میں ناکامیاں ہیں نامرادیاں ہیں اگر کہیں تھوڑے دن اچھے اور خوشیوں بھرے ہیں تو ان کا انجام بے حد دردناک اور دل دہلا دینے والا ہے اور سفر کا اختتام اس حال میں ہوتا ہے کہ دونوں بلک بلک کر رو رہے ہوتے ہیں۔

کراچی کی گلیاں، چوراہے، عمارتیں، باغات، لوگ سب کے سب اُن سے ناطہ توڑ چکے ہیں اس جدائی کے عمل کو شوکت صدیقی نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> آخر جب نوشا اُٹھ کر جانے لگا تو راجا نے عاجزی سے کہا۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے تڑپ کا نوشا کا ہاتھ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ اس پہ اپنا منہ رکھ کر بولا۔ نوشے! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے اللہ میرا کوئی نہیں رہا۔ وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ نوشا کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر راجا کے چہرے پہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ دونوں کچھ دیر اسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں ابھرتی رہیں۔[۱۲]

نوشا کے جانے کے بعد راجا کے رونے اور کھانسنے کی آواز مسلسل قاری کو بے چین رکھتی ہے۔

نوشا اپنے شہر شامی سے ملتا ہے تو اس کو اپنے گھر پر آنے والی مصیبت کا احوال پتا چلتا ہے کہ کیسے نیاز نے اُس کا گھر برباد کر دیا تھا۔ نوشا سیدھا نیاز کی کوٹھی پہنچتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے۔ سلطانہ کے روکنے کے باوجود پولیس اسٹیشن جا کر گرفتاری دیتا ہے۔ سلطانہ اور فلک پیما تنظیم کی مدد سے نوشا کا مقدمہ ذرا بہتر طریقے سے آگے بڑھتا ہے اور نوشا پھانسی کے پھندے سے بچ کہ چودہ سال قید بامشقت کی سزا پاتا ہے۔

جب اس کو سزا سنائی جاتی ہے تو نوشا کی چیخیں، اس کی پکار پورے معاشرے کو دہلا دینے کے لیے کافی ہیں شوکت صدیقی لکھتے ہیں۔

> نوشا کو ملزموں کے کٹہرے سے نکالا گیا اور جن ہاتھوں کو قلم کی ضرورت تھی ان میں ہتھ کڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتھ کڑیاں پہن کر نوشا پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ مجھے پھانسی دے دو۔ مجھے گولی مار دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ خدا کے لیے مجھے پھانسی دے دو۔ جج صاحب! اللہ کے لیے مجھے پھانسی دے دو۔ نوشا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترا بن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لیے جیل گیا تھا۔ اب اسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔[۱۳]

وہ کہانی جو کراچی کے ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے سے شروع ہوئی تھی۔ کراچی کے گلی کوچوں، عثمان آباد، عامل کالونی، ڈرگ روڈ، کالا پل، گزری کلفٹن، صدر، بولٹن مارکیٹ، ایمپریس مارکیٹ سے ہوتی ہوئی آخر کار راجا کی معذوری اور نوشا کی قید بامشقت پر ختم ہوئی۔ کراچی کے گلی کوچوں سے جو مجرم برآمد ہو رہے ہیں اُس میں معاشرہ برابر کا شریک ہے۔ دھتکارے ہوئے بے آسرا بچے اپنی محرومیوں، نارسائیوں کا بدلہ معاشرے سے ضرور لیتے ہیں اس عمل میں اُن کا بھی نقصان ہوتا ہے اور معاشرے کا بھی۔ کراچی میں ہزار ہا بچے حکومتی توجہ، نگہداشت اور ہمدردی کے مستحق ہیں ان کو نظر انداز کرنا شہر کے مستقبل کو مخدوش بنانا ہوگا۔

خدا کی بستی ایسے ہی ناپسندیدہ بچوں کی کہانی ہے۔

خدا کی بستی اور کراچی کی اپر کلاس

شوکت صدیقی نے جہاں ایک طرف کراچی کے بے کس و ناچار لوگوں کی کتھا بیان کی ہے وہیں اُن

کے قلم نے کراچی کی اپر کلاس کی بھی بڑی دلنشین تصویر کشی کی ہے۔اپر کلاس جو بنیادی سہولتوں کے حصول سے آزاد ہے جن کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں جن کے بچے مہنگے سکولوں میں پڑھتے ہیں اور جو پوش علاقوں میں رہتے اور شام کو پارٹیاں کرتے ہیں ان لوگوں کے مسائل کیا ہیں؟ کیا ان کی زندگیاں خوشیوں سے بھری ہوئی ہیں؟ کیا یہ چین و آرام کی نیند سو سکتے ہیں؟ ان جیسے اور سوالوں کے جواب شوکت صدیقی نے اپنے قلم سے فراہم کیے ہیں۔

سلمان جو اپنی گھریلو اور گرہستن بیوی کے ساتھ کراچی پہنچتا ہے اور اونچی سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کی لگن میں مبتلا ہوتا ہے۔اس کی زندگی کراچی میں کیسے گزرتی ہے؟ یہ کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ عبرت آموز بھی ہے۔

سلمان کی بیوی جو میٹرک پاس اور ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہے۔کراچی پہنچنے کے بعد جب پاس پڑوس کی عورتوں کو دیکھتی ہے تو اُس کے رنگ ڈھنگ بھی تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ زیورات، لباس ، فیشن نمود و نمائش جن سے وہ بے گانہ ہوتی ہے آہستہ آہستہ اس کی زندگی میں شامل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ معصومیت کی جگہ ہوشیاری اور سادگی کی جگہ عیاری لے لیتی ہے۔اپنے خاوند کو سب کچھ سمجھنے والی لڑکی کیسے اپنے خاوند کی آنکھوں میں دھول جھونکنا شروع کرتی ہے یہ سب چشم کشا واقعات ہیں۔

کراچی کی اپر کلاس کی زندگی کیسے اُس کے رنگ ڈھنک ہی بدل دیتی ہے۔سلمان کی بیوی رخشندہ جو گھریلو سی عورت ہے کراچی پہنچنے پر جب اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتی ہے تو کچھ یہ ماحول اس کو نظر آتا ہے۔شوکت صدیقی اس ماحول کو بیان کرتے ہو کہتے ہیں۔

> بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی بیشتر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بینکوں اور تجارتی اداروں میں سیکریٹری، ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پہ خرچ کرتیں۔وہ اکثر سلمان کے فلیٹ میں بھی آتیں۔ان کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ان کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا۔جسم کی حرکت مصنوعی تھی۔وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے

کسی نئے اسکینڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خان کے تازہ ترین معاشقے کے بارے میں بھی
بات کرلیتیں اور ان کے تذکرے میں خاص لذت محسوس کرتیں۔[۱۴]

یہ طبقہ ماڈرن تھا اور الٹرا ماڈرن بننے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری تھی رخشندہ بھی ان کی دیکھا دیکھی اس کشتی میں سوار ہوگی۔

سلمان کو اس کی عادات میں واضح تبدیلی نظر آنے لگی، شاپنگ کرنا، بال نئے رنگ ڈھنگ سے بنانا، میک اپ کرنا، سجنا سنورنا شروع کردیا۔ سلمان کو یہ چیزیں بھلی معلوم ہوئیں اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

الٹرا ماڈرن طبقے کے رنگ ڈھنگ پارٹیاں کرنا، سینما جانا، پکنک کرنا، ساحل سمندر پر غسل آفتابی کرنا، مرد وزن کا اختلاط یہ سب آہستہ آہستہ رخشندہ اور سلمان پر اپنا سحر پھونک رہا تھا۔

ایسا سحر جس کے سننے والے ایک سدھائے ہوئے معمول کی طرح تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ سلمان بھی اسی رو میں بہتا جارہا تھا۔ شراب نوشی اور ناچ گانا، ہلا گلا اس کی زندگی کا بھی خاصہ بنتا جارہا تھا۔ مصنوعی زندگی جو بظاہر بڑی خوش نما اور خوب صورت تھی لیکن بباطن بدصورت اور بدنما تھی اسکا مطمع نظر بن گئی۔ یہ ایک ایسا خواب تھا جس کا انجام بہت دردناک تھا لیکن وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس کے دفتر کے لیے نئے سیکشن انچارج انیس احمد جعفری کی آمد ایک طوفان تھی جس میں سلمان کا سب کچھ بہہ گیا۔ انیس احمد جعفری سے راہ ورسم بڑھانا سلمان کے لیے زہر قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں یہ سب کچھ بہت خوش کن تھا۔ آفس کے لوگ اس کے توسط سے اپنے کام کرواتے کیونکہ سلمان کے جعفری کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔

جعفری نے اس کے گھر آنا جانا شروع کیا اور رخشندہ کے ساتھ میل جول بڑھتا گیا۔ جعفری رخشندہ کے ساتھ بے تکلف ہوتا چلا گیا اور سلمان سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کوششیں کیں لیکن ہمت کی کمی سے وہ ان دونوں کا ملنا ختم نہ کرسکا۔ کبھی نوکری کی مجبوری کبھی پیسوں کا خیال غرض وہ اس اندھے کنویں میں گرتا چلا گیا۔

اس کی اس کیفیت کا اظہار شوکت صدیقی نے کچھ یوں کیا ہے۔

ایک روز اس نے سنجیدگی سے طے کیا کہ جعفری کی آمدورفت بند کر دینا چاہیے۔ لیکن اس طرح جعفری کے ناراض ہونے کا خدشہ تھا اور جعفری کی ناراضی سے ملازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ لہٰذا ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر دوسری ملازمت تلاش کر لینا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے ملازمت کی تلاش میں دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ مگر کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اسے پانچ سو کے بجائے دوسو روپے کی بھی نوکری نہ ملی۔ چچیا سُسر نہیں رہا تھا جس کی سفارش اور اثر و رسوخ سے نئی ملازمت مل جاتی۔[۱۵]

معاشی مجبوری بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیتی ہے سلمان بھی ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں کی عملی تصویر بنا ہوا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے مصداق عملی اقدامات سے گریزاں سلمان سب کچھ دیکھ رہا تھا پر کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ کراچی جیسے بڑے شہر کی بڑی مجبوریاں ہیں۔ اپنے آپ کو اپر کلاس میں شامل کرانے کے لیے بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہین اور ان میں سب سے بڑی قربانی عزت و غیرت کی ہوتی ہے اور سلمان چاہتے نہ چاہتے اسی طرف بڑھ رہا تھا۔

بعض دفعہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے ساتھ سینما، پکنک پر جاتے دیکھ کر کچھ کہہ نہ پایا لیکن ایک دفعہ تو حد ہو گئی۔

جب اپنے دفتر کے ایک دوست عنایت کے ساتھ وہ مے نوشی کے لیے پہنچا تو وہاں یہ جعفری، رخشندہ اور ایک ادھیڑ عمر تنومند آدمی کو دیکھ کر سلمان حیران رہ گیا۔ اپنی بیوی رخشندہ کو شراب نوشی کرتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

عنایت نے جب اسے ان کی طرف متوجہ دیکھا تو کہنے لگا۔

اوہو ہو ہو! تم جعفری کو دیکھ رہے ہو۔ یار وہ آج کل اپنے پروموشن کے چکر میں لگا ہے۔ سلمان نے حیرت سے عنایت کی طرف دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ عنایت جھوم کر بولا۔ یار بڑی زوردار لونڈیا ایم۔ ڈی کو پیش کی ہے۔ دیکھو تو کیسے چمٹائے ہوئے چل رہا ہے۔ رات تو اس سالے کی گزرے گی۔ ہائے کیا غضب کا دانا ہے؟ اس نے رخشندہ کے گداز جسم کے بارے میں ایسی گندی بات کہی کہ سلمان تڑپ کر رہ گیا ایسا محسوس ہوا جیسے عنایت نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔[۱۶]

اور اگلے دن جعفری ان کے گھر اپنی پروموشن کی خبر دینے پہنچا تو کچھ یوں کہنے لگا۔

وہ گردن کو خم دے کر ایکٹروں کی طرح لمحہ بھر اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کسی قدر گردن جھکا کر کہا۔ آپ کا یہ خاکسار کمپنی کا برانچ منیجر مقرر ہو گیا ہے۔ دو ہزار تنخواہ ملے گی۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے ٹھاٹھ ہوں گے۔ کیوں ہے نا بہت بڑی خوشخبری؟ سلمان کا جی چاہا کہ وہ جعفری کے منہ پر تھوک دے۔ سالا بھڑوا! کس ڈھٹائی سے اپنا کارنامہ بیان کر رہا ہے۔ کم از کم رخشندہ کے سامنے تو اسے اپنی ترقی کا اس طرح اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ اس عہدے کی بلندی پر پہنچنے کا زینہ تو وہی بنی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے سلمان کو اچانک اپنا خیال آ گیا۔ اس نے محسوس کیا وہ جعفری سے بڑا بھڑوا ہے جس کی بیوی رات رات بھر دوسروں کے پہلو گرم کرتی ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ کتنی ذلت کی بات ہے۔ اسے ڈوب مرنا چاہیے۔ نفرت، حقارت، غم و غصے کے ملے جلے احساسات نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ گیا۔[۱۷]

یہی وہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ جس کے بعد سلمان نے اس گھناؤنے کھیل میں مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ان دونوں کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا لیکن آفس سے استعفیٰ اور رخشندہ کو طلاق دے کر وہ اس دلدل سے نکل آیا جس نے اسے گردن گردن دھنسا دیا تھا۔

سلمان نے اپر کلاس، سٹیٹس، مرتبے، رتبے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شوکت صدیقی نے اپر کلاس کی زندگی کو کھوکھلا اور مصنوعی پن بڑی چابک دستی سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

کراچی کی ہائی فائی زندگی بہت سے مراحل طے کر چکی ہے۔ آج اس کی بلندیاں ۱۹۵۷ء سے کہیں اوپر ہوں گی لیکن بنیاد کچی ہو تو عمارت کمزور اور ناپائیدار ہی رہتی ہے۔ یہ چکا چوند نظر کو خیرہ تو کرتی ہے لیکن اس کا باطن اس قدر کریہہ ہے کہ انسان گھن کھا جائے۔ یہ معاشرہ صرف ظاہر چمک دمک پہ قائم ہے اور مضبوطی اور پختگی اس میں نام کو نہیں۔

شوکت صدیقی نے کراچی کی زندگی کے دونوں پہلو قاری کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ایک طرف معصوم و مظلوم راجا، نوشا اور شامی ہیں تو دوسری طرف سلمان، جعفری، عنایت اور رخشندہ جیسے کردار ہیں۔ حالات کے

جبر کے سامنے دونوں کردار بے بس ہیں۔ راجا اور نوشا اگر ناکام و ناکامیاب ہیں تو خوشی، سکون، مسرت جعفری اور رخشندہ کے حصہ میں بھی نہیں آتی۔

خدا کی بستی میں فلک پیما تنظیم اور سکائی لارک کارکنان اور خان فرزند بہادر کا تفصیلی ذکر ہے ۔کہانی کا بڑا حصہ خان بہادر کی چالاکیوں اور عیاریوں کو بیان کرتا ہے لیکن اس کہانی کا لوکیل کراچی سے متعلق نہیں تھا تو قصداً اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

تحقیق کا اگلا ناول آگے سمندر ہے جو انتظار حسین صاحب نے تحریر کیا ہے۔

انتظار حسین آگے سمندر ہے

ہجرت پر لکھے گئے ادب میں انتظار حسین کا ایک خاص مقام ہے۔ان کے ناول چاند گہن، بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے سب ہی ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہجرت کے گرد گھومتے ہیں۔ ہجرت اور ناسٹیلجیا گویا دو متوازی خطوط ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ہجرت پر لکھے گئے سارے ادب میں یہ خطوط دیکھے جاسکتے ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں بھی ناسٹیلجیا نظر آتا ہے۔"یادِ ماضی" ماضی کی یاد اپنی نوع میں کوئی ایسی بری چیز بھی نہیں کہ اس کو مطعون کیا جائے۔ دنیا بھر میں اس کو موضوع بنا کر ادب تخلیق کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔

انتظار حسین کی طرح ہر ہجرت کرنے والا ادیب کسی خاص فضا کا زائیدہ ہوتا ہے جہاں اُس کا بچپن، جوانی گزری ہوتی ہے، جہاں کے موسم، پرندے، پھل، لوگ اس کی یادوں کا حصہ ہوتے ہیں۔انھیں وہ اپنے جسم و ذہن سے نکال نہیں سکتا اور جب ان کی یاد اُسے بے چین کرتی ہے تو اُس کا قلم ماضی کے بند دریچوں سے یادوں کے ذخیرے تلاشنے لگتا ہے۔ ماضی میں گم ہونا حال اور مستقبل سے لاتعلق ہونا معیوب ہے لیکن ماضی سے نئے جہان تخلیق کرنا تو گویا ایک مثبت تخلیقی فریضہ ہے۔

انتظار حسین سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کے ناولوں میں ہجرت کا پہلو ہجرت کے مسائل غالب ہیں تو انتظار حسین کہنے لگے۔

> ہجرت اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔کیا میں ہجرت کو بھول جاؤں؟ اگر ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو کیا میں ۱۹۴۷ء کو فراموش کر دوں؟ اگر میں اسے بھول گیا تو پاکستان میرے لیے بے معنی ہو جائے گا جس تاریخ کے پیٹ سے پاکستان پیدا ہوا ہے اس تاریخ کو لوگ کہتے ہیں

بھول جاؤ حالانکہ یہ تو ناجائز اولاد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔ ہجرت کے دو پہلو ہیں ایک ذہنی اور ایک جسمانی۔ [۱۸]

آگے سمندر ہے کراچی کے لوگوں اور خاص طور پر مہاجرین کے طور طریقوں، نئے شہر میں ان کی ذہنی ہم آہنگی، بود باش خود کو نئے شہر میں ضم کرنے کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ان لوگوں کی ہے جو ماضی کو یاد تو کرتے ہیں لیکن اب اُن کے ہاں اس سے گریز پائی نظر آتی ہے۔ جنت گم گشتہ کی یاد تو آتی ہے لیکن اس حقیقت کا ادراک بھی ہے کہ ماضی کے جزیرے مٹ چکے اب وہاں ایسا کچھ نہیں جو وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ مہاجرت نے ان سے وہ سب کچھ چھینا ہے تو بہت کچھ نیا ان کے حوالے بھی کیا۔ ان کی دلی، لکھنو، آگرہ، کان پور اب ویسا نہیں رہا وہ گلیاں اور چوبارے بدل چکے ہیں۔ رہنے والے لوگ ان کے انداز بدل چکے ہیں ماضی کے مزاروں کے درشن سکھ نہیں دکھ پہنچاتے ہیں۔

اس احساس کا اظہار بھی ناول میں جابجا نظر آتا ہے۔

سید مظہر جمیل اپنی کتاب آشوب سندھ اور اُردو فکشن میں آگے سمندر ہے کہ حوالے سے لکھتے ہیں۔

آگے سمند رہے، سندھ بالخصوص کراچی میں آباد مہاجروں کی صورت حال کی معروضیت کو سمجھنے کی پُر خلوص کوشش کہی جاسکتی ہے۔ ہر چند کے بعض ادبی حلقے اس ناول میں بھی لمحہ موجود کی تکلیف دہ حقیقتوں کے جواز کو اندلس، قرطبہ، اشبیلیہ، طلیطلہ کے کھنڈرات میں تلاش کرنے کے عمل کو اسی ناسٹلجیائی کیفیت کا اظہار سمجھتے ہیں جو انتظار حسین کے فکشن کی شناخت بن چکا ہے۔ لیکن اگر ہم اس طرز اظہار کو محض ان کا اسلوب نگارش سمجھ لیں اور مذکورہ ناول کو اس کے کرداروں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ناول کے بین السطور میں فراموش گار ماضی کی بازیافت پر اصرار سے کہیں زیادہ اس خیال کی توثیق ہوتی نظر آتی ہے کہ اب ماضی ایک گئی گزری داستان ہے۔ اب حال سے ماضی کا رشتہ کم و بیش منقطع ہو چکا ہے اور یوں کہ حال کی زندہ حقیقتوں سے ہم اپنے رشتے استوار کرنے میں ناکام رہے ہیں اس لیے خوف اور محض خوف ہی ہماری زندگی کا حاصل ٹھہرتا ہے۔ [۱۹]

انتظار حسین کے ناول آگے سمند رہے کی درست تفہیم کے لیے اس ناول میں موجود مہاجروں کی

زندگی کے مختلف گوشوں کو سامنے لانا بہت ضروری ہے۔ہجرت کے ایک بڑے عمل سے گزرنے کے بعد جو کہ اپنی نوع کا ایک دل دہلا دینے والا واقعہ تھا مہاجرین کو کراچی میں جھگیاں ملیں قطار اندر قطار۔انھوں نے ہار نہ مانی اپنی محنت اور ہمت سے ان جھگیوں کو مکانوں میں بدل کر دکھایا۔کراچی کی معیشت کو اپنی ہنر مندی سے سینچا اور جب حالات (معاشی) تھوڑے بہتر ہوئے تو کراچی کی سیاست نے ایسا پلٹا کھایا کہ شہر دنگے فساد کا مرکز بن گیا۔طلبہ تنظیموں سے شروع ہونے والی یہ لڑائی، مافیا وارز میں بدل گئی۔ بھتہ، ٹارگٹ کلنگ، قبضہ مافیا، اغواء برائے تاوان کے ساتھ ساتھ مہاجر اور حقیقی مہاجر کی جنگ بھی اس شہر نے جھیلی ہے۔آرمی کے آپریشن اسی شہر میں ہوئے۔کرفیو کا لگنا شہریوں کا گھروں میں محصور ہونا یہ سب وہ عوامل ہیں جنھوں نے کراچی کے شہریوں کو مفلوج کیا ہوا ہے۔ان سب کا احوال انتظار حسین کے ناول آگے سمند رہے میں ملتا ہے۔

غرض حالیہ کراچی جس سے سب واقف ہیں جو اپنی روشنیوں کے بجائے بوری بند لاشوں کی وجہ سے رسوا ہے۔جس کے مختلف علاقے دوسروں مکینوں کے لیے نوگو ایریاز ہیں جو خوف کے سائے میں پل رہا ہے اس کراچی کی منظر کشی آگے سمند رہے کے صفحوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہے انھی صفحات سے کراچی کی فضا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مہاجرین جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں

ہجرت اور ناسٹیلجیا گویا لازم وملزوم ہیں۔دنیا کے مختلف علاقوں سے ہجرت کرنے والے اپنی جنم بھومی کو نہیں بھولتے، اس کے بارے میں خوش کن خیالات پالتے رہتے ہیں۔اردو ادب میں ہجرت اور اس کے نتیجے میں یادِ ماضی کا بیان اکثر ادبا کے ہاں نظر آتا ہے۔قرۃ العین حیدر، مشتاق احمد یوسفی نے ہجرت اور ناسٹیلجیا کے ایسے جاندار مرقع کھینچے ہیں کہ تصویر بنا دی ہے۔مہاجر چاہے کوئی بھی ہو ان گلیوں، چوباروں کی یاد میں ہائے ہائے کرتا نظر آتا ہے۔جہاں اس کا بچپن گزرا ہے۔کچھ ایسا ہی پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ بھی ہوا۔جمی جمائی، بسی بسائی، لگی لگائی زندگی چھوڑ کر دیارِ غیر کا سفر آسان نہ تھا۔اس سفر میں جب کہیں رکنے ٹھہرنے، دم لینے کا مقام آیا مہاجرین نے اپنے ماضی کو تھام لیا اس کی یاد سے دل کو شاد کیا ایک آہ بھری اور اگلی منزل کی طرف چل نکلے۔یہ یادیں جو ان کا سرمایہ ہیں کوئی یہ یادیں دلی سے لایا کوئی امروہے سے کوئی کان پور سے کوئی علی گڑھ سے کوئی آگرے سے۔یادوں کی اس پوٹلی میں رنگا رنگ پھول ہیں، سوغاتوں کے پھول مسجدوں، مزاروں کے پھول، ندی، نالوں، دریاؤں کے پھول غرض ایک پورا گلستان ہے جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

مہاجر چونکہ کسی ایک مقام کے ہیں نہیں لہٰذا سارے اپنا اپنا راگ سنانا چاہتے ہیں اپنے علاقے کا تفوق اپنی زبان، تہذیب کا تفوق دکھانا چاہتے ہیں شاید اس طرح تلخی ایام سے چھٹکارا ملے ۔تھوڑی راحت حاصل ہو۔

مہاجرین کی رنگا رنگی کو انتظار حسین کس خوبی سے بیان کرتے ہیں۔

> کان دھر کر سنو، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ امر واقعہ سناتا ہوں۔ جواد میاں یہ شہر ست خصمی شہر ہے۔ سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر ۔۔۔یاروں نے شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے۔ رکے۔ پھر بولے اور مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑا ہی ہے۔ کوئی یورپ کا کوئی پچھم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا ۔سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور اس سمندر میں آ کر رل مل گئیں۔[۲۰]

اور اس پر بس نہیں بلکہ ہر ندی، نالہ اپنے آپ کو سمندر سمجھتا ہے۔ مہاجرین کے ہاں یہ رویہ کیوں پایا جاتا ہے کہ میں برتر ہوں یہ محض گفتگو میں خود کو برتر ثابت کرنا ہے یا اس کی تہہ میں احساس برتری ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے لیکن سندھ کے باسی اس بات کے شاکی ضرور رہے ہیں کہ مہاجرین اپنے آپ کو اپنی تہذیب، زبان، کلچر کو قدیم سندھیوں سے برتر اور فائق سمجھتے ہیں۔ سندھی جو شرمیلا، کم گو اور اپنی زبان کا شیدائی ہے اپنی دھرتی ماں سے بے حد محبت کرتا ہے اس کے ساتھ مہاجرین کا رویہ اپنی تہذیبی برتری کی وجہ سے نامناسب رہا ہے۔ آگے چل کر انتظار حسین لکھتے ہیں۔

> ہر ندی کہتی ہے کہ میں سمندر ہوں۔ جواد میاں، میں نے ان ندیوں میں اچھی خاصی شناوری کی ہے۔ مثلاً میں کچھ دن امروہے والوں کے بیچ بہت گھوما پھرا۔ ایسا لگتا تھا کہ کراچی بس امروہے والوں سے پٹا پڑا ہے۔ جیسے کراچی نہ ہو امروہہ ہی ہو۔ بدائیوں والوں کی سنو! اپنے مرزا ہادی بدایونی اچھے بزرگ ہیں۔ مگر ہیں تو بدایونی، ایک دفعہ دماغ میں سمائی کہ کراچی کے سارے شعرا سے تو عہدہ برا ہونا تو ناممکنات میں سے ہے۔ اپنے بدائیوں کے شاعروں کو جمع کر کے ایک مختصر سا مشاعرہ کیے لیتے ہیں مگر جناب اکیلے لیاقت آباد سے اتنے شاعر برآمد ہو گئے کہ قطاریں لگ گئیں۔ پھر دوسرے محلوں سے فون آنے لگے کہ اے صاحب! بندہ بھی بدایونی ہے بھولیے گا نہیں۔ مرزا ہادی علی بوکھلا گئے ۔ایسے بھوکھلائے کہ مشاعرے کی بساط ہی

لپیٹ دی۔[۲۱]

گویا کراچی نہ ہوا ہندوستان کا کوئی شہر ہو اور بعض اوقات تو انتہا ہی مضحکہ خیز صورتحال پیدا ہوئی جب کسی گم نام سے قصبے کے رہنے والے نے بڑہانکی کہ اس کے شہر کی مثال تو پورے ہندوستا ن میں نہیں ہے۔دراصل یہ اسی جنت گم گشتہ کی تلاش ہے جوان سے بچھڑ گئی ہے انھیں قصور وار سمجھنا درست نہیں جس کرب سے یہ لوگ گزرے اس کا اندازہ عام لوگ نہیں کر سکتے ان کی زندگی کے شب و روز جب بھی تلخ ہوئے ہیں تو غریب الوطنی کے احساس نے انگڑائی لی اور یہ لگے اپنے لکھنو، دلی، کانپور، آگرہ، علی گڑھ کو یاد کرنے۔

بعض دفعہ تو صورتحال خاصی دلچسپ ہوجاتی ہے جیسے کوئی مقابلہ شروع ہوجاتا ہے بالکل ان دو بچوں کی طرح جو اپنے دادا جان کی شان بڑھاتے بڑھاتے زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگ جاتے ہیں۔اس کی تہہ میں بھی ارضی محبت کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی بڑائی کا پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ایسے ہی ایک دلچسپ واقعہ کا احوال کچھ یوں ہے۔

> توصیف ہنسا اچھا اچھا۔مجو بھائی، بات یہ تھی کہ قبلہ سید صاحب! اپنے لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کے شعر سناتے چلے جارہے تھے میں نے سوچا کہ میں بھی اپنے میرٹھ کے کسی شاعر کی بانگی دکھاؤں۔تو مین نے بوم ہاپوڑی کے دو تین چمکتے ہوئے سے شعر سنا دیئے۔موصوف کی تیوری پہ بل پڑ گے۔حالانکہ میں نے حضرت صفی لکھنوی کے شعر پورے صبر و تحمل سے سنے تھے۔مجو بھائی نے ماتھا پیٹ لیا۔ بوم ہاپوڑی کے شعر اور اس شائستہ مزاج لکھنوی بزرگ کے سامنے تمہیں اپنے میرٹھ کا اور کوئی شاعر نہیں جڑا ارے بیان یزدانی کے ہی شعر سنا دیے ہوتے۔بیان یزدانی۔مجو بھائی کیسی بات کررہے ہیں آپ۔بیان یزدانی کو تو میں اس وقت میدان میں اُتاروں گا جب وہ اپنے آتش و مصحفی کا قصیدہ پڑھیں گے۔[۲۲]

اسی کیفیت کے کئی شیڈ ہیں جو مختلف مواقعوں پر سامنے آتے ہیں۔بات صرف شعرا تک محدود نہیں ہے۔ ہر مہاجر کے علاقے، گلی کی سوغاتیں، بازار، لوگ سب نہ صرف منفرد اور جدا ہیں بلکہ ان کی ٹکر کا اب پورے ہندوستان میں کوئی نہیں۔انھی صفحات میں بدائیوں کے پیڑے، ڈبائی کی گجیا، میرٹھ کے کباب پراٹھے سب کا تذکرہ ملتا ہے۔غرض ایک پوری تہذیب ہے جس کا راج سنگھاسن ڈول رہا ہے اور ہر مہاجر اس کو بچانے کے لیے طرح طرح کی کوششیں کررہا ہے۔ہلکان ہے قصیدے سنا رہا ہے بظاہر ہنس رہا ہے لیکن دل خون کے

آنسو رو رہا ہے کہ وہ سب کچھ کہاں چلا گیا؟ کدھر چلا گیا؟ کیوں چلا گیا؟

ماضی کی یاد سے آگے سمند رہے کے صفحات سیاہ ہیں کچھ تذکرے مشتِ از خروارے کے مصداق پیش کیے۔ اب اس خوف کا تذکرہ جو ایک آسیب کی طرح اس شہر پر مسلط کر دیا گیا ہے۔

کراچی کے باشندے اور خوف

کراچی کے سیاسی اُفق پر ہلچل تو قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی جب ۱۹۴۸ء میں کراچی کو دارالحکومت بنایا گیا تو اُس ہلچل کی ابتدا ہوئی جو رفتہ رفتہ آگے بڑھتی رہی کراچی یونیورسٹی میں جماعت اسلامی اور بائیں بازو کی جماعتوں کے درمیان جاری رسہ کشی بڑھتے بڑھتے قتل و غارت گری تک جا پہنچی۔ اس عمل کے دوران جنرل ضیاء کی مذہب کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنے کی مذموم حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

مہاجروں کے حقوق کے لیے اے پی ایم ایس او (APMSO) اور بعد ازاں مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کی آمد سے حالات مزید کشیدہ ہوئے۔

مہاجر پٹھان جھگڑا بشریٰ زیدی کا قتل گویا جہنم کا دروازہ کھلنے کی ابتدا تھی پھر مہاجر اور حقیقی مہاجر کی لڑائی فوجی آپریشن غرض تباہی کے تمام اجزاء یکجا ہوئے اور کراچی جہنم زار بن گیا۔ انتظار حسین کے ناول آگے سمند رہے میں اس خوف کا بھرپور اظہار ہے جو کراچی والوں کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا ہے یہ لوگ کیسے زندگی گزارتے ہیں کرفیو کے دن رات کیسے کاٹتے ہیں؟ کتنی لاشیں اُٹھاتے ہیں اس سب کا تفصیلی احوال جابجا نظر آتا ہے۔

کراچی کے باسیوں کی زندگی کی تفصیل ان کے دکھ، سکھ، غم، شادی اس ناول کے صفحات میں جابجا نظر آتے ہیں۔ کراچی پر قبضے کی یہ جنگ سیاسی کرداروں نے شروع کی لیکن افغان مہاجرین کی آمد کے بعد یہ جنگ اُن کے ہاتھوں سے سرکنے لگی اور اس کا انجام کراچی کے باسیوں نے اس وقت دیکھا جب جہادی مکتبہ فکر اور طالبان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے ۲۰۱۳ء کے الیکشن میں بائیں بازو کی جماعتوں کو باہر نکل کر انتخابی مہم چلانے سے بھی روک دیا۔ عوامی نیشنل پارٹی (ANP)، متحدہ قومی موومنٹ (MQM)، پیپلز پارٹی (PPP) جیسی بڑی تنظیمیں خوف کے مارے چھپتی پھرتی تھیں۔ اب دوبارہ حالات ذرا سے بہتر ہیں لیکن کب تک ہیں اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں کوئی بھی نہیں ہے۔

شہریوں نے یہ عذاب اپنی جانوں پر جھیلے ہیں۔ جنازے اُٹھائے ہیں معصوم بچوں، بوڑھوں، عورتوں

اور جوانوں کے اور جن دنوں حقیقی اور ایم کیو ایم کی لڑائی زوروں پر تھی وہ دن بھی کسی عذاب سے کم نہ تھے۔ کم سن بچوں کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ، خودکار رائفلیں، پستول تھما دیئے گئے پھر جوان کے ہتھے چڑھا اُسے بھون کر رکھ دیا۔ کتنے ہی لوگ کراچی چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا بسے جو بچ گئے وہ صولت مرزا کی طرح بھری جوانی جیل میں گزار کر پھانسی کے پھندے پر جھول گئے لیکن شہر کی کم نصیبی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نہ جانے کتنے جوانوں کا لہو درکار ہے اس دھرتی کو۔

اس مسلسل خوف میں شہریوں نے ایک عجیب طرح کی زندگی بسائی ہوئی ہے سب کچھ دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں یہ بہادری ہے یا بے حسی یا کچھ اور اس کا جواب نہیں ملتا جنازوں پہ جنازے اٹھتے ہیں۔ شہری اگلوں کو قبروں میں اُتار کر آتے ہیں تو نئے جنازے تیار ہوتے ہیں۔ اس بے پناہ خوف کی ابتدا کیسے ہوئی؟ انتظار حسین لکھتے ہیں۔

> اس طور زندگی گزر رہی تھی کہ اس میں خلل پیدا ہونا شروع ہوا اور ہوتا ہی چلا گیا۔ میرا مطلب یہ پورے شہر کی زندگی میں وہ جو اس شہر میں ایک امی جمی تھی وہ اچانک ہی غائب ہوگئی۔ ڈاکے ،اغواء، قتل کی وارداتیں، بم دھماکے، اچانک نقاب پوش نمودار ہوتے، بھرے بازار میں گولیاں چلاتے، ایک یہاں گرا پڑا ہے، دوسرا وہاں تڑپ رہا ہے۔ گرم جسم دیکھتے دیکھتے ٹھنڈے پڑ جاتے۔ بازار میں بھگدڑ مچ جاتی۔ پھر سناٹا اور پھر اچانک ٹائر جلنا شروع ہوجاتے۔ ٹائروں کے جلتے جلتے کوئی بس زد میں آجاتی اور منٹوں میں جل کر خاکستر ہوجاتی۔ دکانیں کھلتے کھلتے پھر بند ہوجاتیں اور کرفیو لگ جاتا۔ کرفیو آج یہاں کل وہاں۔[۲۳]

سیاسی معاملات بگڑے تو بگڑتے ہی چلے گئے۔ اولاً سندھی مہاجر چپقلش، مہاجر برتری کے احساس سے شروع ہوئی پھر ردِعمل میں ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے سندھی زبان کو لازمی کرنا اور کوٹہ سسٹم کے نفاذ سے حالات مزید خراب ہوئے اور جنرل ضیاء کا دور تو جیسے کراچی کی بنیادیں ہلا گیا۔ خودکار اسلحہ کی بھرمار نے شہر کو اسلحہ ڈپو بنا کر رکھ دیا اس کے بعد مہاجر قوم کے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد نے تو گویا سارے بند توڑ دیے۔ یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں مہاجر، پٹھان قضیہ ہو یا مہاجر، مہاجر کی لڑائی سب کا مطمع نظر صرف اور صرف ایک ہے کسی طور پر شہر کا قبضہ حاصل کیا جائے اس قبضے کے حصول کی جنگ میں کوئی اصول، ضابطہ، قاعدہ، قانون ماننے کو تیار نہیں۔

ایسی صورتحال میں زندگی کیونکر اور کیسے گزر سکتی ہے؟شہرِ ناپرسان کے باسیوں کے لیے یہ شہر جو ماں جیسا تھا۔اب بھڑکتے شعلوں میں تبدیل ہو رہا تھا ایک خوف کا سایہ تھا جو سارے شہر پہ تان دیا گیا تھا۔

قتل و غارتگری سے گلی کوچے رنگین ہو رہے تھے۔ناول کے کردار مجید الحسینی المعروف مجو میاں اور جواد دونوں حیران و پریشان سب کچھ دیکھ رہے تھے۔مجو میاں پورے شہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے چاہے ادبی سرگرمیاں ہوں یا معاشرتی، شادی بیاہ کے معاملات ہوں یا غم کے سب میں حصہ لے رہے ہیں اور اپنے ساتھ جواد کو بھی بھگائے بھگائے پھرتے ہیں۔حالات جب ایک دفعہ بگڑے تو پھر بگڑتے ہی چلے گئے۔شہر کا شہر سناٹے کی زد میں آ گیا۔گولیاں چلتی، لوگ مرتے، ٹائر جلتے، بسوں سے دھواں اٹھتا اور کرفیو لگ جاتا۔گویا ایک فلم تھی جو بار بار ری وائنڈ ہو رہی تھی فرق صرف یہ تھا کہ مرنے والے کردار نئے ہوتے باقی تفاصیل پرانی ہوتیں اور جب یہ سب کچھ ہونے کے بعد شہر کے اس علاقے پر کرفیو نافذ کیا جاتا تو شہر جیسے چپ ہو جاتا خاموش اتنا خاموش کہ سانس لینے کی آواز بھی سنائی نہ دیتی۔اسی طرح ایک دفعہ حالات خراب ہونے کے بعد لگنے والے کرفیو کی رات کا سناٹا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اندھیرے کے ساتھ سناٹے کا رنگ اور ہوتا ہے مگر یہاں کھمبے اپنی روشنیوں کے ساتھ سب اپنی اپنی جگہ سلامت تھے سڑک پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔مگر کسی وجود کا دور دور پتہ نہیں تھا۔یا اللہ اس راہ پہ امنڈی ہوئی خلقت دم کے دم میں کسی کھوہ میں جا چھپی، بھگدڑ، دھکم پیل، دھوں دھاں، ہائے وائے سب غائب، نہ کوئی نعرہ نہ کوئی چیخ، نہ بند ہوتے دروازوں اور گرتے شٹروں کا شور بجلی کی روشنی میں خالی اور خاموش سڑک۔[۲۴]

ایک جیتے جاگتے، ہنستے مسکراتے شہر کا یہ احوال پڑھ کر دل ہول کھاتا ہے کہ کس قدر بے دردی سے شہر کی روشنیاں چھین لی گئیں اقتدار کا کھیل کتنا بھیانک اور بے رحم ہوتا ہے کراچی کا شہر اس کی عملی مثال ہے۔اقتدار کے حصول کے لیے پورے شہر کو قتل گاہ بنا دیا گیا اور کسی چہرے پر ندامت کی رمق بھی نظر نہیں آتی۔

جب شہر کے ایسے حالات ہوں تو کون زندہ رہے گا کون زندہ بچے گا جب یہی سوال مجید الحسینی کے سامنے رکھا گیا تو بولے۔

> بچنے کا معاملہ تو جواد میاں یہ ہے کہ قسمت والا ہی بچے گا اور اپنی کوشش اور احتیاط سے نہیں بچے گا جو مر رہے ہیں الل ٹپ مر رہے ہیں۔جو بچے گا اللہ تو کل بچے گا۔اور یار مرنے جینے کی

ویسی بھی کونسی منطق ہوتی ہے اور ہم لوگ تو یہی ایک مہمل زندگی گزار رہے ہیں۔[۲۵]

ایسی دہشتناک فضا میں سانس لینے والے ذہنی مریض بنتے جاتے ہیں بچے اور عورتیں خاص طور پر ان کے حواس اس قدر دہشت برداشت کرنے سے عاری ہیں۔ مسلسل خوف کی فضا میں زندگی گزارنا اس قدر آسان نہیں اعصاب چیخ جاتے ہیں ان چیختے ہوئے اعصاب کے ساتھ جو لوگ زندہ ہیں وہ مسلسل کرب کی کیفیت میں ہیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ان کو ایک خوف نے گھیرا ہوا ہے۔ اب انھیں محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف گہرا دکھ ہے اس دکھ کے زیر اثر ساری دنیا رو رہی ہے پرند، شجر، اشجار ہر شے ماتم کناں ہے۔

ایک موقع پر ایک کردار رفیق صاحب جو مجو بھائی کے جاننے والے ہیں جو اد کو بتاتے ہیں کہ ہمیں خطرات کا احساس ہے لیکن اگر زیادہ خوف زدہ نظر آئیں تو ان کی بیوی جو بہت ڈری ہوتیں ہیں خوف سے ڈھیر ہو جائے گی تو ان کا بہادر بننا یا بہادری کی اداکاری کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ان کے محلے میں سیاسی تنظیم نے عقوبت خانہ کھول رکھا تھا جہاں لوگوں کو اذیتیں دیتے تو لوگوں نے چیخیں سنیں اب ڈر کے مارے کون بولے سب چپ ایسے عالم میں جب ان کی بیوی ان سے کہتی ہے۔

> اجی کیا سو گئے ہو۔ سن رہے ہو۔ میں سوتے سے جاگ اٹھا۔ کیوں کیا بات ہے؟ کسی کی چیخوں کی آواز آ رہی۔ میں دیر تک کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ بیگم تمہارا وہم تھا۔ اے لو، میرا وہم تھا۔ ایسی تو چیخ کی آواز آئی تھی۔ پھر ایک رات کیا ہوا۔ سوتے سوتے اٹھ بیٹھی بولی کہ سن رہے ہو میں نے کہا کیا ہوا۔ بولی بلی رو رہی ہے۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں نے کہا اے لو، کچھ ہوا ہی نہیں۔ بلی کا رونا کوئی اچھی بات ہے۔[۲۶]

آگے چل کر ایک جملہ سامنے آتا ہے جو گویا سارے ناول میں پھیلے خوف کو بیان کر دیتا ہے۔

> "مرنا تو یہاں کا معمول ہے۔ زندہ بچے رہنا البتہ معجزہ ہے"[۲۷]

کراچی کے شہریوں کے خوف کو اس جملے کے بعد مزید نہیں بیان کیا جا سکتا۔ اب دیکھتے ہیں کہ شہری اس شہر میں زندہ کس طرح ہیں اور کس طور اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہے ہیں۔ اس ماحول میں جو سیاسی دھڑوں اور حکومتوں کی کش مکش کی وجہ سے عذاب ناک بنا ہوا ہے شہری کیسے زندہ ہیں اب اس سوال کا جواب تلاشتے ہیں۔

انسان ایک سخت جان مخلوق ہے اس نے عالمی جنگوں کی ہلاکت خیزی اور ہیروشیما اور ناگا ساکی کے ملبے سے نئی زندگی تعمیر کی۔ کراچی کے شہری بھی ایسے ہی سخت جان ہیں جو بکھرتی زندگی کو ریزہ ریزہ جمع کر کے نیا کرتے ہیں بکھرنے پر پھر اس زندگی کو جوڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

شہرِ کراچی کی زندگی۔

"زندہ بچے رہنا البتہ معجزہ ہے" ماحصل اس جملے کا یہ ہے کہ شہر میں زندگی گزارنے کے لیے جھوٹی سچی کوئی تسلی کوئی خودنمائی کی بات تو ہو جس کے سہارے بندہ زندگی کے دن کاٹ سکے شاید کراچی کی زندگی کے لیے یہ بات از بس ضروری ہے۔ انتظار حسین بھی اس رمز کو پا گئے تھے۔

یہ ٹکڑا جواد اور مجید الحسینی کی گفتگو کے درمیان آتا ہے جب مجید الحسینی جواد کو اپنے ساتھ کراچی کے مختلف لوگوں سے ملاتے ہیں تو جواد کو ان سے ملنے کے بعد احساس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں کی شخصیت میں کچھ مختلف سا ہے اس کا تذکرہ وہ مجو میاں سے کچھ یوں کرتے ہیں۔

> مجو بھائی، چائے پیتے پیتے مجھے عجیب سا خیال آیا۔ یہ جو تمھارے لوگ ہیں۔ تمھارے ساتھ میں بھی ان سے مل جل رہا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں، پہلے تو نہ مجھے ان سے ملنے کی کبھی تمنا ہوئی تھی نہ تم نے مجھے اس راہ پہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اب جو تم مجھے لیے لیے پھرتے ہو تو اس میں کوئی حکمت ہوگی۔ خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ۔۔۔، جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کیا کہے؟۔ وہی بات کہو گے کہ یہ ویسے نظر نہیں آتے۔ یار باتوں کو دہرایا مت کرو اس سے مجھے لگتا ہے تم واقعی بوڑھے ہو گئے ہو۔ شاید دہرا ہی رہا ہوں۔ یار مجھے لگتا ہے جیسے ان کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ مجو بھائی ہنسے، کوئی چیز کی بات کرتے ہو استاد یہ تو پورے کے پورے گم ہو گئے ہیں۔ ان کی تو کایا کلپ ہو چکی۔ اب یہ نخالص کراچی والے ہیں۔ اور یہ جو ہمارا لکھنو ہمارا دلی کرتے رہتے ہیں۔ سب فراڈ ہے مگر خیر انھیں معاف کر دو۔ یہ فراڈ ان کی مجبوری ہے۔ مجبوری کیوں ہے؟ اس لیے کہ کراچی میں رہنے کے لیے آدمی کو کوئی نہ کوئی فراڈ کرنا پڑتا ہے۔[۲۸]

اس اقتباس کا آخری جملہ اپنے اندر معنی کا جہاں رکھتا ہے۔ کراچی شہر جو ۱۹۵۰ء اور ۱۹۴۷ء سے قبل ہندو اکثریت کا شہر تھا جہاں پر مسلمان اقلیت میں تھے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد ہندوؤں کی آبادی کل آبادی کا صرف ۲ فیصد رہ گئی۔ گویا شہر جو اپنی جڑوں سے مضبوطی سے جڑا ہوا تھا اچانک دھڑام سے نیچے آن گرا۔ اب اس شہر کے

مکانات نئے سرے سے بن رہے تھے۔ نئے لوگ اک نئی تہذیب کو جنم دے رہے تھے۔ جو لوگ جا رہے تھے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہے تھے اور جو آ رہے تھے وہ بے سروسامان تھے۔ سب کچھ نئے سرے سے تخلیق ہو رہا تھا اس عمل میں بڑے بڑوں کی ہوا اکھڑی ہوئی تھی اور زندہ رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ نئے شہر میں نئی بستی بسانا آسان نہ تھا۔ ہر شخص کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ کسی بیساکھی کی جس کے سہارے وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔ شہریوں نے اپنی اپنی بیساکھی تراش لی تھی جس کے سہارے وہ زندہ تھے۔

انھی بیساکھیوں میں سے ایک بیساکھی لکھنو، دلی، کانپور، آگرے کا حوالہ بھی تھا جو وہ وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ انتظار حسین نے اُسے فراڈ کا نام دیا ہے۔

اور یہ فراڈ کسی اور کو نہیں خود اپنے آپ کو دے رہے تھے۔ زندگی بعض اوقات صرف حقیقت کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی اس کے لیے کوئی اُمید، کوئی دلاسا کوئی آسرا چاہیے بودا ہی کیوں نہ ہو ضروری ہو جاتا ہے۔ کراچی والوں نے یہ آسرا ڈھونڈ لیا تھا۔ شاید یہ باتیں کرتے ہوئے اُن کو اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس بھی ہوتا ہو لیکن پانی کی تلاش میں پھرتا مسافر سراب کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے اپنی پیاس بھول جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال زندگی کی تلاش میں کراچی والوں کا تھا۔

مجو بھائی جو اس ناول کے مرکزی کردار ہیں پرکار کا وہ نکتہ ہیں جس کے گرد پورا دائرہ گھوم رہا ہے۔ مجو بھائی چھوٹے چھوٹے جملوں میں زندگی کا فلسفہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ کراچی کی زندگی کے متعلق ان کا ایک زبردست جملہ جو وہ کئی مرتبہ دہراتے ہیں۔

> "مجھے اس شخص نے پریشان کر رکھا ہے۔ ہر پھر کر وہی ایک سوال مجو بھائی اس شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ رفیق صاحب نے ایک قہقہہ لگایا، خوب مگر یہ بھی تو پتہ چلنا چاہیے آپ نے کیا جواب دیا؟ میرے پاس تو ایک ہی جواب ہے کہ پیارے سوچنا چھوڑ دو، یا پھر یہ شہر چھوڑ دو۔"[۲۹]

بظاہر تو یہ ہنسی مذاق میں دیا گیا ایک سوال کا جواب ہے جس کو یار لوگ سنجیدگی سے لینا پسند نہیں کریں گے۔ لیکن بسا اوقات ہمارے مزاح بھرے جملے ہماری زندگیوں کی چھپی ہوئی سچائی کو طشت از بام کر دیتے ہیں۔ ہم جو بات سنجیدگی سے کہنے کی ہمت نہیں کرتے اس کے لیے مزاح کا سہارا لیتے ہیں تاکہ بات بیان بھی ہو جائے اور بھرم بھی رہ جائے یہاں بھی کچھ ایسا ہی پیرایہ نظر آتا ہے۔ جس میں ابدی حقیقت شوگر کوٹڈ کر کے پیش کی گئی ہو۔

یہ جملہ دراصل اجتماعی بے حسی کو بیان کردیتا ہے۔ کیوں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں صرف اس وقت سلائی جاتی ہیں جب ان کے استعمال کے ذریعے بھی نہ مسئلے کی سنگینی کم ہوسکتی ہے، نہ مسئلے کا من پسند حل نکالا جاسکتا ہے۔ کراچی کے باسی بھی۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہوگئیں

کے مصداق اب سمجھوتا کرنا سیکھ گئے ہیں۔ مقابلے میں جان و مال کا ضیاع ہو تو سمجھداری بھڑ جانے کے بجائے گردن ڈال دینے میں ہے اور سمجھدار لوگ ایسے موقعوں پر ایسے ہی کرتے ہیں۔ ناول کے کردار رفیق صاحب بھی اپنی بیوی کو یہی باتیں سمجھاتے اور اپنے لٹنے کا واقعہ بڑے مزے سے سناتے ہیں کہنے لگے۔

ابھی پچھلے ہی مہینے کی تو بات ہے۔ دو مشٹنڈے آن نازل ہوئے۔ ہماری بیگم صاحبہ تو حواس باختہ ہوگیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں چابیاں دے دو۔ چابیاں اُن کے حوالے کیں اور فوراً ہی میں نے اپنا پرس جیب سے نکال کر اُن کو پکڑا دیا۔ پرس انھوں نے لینے کو تو لے لیا۔ مگر پھر دوسرے نے جو ٹولی کا سرغنہ لگتا تھا پوچھا۔ ٹیکسی کا کرایہ جیب میں ہے۔ میں نے کہا برادر عزیز، کوئی بات نہیں ہم پیدل چلے جائیں گے۔ وہ بولا، نہیں پیدل کیسے جاؤ گے اور پرس لینے والوں کو ہدایت کی۔ جوان ان کے حساب میں سے پچاس روپے انھیں دے دو تو اس جوان نے پرس سے ایک پچاس روپے کا نوٹ نکال کر پھرتی سے مجھے پکڑا دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ ہم نے شرافت برتی تھی انھوں نے بھی شرافت برتی، پچاس روپے دے دیئے کہ ہم پیدل چلنے کی زحمت سے بچ جائیں۔ ان میں سے بھی دس بچ گئے۔ ۳۰

یہ پیراگراف بلاتبصرہ ہے۔ زندگی بہت قیمتی ہے اس کو مادی چیزوں کے پیمانے میں نہیں ناپا جاسکتا۔ اس لیے کراچی کے شہری برضا و رغبت لٹ رہے ہیں اور دس روپوں کے بچ جانے پر اپنے راہزن کو دعا دیتے ہیں گویا بقول غالب

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

کراچی، اہل زبان اور مشاعرے

برصغیر پاک و ہند میں معاشروں کا چلن بڑا قدیمی ہے۔اردو زبان کو اپنے شاعروں پر اور شاعروں کو غزل پر بڑا ناز ہے۔اہل زبان کے ہاں غزل سننا، سنانا تو گویا لازم وملزوم اور خاصہ حیات ہیں۔کراچی میں بھی اہل زبان کی ایک کثیر تعداد ہجرت کے بعد پہنچی۔کراچی نے ہر شعبہ زندگی میں نامی گرامی لوگ پیدا کیے ہیں لیکن شعرا کی تو خصوصی طور پر بڑی تعداد کراچی سے تعلق رکھتی ہے۔

جون ایلیا، رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی اور دلاور فگار ایسے بے شمار نام ہیں۔جو اس فہرست میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مشاعرے نہ صرف یہ کراچی بلکہ ہندوستان کی تہذیبی شناخت کا منفرد حوالہ ہیں۔کراچی اس سلسلے میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔انتظار حسین، کے ناول آگے سمندر ہے کے مرکزی کردار مجید الحسینی کو جو مصروفیت سب سے زیادہ مرغوب تھی وہ مشاعروں میں شرکت ہی تھی۔اسی بہانے لوگوں سے میل ملاقات اور حالات سے آگاہی بھی ہوتی رہتی۔گوکہ انتظار حسین نے مشاعرے کے شعر ناول میں پیش نہیں کیے لیکن مشاعروں کا تذکرہ ان کے اس ناول میں جا بجا ملتا۔

رفیق صاحب مجو بھائی سے ایک درخواست کرتے۔

> یار مجو بھائی، ایک کام میں ہماری مدد کرو، آپ بھانت بھانت کے مہاجر کو جانتے ہیں۔آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔ بھائی ایسا کیا کام ہے؟ ویسے خدمت کے لیے بندہ حاضر ہے۔
> میں ایک خاص موضوع پر تحقیق کررہا ہوں۔ بہت انوکھا موضوع ہے۔آپ سنیں گے تو بندے کو داد دیں گے۔عنوان کچھ اس قسم کا سوچا ہے۔
>
> شاعری اور ہجرت، کیسا عنوان ہے۔
>
> خوب عنوان ہے آگے چلو۔
>
> اب مجھے دو ایسے مہاجروں کی تلاش ہے جو اہل زبان ہوں مگر شاعر نہ ہوں۔اماں باؤلے ہوئے ہو، مجو بھائی نے جواب دیا۔ ناممکنات کو ممکن ثابت کرنے پر تلے ہو اچھا چلیے میں اپنی شرط نرم کیے دیتا ہوں۔دو ایسے مہاجر جو بے شک شاعر ہوں مگر غزل گو نہ ہوں۔[۳۱]

اسی طرح کی ایک دلچسپ صورتحال کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے جب صرف بدایوں کے شعرا کا مشاعرہ کرنے کی کوشش کی گئی تو ہر کونے کھدرے سے بدائیوں کے شاعر برآمد ہونا شروع ہو گئے اور آخر کار مشاعرے کو ختم کرنا پڑا۔

ناول میں ایک جگہ ایسی صورتحال بھی پیش آتی ہے۔ جب شاعر سامع ڈھونڈ رہا ہوتا ہے اور سامع نہ ملنے پر اس کے گھر جا کر اپنی غزل اس کی نذر کرتا ہے۔

یہ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن پوری بات قاری تک پہنچانے کے لیے یہ طوالت برداشت کی۔

> رفیق صاحب ہنسے اور بولے، ویسے یہ دوسری آگ جس کا نام شعرائے کرام ہے زیادہ ظالم ہے۔ مجو بھائی، آپ یقین کیجیے، کسی کل چین نہیں لینے دیتے۔ مشاعرے کو طرح دے بھی جاؤں تو پھر آتے جاتے گھیرتے ہیں، جان ضیق میں ہے، محلّہ میں جس پر جو نئی غزل وارد ہوتی ہے اس کا وبال مجھ پہ پڑتا ہے اور میری مجبوری دیکھیے کہ یہ غزل کے ہر شعر پر داد دینی پڑتی ہے۔۔۔ مجو بھائی میں واقعی نرغے میں ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ ہماری اس گلی میں کتنے شاعر ہیں۔ بس سمجھ لو کہ آپ جن دکانوں سے گزرے ہیں ان میں سے ہر دکاندار اور ہر اسکا گاہک شاعر ہے اور آمد کا اتنا زور ہے کہ سودا تولتے تولتے غزل ہو جاتی ہے۔ میں چھپ کر گلی سے نکلتا ہوں۔ پھر بھی گلی سے نکلتے نکلتے دس بارہ غزلیں زہر مار کر لیتا ہوں۔ ادھر گھر سے قدم باہر نکالا ادھر کسی شاعر نے آن دبوچا۔ اس کے چنگل سے نکلے تو کسی اگلے نے آن گھیرا۔ بس جیسے تاک میں بیٹھے ہوں۔ مگر باہر نکلنا کیا ضروری ہے۔ تمھیں کونسا نوکری پر جانا ہوتا ہے۔ یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ گھر پر آن دھمکتے ہیں، رفیق بھائی، کئی دنوں سے آپ کے دیدار نہیں ہوئے، دشمنوں کی طبعیت تو ناساز نہیں ہے۔ اور اس کے فوراً بعد نئی غزل کا مژدہ۔ مجو بھائی قطار لگ جاتی ہے۔ کوئی نگینوی، کوئی پیلی بھیتی، کوئی کسمنڈوی، کوئی خورجوی، کس کس نگر کا شاعر اس کوچے میں جمع ہے سب ہی کو سننا پڑتا ہے محلّہ داری کا معاملہ جو ہوا۔[۳۲]

کراچی کی خواتین

مشاعرے، شاعری اور شعرا کرام کے تذکروں کے بعد کراچی کی خواتین کا تذکرہ جو مردوں کے شانہ بشانہ اس شہر آسیب میں زندگی گزار رہی ہیں۔ مہاجرین ہندوستان کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

زمینداری اور جاگیرداری سے نابلد اُن کے پاس زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے تعلیم کے علاوہ کوئی ہنر نہ تھا۔ ان کی خواتین بھی پڑھی لکھی اور باشعور تھیں۔ انھوں نے کراچی آنے کے بعد ماتم وگریہ پر ہی زور نہیں رکھا۔ بلکہ زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنے کی ذمہ داری بھی اپنی بساط کے مطابق نبھائی۔ مردوں کے ساتھ کام کاج گھریلو ذمہ داریاں بچوں کی پرورش سب کچھ کر کے دکھایا۔

ان کے بھی اپنے دکھ تھے جو کہ بھوگتی رہیں کہیں بہو کے ہاتھوں، کہیں بیٹے کے ہاتھوں لیکن ہار نہیں مانی ۔ انتظار حسین نے ان کی زبان کے خاص مرقع کھینچے ہیں جہاں یہ عورتیں اپنی مخصوص زبان میں خوب صورت گفتگو کرتی دکھائی گئی ہیں۔

ان خواتین میں بشو بھابی، اچھن بی، باجی اختری، سیدانی چچی ہیں۔ ان کے ہاں بھی ناسٹیلجیا، ماضی سے شدت کے ساتھ محبت، علاقے کی یاد اور پرانے محلے، گلی، کوچوں کا تذکرہ تو ہے لیکن نئی زندگی نے نئی مصیبتوں کے دروازے بھی کھول دیے ہیں۔

کوئی بہو کے ہاتھ پریشان ہے، کوئی بھائی کے رشتے کے لیے مناسب لڑکی نہ ملنے پر متفکر تو کوئی میاں کے ساتھ ان بن کے قصے سناتی ہے۔ غرض ناول کا یہ حصہ کلی طور پر خواتین کی کہانی بیان کرتا ہے ان کی زبان میں ان کے دکھوں، غموں کا احوال قاری کو اُسی ماحول میں لے جاتا ہے یہ خواتین کراچی میں آ کر اپنے اجڑے نگر کو بھولی نہیں ہیں لیکن کراچی میں رچ بس جانے کے جتن میں بھی مصروف ہیں۔ کراچی کی حالت زار پر کڑھتی بھی ہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر بشو بھابی جب کراچی میں چوری ڈکیتی کی وارداتوں کا احوال سنتی ہیں تو کچھ یوں گویا ہوتی ہیں۔

> بشو بھابی کے لیے یہ بیان گویا تچی تھا۔ پھر شروع ہوگئیں۔ اجی تم دن دیہاڑے لٹنے کی بات کررہے ہو یہاں دن دیہاڑے جوان آدمی اُٹھا لیے جارہے ہیں اور کوئی سانس ڈکار تک نہیں لیتا۔ ہمارے لکھنو میں تو ہمارے ہوش میں بس ایک دفعہ واردات ہوئی تھی کہ ہبوڑے سنسان دوپہری گلی میں کھیلتے ایک بچے کو اٹھا لے گئے تھے۔ اس پر سارے لکھنو میں تراہ تراہ پڑ گئی تھی۔ وہ تو پھر بچہ تھا اور اسے زبردستی تھوڑا ہی اٹھایا تھا ان جنم جلوں کے پاس ایک شیشہ ہوت تھا۔ جس بچے کو دکھاتے وہ خود ہی ان کے ساتھ چل پڑتا۔ اب تو یہ قہر ٹوٹا ہے کہ لاٹھ جیسا آدمی، اسے پکڑ دھکڑ کے موٹر میں ڈالا اور اُڑنچھو ہوگئے۔ ۳۳

اس بیان میں بھی ناسٹیلجیائی ، دھیمی دھیمی آگ صاف نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود جینا مرنا اب کراچی کے ساتھ ہے۔ اس کے گلی کوچے دھول سے اٹے ہوئے ہیں ۔لوگوں کی زندگیاں فسادات نے اجیرن کر رکھی ہیں لیکن سچ پوچھیے تو دل اسی کراچی کے لیے دھڑکتا نظر آتا ہے۔

کراچی اور مستقبل اک اُمید

کراچی شہر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کراچی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں اس شہر نے کبھی ہار نہیں مانی۔ اس شہر کی سرشت میں گرنا، اٹھنا پھر سے چل پڑنا شامل ہے۔ اس شہر کو برباد کرنے کے لیے اپنوں بے گانوں نے بڑا زور لگایا۔ ضیاء دور کے جہادی جنھوں نے اس کو اسلحے سے بھر دیا یا اس کے سپوت مہاجر جنھوں نے ایک دوسرے کی گردن مارنے میں کبھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا یا پھر پٹھان اور بلوچ جن کے علاقوں سے کوئی دوسرا شخص گزر تک نہیں سکتا۔

جلتے ٹائر، بسوں سے اٹھتا دھواں ، خون کے چھینٹے جس شہر کی پہچان ہیں جس شہر سے زندہ واپس آنا ایک معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ شہر آئندہ کیسا ہوگا؟

انتظار حسین اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ اس کو ہنستا بستا مسکراتا دیکھ رہے ہیں ۔ اس کے باسیوں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ شہر کے بچے جب بستے اُٹھائے سکول کی طرف رواں دواں ہیں بچے جو کسی بھی قوم کا مستقبل ہیں ان کو دیکھ کر ایک سرشاری کی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے اور وہ اس سرشاری کی کیفیت میں لکھتے ہیں۔

> سکول جانے والے بچے، کالج جانے والی لڑکیاں، دفتر جانے والے بابو لوگ، رنگ رنگ کی مخلوق مختلف گلیوں سے نکل کر امنڈ رہی تھی۔ کوئی بس اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں، کوئی رکشہ کا منتظر اور ہاں سکول کے بچے ، بچیاں اور لڑکیاں اپنی اپنی درسگاہ کی وین کی منتظر تھیں۔ اپنی اپنی سکول اور کالج کی پوشاکوں میں کتنی خوش اور شاداب نظر آ رہی تھیں تو اب صبح اپنے عروج پر تھی اور میں حیران بھی اور خوش بھی کہ ایسے خراب زمانے میں اتنی خوش گوار اتنی شاد آباد صبح، جیسے شہر کو کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی بھلے دنوں کا جیتا جاگتا شہر اور اس کی جیتی جاگتی صبحیں، تو گویا اس شہر کی صبحیں ابھی تک زندہ و سلامت تھیں۔۔۔ بچے گلے میں بیگ ڈالے اپنے اپنے سکول کے لیے رواں دواں نظر آتے ہیں کتنے پیدل باقی ٹولیاں، بسوں، ویگنوں، رکشاؤں

میں لندی پھندی پھر تو اس شہر کی بحالی صحت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یا شاید جیسے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر کر، لمبی اذیت سے نکل کر یہاں خوش کھڑا ہوں، یہ شہر بھی اپنی اذیت کے دن گزار کر اب شفا پا چکا ہے۔ خیر اگر ایسا نہ بھی ہو، میں نے سوچا اتنا تو طے ہے کہ اس کی صبحوں کی پاکیزگی پر ابھی کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ یہ نیک فال ہے۔ ایک شہر کی جب تک صبحیں سلامت ہیں اس کی سلامتی کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ دن اور رات کے باقی پہر کسی حال میں ہوں صبح کے پہر کو بچا کر رکھنا چاہیے۔ خوش گوار صبح کسی ڈوبتے ہوئے شہر کا آخری سہارا ہوتی ہے۔[۳۴]

چاکی واڑہ میں وصال ابن انشاء اور فیض احمد فیض کی نظر میں

کراچی کے علاقے چاکی واڑہ پر لکھے گئے اس ناول کو بہت پذیرائی ملی۔ اردو ادب کے نامی گرامی لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ یہ ناول شروع تا آخر کراچی اور پھر کراچی کے بھی صرف خاص علاقے یعنی چاکی واڑہ، لی مارکیٹ چاکی واڑے کی گلیوں اور چاکی واڑہ کے لوگوں کے گرد گھومتا ہے۔ ناول کیا ہے ایک منفرد قسم کی الف لیلوی کہانی ہے۔ جو بہت سراہی گئی ہے۔ ناول کے کردار لوکیل، کہانی سب منفرد اور اچھوتی ہے۔

ابن انشاء چاکی واڑہ میں وصال کے بارے میں لکھتے ہیں۔

یہ کتاب جو ہمارے سامنے ہے، ایک ناول ہے، لیکن عجیب ناول ہے۔ نام ہے اس کا چاکی واڑہ میں وصال اور مصنف ہیں محمد خالد اختر، چاکی اوڑہ کراچی کی ایک مشہور بستی ہے۔ ہم جیسے ظاہر بینوں کو لی مارکیٹ کے نواحات ہیں سوائے گندگی، بے ترتیبی، لکڑی کے ٹالوں، ریڑھیوں، ٹرام لائین کی گڑگڑاہٹ اور مجمع بازوں کے شور کے کچھ دکھائی یا سنائی نہ دے گا۔ لیکن خالد اختر نے اس کو رومانوی کی بستی بنا ڈالا ہے۔ رومانوی سے یہاں مطلب وہ سستے رومان نہیں جو ہمارے تیسرے درجے کے ناولوں اور فلموں کا موضوع ہوتے ہیں بلکہ ان میں ایڈونچر کا جزو بھی ہے اور جس کی مثال رابرٹ لوئی اسٹیونس کی نیو ارسیین نائٹس ہے۔ خالد کی یہ کتاب الف لیلہ ہے جس کا بغداد ہے چاکی واڑے کا محلہ۔ عربی الف لیلہ نے جس مٹی سے ہارون الرشید اور اور وزیر جعفر کے پتلے تیار کیے ہیں۔ اسٹیونس نے اسی سے بوہیمیا کے شہزاد

پاکستانی اُردو ناول میں کراچی کی معاشرتی زندگی

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار:

شہزاد قیصر

رجسٹریشن نمبر: 105-FLL/MSURDU/S-13

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

ے فلوزیل اور اس کے جانثار کرنل کے پیکر تراشے ہیں۔ اس مٹی کی باقیات خالد کے دو مرکزی کرداروں کی تعمیر میں کام آئی ہے۔ ہیرو ہیں، مصور فطرت، نباضِ نسائیات شاہ اسرار شیخ قربان علی کٹار گوجرانوالوی اور اسکا ساتھی ہے اقبال حسین چنگیزی۔ ۳۵

ایک دفعہ ایک محفل میں بانو قدسیہ، اشفاق احمد اور فیض احمد فیض کے علاوہ کچھ دوسرے ادیب بھی شریک تھے تو اردو ناول پر گفتگو شروع ہوئی۔ بانو قدسیہ چاکی واڑہ میں وصال کی بہت مداح تھیں اور اشفاق صاحب کے سامنے بہت تعریف کرتی تھیں، اشفاق صاحب کہنے لگے۔

تیرہ چودہ برس پہلے کی بات ہے جب ایک محفل میں فیض صاحب نے کہا، بھئی ہم کو تو محمد خالد اختر کی تحریر پسند ہے اور ہم تو چاکی واڑہ میں وصال کو اردو کا عظیم ناول سمجھتے ہیں، تو بانو قدسیہ نے فیض صاحب کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ شاباش فیض صاحب آپ کی اسسمنٹ بالکل کریکٹ ہے میں آپ کو فل مارکس دیتی ہوں۔ ۳۶

ان سطور میں چاکی واڑہ میں وصال کے لیے دی گئی آرا کے بعد چاکی واڑہ میں وصال کے کرداروں، کراچی کے مختلف علاقوں اور چاکی واڑہ کی اچھوتی کہانی پر ایک نظر۔

دراصل چاکی واڑہ میں وصال ایک منفرد اور اچھوتا ناول ہے جس میں اس کے کردار رنگ بھرتے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی لیاری کے علاقے چاکی اوڑہ کو دیکھیے تو اسے شاید کوئی دل کشی نظر نہ آئے لیکن محمد خالد اختر نے اپنے اس ناول کے ذریعے اس علاقے کو امر کر دیا ہے۔

خود محمد خالد اختر، اپنے ناول کے بارے میں کہتے ہیں۔

جب میں نے ناول چاکی واڑہ میں وصال لکھا تو میں ایک گندے فلیٹ میں رہتا تھا اور گھومتا پھرتا۔ جب میں نے ناول کا پہلا باب تحریر کیا تو مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کہانی کا ڈھانچہ کیا ہوگا میرے ذہن میں قطعی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے علم تھا کہ میں کیا لکھنے جا رہا ہوں۔ ۳۷

لیاری کا علاقہ، چاکی واڑہ

کراچی جو کسی زمانے میں پر امن اور زندگی سے بھرپور شہر تھا اس کے لوگ چین کی زندگی گزارتے تھے

انھی دنوں میں چاکی واڑہ بھی تجارتی، معاشرتی، سماجی گہما گہمی کا مرکز تھا۔ یہاں پہ بلوچ آباد تھے اور آج بھی ہیں۔ جو پرامن محنتی اور جفاکش لوگ تھے۔ زندگی بہت سکون سے گزرتی تھی۔

چاکی واڑہ کے بارے میں رمضان بلوچ اپنی کتاب لیاری کی ان کہی کہانی میں لکھتے ہیں۔

> اُس زمانے میں چاکی واڑہ لیاری کا مرکزی اور تجارتی علاقہ تھا۔ یہاں بڑی چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی۔ گورنمنٹ سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ دکانوں اور چھاپڑہ ہوٹلوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ یہاں پر ٹرام جنکشن کے علاوہ ملیر اور کھوکھراپار کی بسوں کا آخری سٹاپ بھی تھا۔ شہر جانے کے لیے لیاری کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں پہنچتے تھے یہاں سے سواری آسانی سے مل جاتی تھی۔ اس علاقے کے بارے میں کہا جاتا تھا یہاں رات کبھی نہیں ہوتی کیوں کہ رات گئے رونق برقرار رہتی تھی۔ ہر طرف روشنی پھیلی ہوتی تھی۔ اس کے مختلف حصوں میں کافی تعداد میں ہوٹلز اور ریسٹورنٹس تھے۔[۳۸]

شاید یہی وہ چاکی واڑہ تھا جو محمد خالد اختر سے ایک معرکے کا ناول لکھوا گیا۔ چاکی واڑہ کی گلیوں، محلوں، عمارات، لوگوں کو جنھیں باقی لوگ شاید درخورِ اعتنا نہ جانتے ہوں لیکن محمد خالد اختر کی آنکھ نے وہاں ایک ایسا رومانس دیکھا جو اردو ادب میں خاصے کی چیز کہلاتا ہے۔

بدقسمتی سے بعد میں لیاری کی فضا آگ، دھویں اور بارود سے بھر گئی اور اس کی شہرت ایک پرتشدد علاقے کے طور پر سامنے آئی جو اس کے حسن کو گہنا گئی۔ آج لیاری دوبارہ اپنے سنہری دور کی طرف جانے کی کوشش میں مصروف ہے تاکہ اس کا امن وسکون بحال ہو سکے۔

چاکی واڑہ میں وصال میں چاکی واڑہ کی مختلف علاقوں کے زندہ مناظر

چاکی واڑہ لیاری کا مشہور ومعروف علاقہ ہے۔ زندگی کی گہما گہمی سے بھرپور، چاکی واڑہ کراچی کے بہت سے علاقوں کی طرح ترتیب وربط سے عاری علاقہ ہے۔ صفائی ستھرائی، خوب صورتی کا حال بھی باقی کراچی سے مختلف نہیں ہے۔ یہ گلیاں، گندگی کے ڈھیر، بدبو کے بھبھکے، مکھیاں، نالیوں میں کھڑا پانی، بے ڈھنگی عمارات اور علاقے کے لوگوں کی بری حالت یہ سب چاکی واڑہ کا خاصہ ہے۔

محمد خالد اختر نے اس علاقے کو پیرس ثابت کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی بلکہ انھوں نے جہاں ہے جیسا

ہے ویسا ہی پیش کیا ہے۔ چاکی واڑہ اپنی پوری آب و تاب اور زندہ حالت میں محمد خالد اختر کے ہاں نظر آتا ہے۔ لیکن اس کوچہ بے نام کو عجیب سی جازیت بخش دی ہے۔ ایسا رومان تخلیق کیا ہے جو حقیقت سے ماورا دکھائی دیتا ہے جس کو صرف محمد خالد اختر کی آنکھ ہی چشم تخیل سے دیکھ سکتی ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے اس سارے ماحول سے کراہت نہیں محسوس ہوتی بلکہ ان ساری چیزوں پر بے ساختہ پیار آتا ہے۔ قاری اپنے آپ کو محمد خالد اختر کے سحر کا شکار پاتا ہے اور ان بدصورتیوں کی طرف اس کا ذہن سرے سے راغب ہی نہیں ہوتا۔

اس سارے علاقے میں جس کو لیاری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تمام بازار، علاقے، چوک چوراہے اس رومان سے عاری نظر آتے ہیں جو کہ محمد خالد اختر نے پیش کیا بلکہ اس علاقے کا نام سن کر کوئی رومانی خیال تک ذہن میں نہیں آتا مثلاً بکرا پیڑھی، آٹھ چوک، چیل چوک، فشری، کھڈا مارکیٹ، نیا باد ان علاقوں کے نام کُلی طور پر غیر رومانی ہیں۔

ناول کا ہیرو شیخ قربان علی کٹار مڈل وے سٹریٹ میں رہتا ہے اور مڈل وے سٹریٹ کا نقشہ کچھ یوں کھینچا گیا ہے۔

> شیخ قربان علی مڈل وے سٹریٹ میں رہتا ہے۔ میں اور میرے چند دوست اُسے سوگوار حسیناؤں کا کوچہ کہتے ہیں۔ یہاں چھوٹے ابتذال پذیر گھروں میں مقید سڑتی ہوئی بوریوں والی بالکنیوں کے پیچھے، کئی ملول زرد حسینائیں، کئی انمول گدڑی کے لعل ان شاہزادوں کے عشق میں گھل رہی ہیں جو کبھی نہ آئیں گے اور جب کوئی شاہزادہ آتا ہے تو اکثر شیخ کٹار کی طرح بزدل اور مایوس کن ہوتا ہے۔ مڈل وے سٹریٹ میں چند معمولی دکانیں ہیں۔ امان اللہ خان تمبا کو فروش (کارپوریشن سٹریٹ سے داخل ہوتے وقت دائیں کو) عبدالحق زین ساز، فضل محمد زرگر، گل محمد غریب جوتے بنانے والا، کولین سین چینا دندان ساز (کولین سین کو اپنی موٹی بیوی اور ایک درجن بچوں کے ساتھ دکان میں بیٹھے ہوئے ہر وقت دیکھا جاسکتا ہے)، حاجی محمد ابوبکر سوڈا واٹر کمپنی، ملا حاجی عبداللہ چارہ فروش، یہ چاکی واڑہ کے اصل سوداگر بچے ہیں۔۔۔ ہوٹل یہاں غلیظ اور مفلوک الحال ہیں۔ بے حد مفلسانہ بے حد معمولی، گھوڑا گاڑیاں یہاں نہیں چلتیں، اگر ایک آدھ وکٹوریہ نظر آتی ہے تو وہ ایسی قدیم اور ایسی ابتذال

دریخت کی حالت میں کہ آدمی کو اس کی حالت پر افسوس ہوتا ہے اور وہ تعجب کرتا ہے کہ کون اس الڑ جلڑ فرتوت چیز میں چڑھتا ہوگا اور یہ شے کیوں پرانے لوہے کے کباڑی کی دکان پر ٹکڑوں ٹکڑوں کی صورت میں ہونے کے بجائے ابھی تک اپنے پہیوں پر ہے۔

چاکی واڑہ کے مکانوں، عورتوں، دریائے لیاری کا بیان

زیادہ مکان چوبی تختوں، کھجور کی کھال کے بنے ہوئے ٹاٹوں اور گارے کے امتزاج سے کھڑے کیے ہوئے ڈھانچے سے ہیں اور آگے جا کر مڈل وے سڑیٹ اپنے کو پُر پیچ بھول بھلیوں میں کھو دیتی ہے۔ جہاں عورتیں اپنے لمبے، پُر تصویر پھولدار فرغلوں اور چاندی اور پیتل کے زیورات پہنے ایک دل رُبا مستانہ وار چال سے بہتی ہوئی ملیں گی۔ چاکی واڑہ کی عورتیں چلتی نہیں، بہتی ہیں۔ یہ کراچی کا ایک ایسا حصہ ہے جو بجائے خود ایک الگ شہر ہے اپنی ایک الگ تہذیب، اپنا رنگ، اخلاق ہے، ایک مدافعت آمیز انفرادیت کا علم سربلند کیے۔ اگر تم ان بھول بھلیوں میں سے سیدھے چلتے جاؤ تو کیچڑ اور بدبو کے اس مرکب پہ جا نکلو گے جسے دریائے لیاری کہا جاتا ہے اور جو چاکی واڑہ کے لیے وہ کچھ ہے جو لندن کے لیے ٹیمز یا پیرس کے لیے سین۔ دریائے لیاری (جب ہر کوئی اسے دریا کہنے پر مصر ہے تو چلو ہم بھی ایک لحظہ کے لیے اسے دریا مان لیتے ہیں) کی سیر گاہ کے بند پر تم اپنے نیچے گوبر کے اُپلوں سے پٹی ہوئی زمین پر، گھاس اور بدبودار کیچڑ میں لوٹتی ہوئی بھینسوں سے پرے دوسرے کنارے کھجور کے درختوں اور بنجر پہاڑوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سیر گاہ کے بند سے دنیا کو ابتذال کی آخری منازل پر دیکھا جا سکتا ہے۔[۳۹]

یہ اقتباس قدرے طویل ہے، لیکن چاکی واڑہ جہاں پر یہ رومان لکھا گیا کو بیان کرنے کے لیے سب سے مناسب بھی اس پیراگراف میں وہ سارا منظر موجود ہے جہاں یہ ڈراما کھیلا جانا ہے۔ ہر ایک منظر اپنی جزئیات کے ساتھ چاکی واڑہ کے تاجر، مکان، عورتیں، ذرائع آمدورفت، مال مویشی، دریا ساری چیزیں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ اس سارے منظر نامے میں کہیں لفاظی سے منظر کو خوب صورت یا منظر کی بدنمائی کی شدت کم کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی گویا رواں تبصرہ ہے جو چیزوں کو جیسی کہ وہ ہیں بیان کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ چاکی واڑہ کا یہ علاقہ اس پورے ناول میں جابجا نظر آتا ہے چاکی واڑہ کی بدنمائی، بدہیتی کے باوجود نہ جانے کیوں ناول شروع سے لے کر آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

چاکی واڑہ جہاں یہ ناول لکھا گیا وہاں مرکزی کردار اقبال حسین چنگیزی، شیخ قربان علی کٹار گوجرانوالوی اور پروفیسر شاہ سوار کی ملاقات کا اختتام اکثر کسی ریستوران میں ہوتا ہے۔ ایسا ریستوران جو پرولتاری استعمال کرتے ہیں اور ایسا جو بورژوایوں کے استعمال میں آتا ہے، تنقید نگار، ناول نگار لکھنے پڑھنے والے غرض ہر طرح کے لوگوں کی آماجگاہ۔ ان ریستورانوں کا بھی بہت خوب صورت منظر محمد خالد اختر نے پیش کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

چاکی واڑہ کے ریستوران

> کنگ ایڈورڈ فقھ راسٹوران یقیناً چاکی واڑہ کا سب سے شاندار اور اچھا ریستوران ہے۔ لیکن اگر تم چاکی واڑہ سے باہر کے بورژوا ہو تو میں تمہیں اس میں آنے کا مشورہ ہرگز نہ دوں گا (اس صورت میں تم چاکی واڑہ میں ہی کیوں آنے لگے) چاکی واڑہ کے اُمرا اور معززین کے لیے یہ کافی اچھا ہے بلکہ ایک طرح کا پرتکلف عیش کدہ ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ آخری لفظ اضافی ہے۔ کنگ ایڈورڈ فقھ ریسٹوران کی فضا کی ہرادا اشتراکی ہے۔۔۔ جب ہم اور ملاہدیٰ وغیرہ اندر داخل ہوئے تو کسی نے ہم پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہ کیا جیسے بکروں اور ریچھوں کا آنا معمول کا واقعہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ چاکی واڑہ کے کسی دوسرے ریسٹوران میں ہمیں اس طمانیت سے گھسنے نہ دیا جاتا۔ یہ فراخدلی اور حقیقی آزادی کی فضا چاکی واڑہ کے کئی کششوں میں سے ایک ہے اور یہی باتیں ہیں (سادہ اقتصادیات کے مسئلہ کو چھوڑ کر) کہ میں نے اس بے مثال شہر کی مستقل شہریت اختیار کر لی ہے۔[۴۰]

چاکی واڑہ کے لوگوں کی معاشرت

ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح چاکی واڑہ کے لوگ بھی مختلف پیشوں سے منسلک ہیں۔ یہاں پر تاجر ہیں قصاب ہیں۔ عامل ہیں، شربت بیچنے والے ہیں، سبزی ترکاری بیچنے، خریدنے والے، ٹرانسپورٹ کے شعبے کے لوگ غرض ایک رنگارنگی اور ہما ہمی چاروں طرف جاری ہے۔ معاشرتی زندگی کی ذمہ داریاں اور مجبوریاں چاکی واڑہ کے لوگوں کے لیے بھی ویسی ہی ہیں جیسی ملک کے باقی شہریوں کی، عورتیں، بچے، دکاندار، خریدار، محمد خالد اختر کے ناول کے منظر نامے میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جو زندگی کی گاڑی کو اپنا پورا زور لگا کر کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں، ناول میں جگہ جگہ ان کی بڑی خوب صورت تصویریں نظر آتی ہیں۔

یہاں پر عاشق بھی ہیں محبوب بھی ہیں اور محبوب کی بے پروائیاں بھی ہیں۔ شیخ قربان علی کٹار کی محبوبہ رضیہ کا تذکرہ ہے جو کسی پروفیسر سے شادی کرنا چاہتی ہے جس کے لیے شیخ قربان علی کٹار مصنف کا گاؤن اور چوکور ٹوپی ادھار لے جاتا ہے کبھی نہ واپس دینے کے لیے۔ غرض زندگی کی پوری تصویر ہے جو اس ناول کے صفحوں میں بکھری ہوئی ہے۔ یہاں کے والدین کو بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہے اور وہ مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں۔ پورے پاکستان کی طرح یہاں بھی ایسے ڈاکٹر پائے جاتے ہیں جو درحقیقت ڈاکٹر نہیں ہیں بلکہ عطائی بھی نہیں ہیں ان سب کا احوال تفصیل سے پڑھنے کو ملتا ہے۔

محمد خالد اختر جب لی مارکیٹ کی تصویر بناتے ہیں تو گویا کوزے میں سمندر کو بند کر دیتے ہیں۔ چاکی واڑہ کی اتنی خوب صورت تصویر جس کے لینڈ سکیپ میں سب کچھ ہے جو زندگی کا لازمہ ہے۔ جو شہر اور اس کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خانقاہیں اور ان کے گدی نشین ہیں۔ عامل جادوگر ہیں جو محبوب کو آپ کے قدموں میں جھکا سکتے ہیں ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں جو غیب کا حال جانتے ہیں۔ غرض قاری کو اجنبیت اور غیریت کا ہرگز احساس نہیں ہوتا۔

چاکی واڑہ کی معاشرت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا محمد خالد اختر کا ایک اقتباس

> لی مارکیٹ کا وسطی ٹاور چاکی واڑہ کے لیے وہی کچھ ہے جو پیرس کے لیے ایفل ٹاور اور خواہ تم چاکی واڑہ کے کسی حصے میں ہو تم اس سے نہیں بچ سکتے۔ یہ ٹاور چاکی واڑہ کے لوگوں کی زندگی پہ ہر لحظہ مسلط رہتا ہے اور وہ ایک قسم کا مرکز ہے جس کے گرد یہاں کے شہری برق پاروں کی طرف طواف کرتے رہتے ہیں اس ٹاور کے بغیر وہ سب لوگ جیسے کھو جائیں گے۔۔۔ مایوس خالی جیب نوجوان یہاں آکر اس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ڈھارس سی پاتے ہیں اور دنیا کی بے رحمیوں کا سامنا کرنے کے لیے نیا حوصلہ، چاکی واڑہ کے شاعر، آرٹسٹ اور ناول نگار یہاں اپنی اگلی نظم اور اگلے ناول کے لیے فیضان حاصل کرنے آتے ہیں۔ (وہ اس کے لیے ٹاور کے کلاک کی طرف گھنٹوں کھڑے تکتے ہیں) اور قرض خواہ اپنے مقروضوں کو کہیں اور نہ پا کر یہاں ان کے دیدار سے مشرف ہوتے ہیں اور اپنے قرضے وصول کرتے ہیں۔ چاکی واڑہ والے اپنی ساری ضروریات کے لیے لی مارکیٹ ہی آتے ہیں۔[۴۱]

چاکی واڑہ کا ہائیڈ پارک

چاکی واڑہ کی معاشرتی زندگی کی ہلچل ، گہما گہمی، رنگا رنگی کے بڑے متنوع نمونے سامنے آتے چلے جاتے ہیں گویا ایک دلچسپ فلم ہے جو پردہ سکرین پر ایک کے بعد ایک دل نشین منظر لیے ہوئے۔

چاکی واڑہ کا ہائیڈ پارک جو شہر کی سماجی، معاشرتی زندگی کا مرکز ہے جہاں پر عام، خاص کے مجمعے میں عامل، پبلک کے خیر خواہ اکٹھے ہوکر شہریوں کے سامنے اپنی جدید ایجادات، معرکہ آرا سرگرمیوں کا احوال بیان کرتے ہیں۔

سانپ ، مداری ، بندر کا تماشا ہمارے ملک کے طول وعرض کی طرح عامل بابے یہاں موجود ہوں گے طرح طرح کی ہیت کذائی کے ساتھ رنگ برنگے شعبدوں کے ساتھ۔لوگوں کی جیبوں سے پیسا نکلوانے کے گر جاننے والے مختلف گھسے پٹے شعر سنا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے والے غرض پوری معاشرت کی زندہ و جاوید تصاویر سامنے آتی ہیں۔

محمد خالد اختر لکھتے ہیں۔

> اس چوک سے آگے ایک چھوٹا گارڈن ہے ۔ایک آہنی مستطیل جنگلے کے اندر خشک گھاس کا قطعہ جس پہ چند سوکھے ہوئے ، مصیبت زدہ شہتوت کے درخت اُگے ہوئے ہیں ۔ یہ چاکی واڑہ کا ہائیڈ پارک ہے اور ہر شام چاکی واڑہ کے عامل کامل دوائیوں کے موجد دوسرے پبلک کے مخیّر حضرات یہاں چاکی واڑیوں کو اپنی تازہ ترین، تیر بہدف عملوں اور خوراکوں اپنی معرکہ آراء ایجادوں کے بارے میں اطلاع دینے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔[۴۲]

یہ لوگ پبلک سپیکنگ کے ماہر ہوتے ہیں۔ان کے اس ہنر کے آگے ملک کے بڑے بڑے لیڈر اور راہ نما نہیں ٹک سکتے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان سب نے کسی یونیورسٹی سے تعلیم پائی ہے کیوں کہ لوگوں کو مسمرائیز کرنے کا ہنر ان سب کو یکساں آتا ہے ان کے جملے، اشعار، مثالیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن کارگر ہوتی ہیں ۔مخاطب سے مرضی کا جواب لینے کا فن بھی ان پر ختم ہے سوال کے اندر جواب کے لیے کامل راہ نمائی ہوتی ہے لیکن معلوم یوں ہوتا ہے جیسے مخاطب کو حال اور مستقبل کی معلومات انھوں نے فراہم کی ہیں۔

یہ لوگ ایسے جادوگر ہوتے ہیں جو سارے مجمعے کو اپنی گرفت میں لینے کے اہل ہیں پورا مجمع ان کے علم سے مبہوت ہوجاتا ہے۔کراچی کے علاوہ ہمارے ملک کے اکثر شہروں میں ایسے مجمع باز لوگ موجود ہیں ۔ان کا

بڑی تفصیل سے تذکرہ محمد خالد اختر نے چاکسی واڑہ میں وصال میں کیا ہے۔ یہ لوگ بظاہر غیر اہم ہوتے ہیں اور لوگ ان کو دخورِ اعتنا نہیں جانتے لیکن یہ لوگ زندگی کی حقیقتوں کے شناور ہوتے ہیں اور ایک بھرپور زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یہ معاشرت میں موجود تو ہم پرستی، جہالت، غربت کو کچھ یوں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسے معاشرت کی سماجی سائنس کے پروفیسر بھی نہ کر پاتے ہوں گے۔

یہ لوگ محمد خالد اختر کے ناول چاکسی واڑہ میں وصال میں پوری شان سے جلوہ گر ہیں۔

رضیہ کا حسن بے مثال اور کراچی کے خُسر

شیخ قربان علی کٹار گوجرانوالوی جس کی عقیدت مندی کا دم ان کا قاری اقبال حسین چنگیزی ڈائریکٹر اللہ توکل بیکری شدت سے بھرتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار ہیں لیکن دوسرے ناولوں کے ہیرو کے برعکس، بزدل، کم ہمت، کام چور اور بے عمل انسان ہے۔ رضیہ کے توبہ شکن حسن سے گھائل ہونے کے بعد اس کے وصال کے لیے اقبال حسین چنگیزی کی مدد کا خواستگار ہوتا ہے۔ لیکن کسی بھی مرحلے پر عملی کام کرنے سے گریزاں نظر آتا ہے۔

رضیہ جو اس کے خوابوں کی ملکہ ہوتی ہے کے حصول کے لیے اس کے باپ عمر قصاب کا سامنا کرنے کے بجائے کسی اور طریقے سے اس کا حصول چاہتا ہے۔ اقبال حسین چنگیزی جب رضیہ کو ایک نظر دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے پھر وہ نئے جذبے کے ساتھ شیخ قربان علی کٹار کی مدد پر آمادہ نظر آتا ہے۔ رضیہ کو پہلی دفعہ دیکھنے کے لیے کٹار کے فلیٹ پر پہنچتا ہے جو منظر اُسے نظر آتا ہے وہ کچھ یوں ہے۔

> اور پھر میں نے اس چہرے کو ایک شگاف میں سے صاف دیکھا جو چوڑے دریچے کی طرح ٹاٹ میں تھا اور اسے دیکھ کر میرے حلق میں جیسے پھانس سی لگ گئی۔ اس کا حسن سانس روک دینے والا تھا۔ کبھی کسی گدڑی میں ایسا نایاب اور آب دار لعل نہیں دمکا ہوگا۔ مکرانی باغوں میں کوئی پھول اس لطافت اور نزاکت سے نہ مہکا ہوگا۔۔۔ عورت رضیہ کا سن کوئی سترہ برس کا ہوگا۔ اس کے نقوش کھڑے تھے اور ان میں ایک زرد ملاحت سی تھی جیسے اسے کسی یونانی سنگ تراش نے کسی قیمتی نازک چینی سے تیار کیا ہو۔ اس کے حسن میں ایک ناپائیداری کا حزن تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا اگر وہ ذرا گر پڑے تو چکنا چور ہو جائے۔[۴۳]

اس حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے کٹار وصل کا تو خواہاں تھا لیکن اس کے لیے کوئی قیمت دینے کو تیار نہ

تھا اس نے ایک منصوبہ بنایا جس کی رو سے وہ رضیہ کا حصول چاہتا تھا لیکن چنگیزی کو وہ منصوبہ سرے سے نا قابل عمل لگتا تھا۔

ناول میں آگے فرائیڈ کا حوالہ بھی آتا ہے جو مصنف کے ذہن میں رضیہ کو دیکھ کر آنے والے خیالات کے سلسلے میں تھا۔ لیکن مصنف اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ کٹار ہمت کرے اور عمر قصاب سے بات کرے تا کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکے۔ کٹار عمر قصاب سے خوف زدہ ہے اور اس سے ملنے کو قطعاً تیار نہیں۔

جس پر مصنف اس کو کراچی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ تم ایک عدد فلیٹ کے مالک ہو اور کراچی کے خسر اس بات کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ تمہارے پاس ایک سنہری موقع ہے لیکن چنگیزی کے اصرار کے باوجود کٹار تیار نہیں ہوتا۔

یہ اقتباس تاریخی اور کراچی کے لوگوں کے حوالے سے زمینی حقائق مدنظر رکھنے کی روشن مثال ہے۔

> جیسا کہ ہر کسی کو معلوم ہے کوئی شخص جس کے پاس فلیٹ ہو، موجودہ کراچی میں بے حد رشک اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور یقیناً سوسائٹی میں عزت اور تکریم کا مستحق ہے ۔کراچی کے کئی خسروں کی مثالیں دی جا سکتی ہیں جنہوں نے کسی آدمی کو صرف اس لیے لڑکی دے دی ہے کہ اس کے پاس فلیٹ تھا اور جو لڑکی دینے کے بعد اپنے پورے کنبے کے ساتھ اپنے داماد کے فلیٹ میں جا نازل ہوئے۔[۴۴]

چاکی واڑہ میں وصال اور بالکونی کا عشق

شیخ قربان علی کٹار اور اقبال حسین چنگیزی اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح اس طرح دار حسینہ کو رام کریں۔ منصوبہ بنایا جاتا ہے لیکن کٹار ایسے کسی منصوبے کو قابل عمل خیال نہیں کرتا جس میں اس کو کچھ کردار ادا کرنا پڑے، چنگیزی حیلے بہانوں سے اُسے عمل پہ ابھارتا ہے پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ چاکی واڑہ چونکہ ایک ایسی بستی ہے جہاں پیر، فقیر، عامل اکثر پائے جاتے ہیں لہٰذا کٹار کسی ایسے ہی نسخے کی تلاش میں ہے جو تیر بہدف ہو بقول چنگیزی یہ غالباً اس کا بارہواں عشق تھا۔

کٹار بظاہر بے ضرر سا انسان تھا لیکن معاشرے میں ایسے انسانوں کی کھپت نہ تھی کوئی بھی شخص اپنی بیٹی ایسے کسی بھی آدمی کو دینے سے پہلے ہزار دفعہ سوچے گا۔ عمر قصاب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص تھا جس نے ساری عمر بڑی محنت سے زندگی گزاری تھی۔ کٹار نے جب سے اُس کے گھر پر نظریں

گاڑیں تھیں وہ تاڑ گیا تھا اور چنگیزی کے ہاتھ کٹار کے لیے سخت پیغام بھجوا چکا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود عشق ایک لا علاج مرض ہے۔اس کے مریض اتنی آسانی سے صحت یاب نہیں ہوتے چاہے جتنی مشکلات آئیں یہ کچھ نہ بھی کر پائیں تو آہیں بھرنے سے باز نہیں آتے۔

دل کے ماروں نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب

زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

ان کا کراہنا کب ختم ہوتا ہے۔ یہاں پر مصنف کراچی کی آبادی، گھروں کا چھوٹا اور کثیر المنز لہ ہونے کے سبب ہمارے لیے عشق کا ایک نیا تصور لے کر آتے ہیں جو اپنی ذات میں نیا اور خاصا مزاحیہ سا معلوم ہوتا ہے مصنف نے اس بالکونی کا عشق کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اور بڑے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ امریکا اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں مختلف موضوعات پر دھڑا دھڑ کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ ہمارے ملک میں کسی شخص یا عاشق نے بالکونی کے عشق پر اپنے تجربات کا نچوڑ ابھی تک نوآموز عاشقوں کے حوالے نہیں کیا یہ بہت بڑا فقدان ہے اس کو پُر کیا جانا از حد ضروری ہے۔تا کہ دوسرے لوگ اس سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں وہ اس کتاب کا ایک نام بھی تجویز کرتے ہیں۔

بالکونی والی لڑکی تمہاری ہوسکتی ہے

اس تمہید کے بعد وہ پیراگراف جس سے یہ ساری بحث پیدا ہوئی ہے۔

> چاکی واڑہ میں بعض جگہ اور کراچی میں ہر جگہ واحد قسم کا عشق جو ممکن ہے وہ بالکونی کا عشق ہے۔ میرا مطلب ہے اس عشق سے جس میں عاشق اور محبوب اپنی اپنی فلیٹوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر عشق فرماتے ہیں۔ اس قسم کے عشق کی تکنیک دوسرے تمام قسم کے عشقوں سے مختلف اور مشکل ہے اور یہ قابل افسوس ہے کہ اب تک اس بالکونی عشق پر کسی ماہر فن نے کتاب لکھنے پر توجہ نہیں کی۔ [۴۵]

محمد خالد اختر کا چاکی واڑہ میں وصال اک ہزار داستان ہے جو مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے اس کے کردار اقبال حسین چنگیزی، شیخ قربان علی کٹار، پروفیسر شاہ سوار خان، شداد پشمی، رضیہ، عمر قصاب، ڈاکٹر غریب محمد ایسے کردار ہیں جو تفصیلی بیان کے محتاج ہیں، لیکن موضوع کی تحدید کے پیش نظر سید مظہر جمیل کے رائے

پر اس حصے کو ختم کیا جاتا ہے۔

سید مظہر جمیل کہتے ہیں۔

> محمد خالد اختر نے اپنے اس ناول کے ذریعے آبادی کے اس حصے کی طرف توجہ دلائی ہے جو اپنے خاص ماحول اور معمولات میں مگن ہے ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہے کہ زندگی کے میدان میں وہ کن نعمتوں سے محروم رہ گئے ہیں۔ لیکن وہ زندگی کی معنویت سے بخوبی آگاہ ہیں اور زندگی کو ہر حال میں بسر کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کے خواب عذاب اسی دنیا سے وابستہ ہیں یہیں ان کے رومان جنم لیتے ہیں اور اسی جگہ ان کے اسباب ہلاکت چھپے ہوئے ہیں۔ یہی وہ تماشا گاہ ہے جہاں ان کے ہیرو اور اینٹی ہیرو دونوں سرگرم عمل رہا کرتے ہیں۔ چاکی واڑہ میں وصال زندگی کی (absurdity) میں معنویت کی بازیافت کی انتہائی دلچسپ اور مؤثر تمثیل ہے۔ ۴۶

آب گم اور مہاجرین کی بپتا

آب گم ناول ہے یا نہیں اس کا سرِ دست فیصلہ کرنا مقصود نہیں لیکن یوسفی صاحب کے قلم نے ان غم زدوں کے جو نوحے بیان کیے ہیں ان سے صرفِ نظر کرنا کسی طور ممکن نہیں۔ یہ تحریر چشم کشا حقائق سے پُر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب کے ہاں جو ہجرت کے بعد مہاجرین پر بیتی کے قصے ہیں وہ اس قدر جاندار اور متحرک ہیں کہ ان کو شامل کیے بغیر بات ادھوری رہتی اس لیے مختصراً ان کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

ہجرت کے عذاب جھیلنے والوں کے لیے ہجرت کے بعد زندگی اپنی نئی معنویت کے ساتھ سامنے آئی تھی ۔ایسی معنویت جو بڑے بڑوں کا پتا پانی کرنے کے لیے کافی تھی ۔زندگی اتنی تلخ، مشکل اور زہر آلود ہو سکتی ہے ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

مہاجرین جس کرب سے گزرے وہ صرف ہجرت کا عمل نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنے بھرے پُرے گھر، کاروبار، روزگار اور جانے پہچانے لوگ چھوڑ کر آ رہے تھے اور جہاں جا رہے تھے وہاں ان کو بسانے کے لیے مناسب انتظام نہ ہونے کے برابر تھے۔ پاکستان کی محبت اور خوابوں کی سرزمین پر پہنچنے والوں کو شاید علم نہ تھا کہ مصائب کا ایک دریا ہے جو ابھی انھیں پار کرنا ہے۔ مہاجرین کی آمد کے بعد ان کی زندگی نے گویا نیا جنم لیا تھا۔ ایسا جنم جس کا آغاز کرب والم تھا اور انجام دکھ و غم۔

ان لوگوں کو نہ چھت میسر تھی نہ دو وقت کا کھانا۔ ہزاروں لوگوں کے لیے اس طرح کے انتظام ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اپنی مدد آپ کے تحت جھگیوں کی آبادیاں پورے کراچی میں پھیلتی چلی گئی۔ نہ صاف پانی، نہ کھانا، بچوں، بوڑھوں، عورتوں، جانوروں کا مل کر ایک جگہ رہنا ایک ایسا ماحول تخلیق ہوا جس کا بھرپور اظہار یوسفی صاحب کے ہاں ملتا ہے۔

ان مصائب کو بیان کرنے کے لیے جس معجز نگار قلم کی ضرورت تھی وہ یوسفی صاحب کو عطا ہوا تھا۔ یوسفی صاحب نے آب گم میں کراچی کے ان خانماں برباد لوگوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو آج کا بڑے سے بڑا ہائی ڈیفینیشن کیمرا بھی نہ کر پاتا ہوگا۔

ان کے دکھ، رنج، مصیبتیں ان کو اندر ہی اندر کیسے کچوکے لگا رہے تھے یہ دیکھنے کے لیے آب گم کے صفحات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ پہلے اُن مہاجرین کی جھگیوں پر ایک نگاہ کہ یوسفی صاحب نے ان کی بود باش کو کیسا پایا۔

کرامت حسین کی جھگی، سطح سمندر اور خط ناداری سے نیچے

> انھیں لیاری میں مولانا کرامت حسین کی جھگی تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی، حالانکہ بتانے والے نے بالکل صحیح پتہ بتایا تھا کہ جھگی بجلی کے کھمبا نمبر ۲۳ کے عقب میں کیچڑ کی دلدل کے اس پار ہے۔ تین سال سے کھمبے بجلی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ پتے میں اس کے دائیں جانب ایک گیا بھن بھوری بھینس بندھی بتائی گئی تھی۔ کراچی کا یہ سب سے پسماندہ علاقہ وسطح سمندر اور خط ناداری (Poverity Line) سے گزوں نیچے تھا۔ سمندر کا حصہ ہوتے ہوتے اس لیے رہ گیا تھا کہ درمیان میں انسانی جسموں کا ڈھیٹ پشتہ کھڑا ہوگیا تھا۔ زمین سے ہر وقت کھاری پانی رستا رہتا تھا جو لکڑی اور لوہے کو چند مہینوں میں گلا دیتا تھا۔ ہوا میں رکے ہوئے سمندری پانی کی سڑاند بسی ہوتی تھی جو سڑی ہوئی مچھلی کی بدبو سے بھی بدتر تھی۔ مولانا کرامت حسین نے جھگی کے ایک کونے میں کھانا پکانے کے لیے ایک ٹیکری پر ایک چبوترہ بنا رکھا تھا۔ ایک کھاٹ کے پائے سے بکری بندھی تھی۔ کچھ جھگیوں کے سامنے بھینسیں کیچڑ میں دھنسی تھیں ان کی پیٹھ پر کیچڑ کا پلاسٹر پپڑا رہا تھا۔ جن پڑھنے والوں نے اس زمانے کی بہار کالونی، چاکی واڑہ اور لیاری نہیں دیکھی وہ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ انسان ایسی گندی،

اگھوری حالت میں نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ نئی زندگیوں کو جنم بھی دے سکتا ہے۔[۴۷]

زندگی اور زندہ رہنے کی سکت کس قدر مشکل حالات میں بھی کرامت حسین کے ہم رکاب ہے یہ اقتباس اس کا ایک ادنیٰ سانمونہ ہے۔ زندگی کے یہ زندہ اور جاوید معرکے پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے ششدر کردیتے ہیں۔ انسان کتنی مشکلات میں زندہ رہ سکتا ہے اور زندگی کس قدر ڈھیٹ ہے کہ سخت پتھر میں بھی شگاف کرکے اُگنے پر آمادہ رہتی ہے۔

پس کرامت حسین کے بچے پیدا ہورہے ہیں۔ یہیں بڑھے اور یہیں ان کی شادیاں ہورہی ہیں۔ غرض پوری معاشرت کا دارومدار ان جھگیوں پر ہے۔ انسان کس قدر سخت جان ہے اس کا اندازہ ہجرت کے غم سے کیا جاسکتا ہے۔ قدم قدم پر انسان بقول یوسفی صاحب کے ہک دہک رہ جاتا ہے کہ یاخدا مصائب کی کوئی حد ہے یا یہ سلسلہ بے حد وحساب ہے۔ کرامت حسین کے دکھ اس علاقے کے ہر باسی کے دکھ ہیں۔ کیچڑ کے اس دلدل میں انسان کس قدر کسمپرسی کی زندگی گزارتا ہے۔

مولانا کرامت حسین کے مصائب

> میرے والد کی کولھے کی ہڈی ٹوٹے دو سال ہوگئے، وہ سامنے پڑے ہیں۔ بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ چارپائی کاٹ دی ہے۔ مستقل لیٹے رہنے سے ناسور ہوگئے ہیں۔ ایک تو اتنا گہرا ہے کہ پوری انگلی اندر چلی جائے۔ ستلی برابر موٹی رگ اندر نظر آتی ہے۔ پیپ رستی رہتی ہے۔ زخم صاف کرتے ہوئے مجھے کئی دفعہ قے ہوچکی ہے۔ ڈالڈا کے ڈبوں میں پانی بھر کے چار پائیوں کے نیچے رکھ دیے ہیں تاکہ دوبارہ لال چیونٹے زخموں میں نہ لگیں۔ چار مہینے قبل فضل ایزدی سے ایک فرزند تولد ہوا اللہ کی دین ہے۔ بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک۔ اللہ نبی ﷺ کی امت کو بڑھاتا ہے۔ جاپے کے بعد ہی بیوی کو (White Leg) ہوگئی۔ ہل نہیں سکتی مرضی مولا۔ رکشہ میں ڈال کر جناح ہسپتال لے گئے۔ کہنے لگے۔ فوراً ہسپتال میں داخل کراؤ مگر یہاں کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک مہینے بعد پھر لے گیا۔ اب کی دفعہ کہنے لگے اب لائے ہو لمبی بیماری ہے۔ ہم ایسے مریض کو ایڈمٹ نہیں کرتے۔ صبر کیا۔ راضی ہیں ہم اسی میں جس میں رضا ہو تیری۔ فجر اور مغرب سے پہلے دونوں مریضوں کا گوہ موت کرتا ہوں۔ نماز کے بعد خود روٹی ڈالتا ہوں تو بچوں کے پیٹ میں کچھ جاتا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے

ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔[۴۸]

زندگی کی دشوارگزار گھاٹیاں، مصائب کا انبوہ اور پچکا ہوا احساس تفاخر ہر گھڑی جسم و جان سولی پر لٹکے ہوئے ہیں۔ اس دلدلی زمین پر جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا کس قدر دشوار ہے اس کا احوال کوئی اس دل جلے سے پوچھے جس نے اس حال میں زندگی کی ہو۔

یہ مرقعے جو آب گم سے پیش کیے ہیں ان سوختہ جانوں کے ہیں جن کو لوگ مہاجرین کے نام سے جانتے ہیں۔ کیا خبر ان مہاجرین کے دل میں بعد کو جو نفرت و کدورت در آئی وہ اسی ابتدائی "مہمان نوازی" کا نتیجہ ہو جو بقول ان کے ہم نے روا رکھی ہے۔ حالات ایسے بھی تھے کہ دانہ تک اُڑ کے منہ تک نہ پہنچتا۔ بچے، بوڑھے سب فاقہ کرتے، اس فاقہ کشی کا کچھ نہ کچھ تو نتیجہ برآمد ہونا تھا برا یا بھلا سو ہوا۔

ایک دوسرے خاکے میں یوسفی صاحب اس احساس تفاخر کی بھی بات کرتے ہیں جو آنے والوں کو تھا کہ ہم نے اس ارض وطن کے لیے کیا کیا قربان کیا اور جب ان قربانیوں کا صلہ بن مانگے نہ ملا تو زور زبردستی سے وصول کیا گیا اور اس کو اپنا حق سمجھا گیا۔

پاکستان کے قیام کے فوراً بعد کے ایام نہ صرف پاکستان بلکہ پاکستان آنے والوں کے لیے انتہائی کٹھن تھے۔ ان کٹھن ایام کی کہانی یوسفی صاحب کے ہاں پڑھنے کو ملتی ہے۔

عزت نفس، خودداری، احساس تفاخر کی موت

حالات زندگی میں بسا اوقات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں کہ انسان کے لیے ناخوب، خوب ہو جاتا ہے۔ مہاجرین کی زندگی میں تو ایسے اکثر مواقع آتے رہے کہ ان کو موت زندگی سے بہتر لگنے لگی۔ لیکن کیا کریں زندہ رہنے کی خواہش کا کہ ہزار مشکلات کے باوجود انسان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ ایسے ہی ایک منظر کی تصویر کشی یوسفی صاحب نے کچھ یوں کی ہے۔

> بیٹی کے گھر ٹکڑے توڑنے یا اس پر بار بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کانپور میں کبھی اس کے ہاں کھڑے کھڑے ایک گلاس پانی بھی پیتے تو ہاتھ پر پانچ، دس روپے رکھ دیتے لیکن اب؟ صبح سر جھکائے ناشتہ کر کے نکلتے تو دن بھر خاک چھان کر مغرب سے ذرا پہلے لوٹتے کھانے کے وقت کہتے ایرانی ہوٹل میں کھا آیا ہوں۔ جوتے انھوں نے ہمیشہ رحیم بخش جفت ساز سے بنوائے تھے۔ اس لیے کہ اس کے بنائے ہو جوتے چرچراتے بہت تھے۔ ان جوتوں

کے تلے اب اتنے گھس گئے تھے کہ چرچرانے کے لائق بھی نہ رہے۔ پیروں میں ٹھیکیں پڑ گئیں۔ شیروانیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ بیمار بیوی رات کو درد سے کراہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سمدھیانے والوں کی نیند خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔[۴۹]

اس پر درد بیان کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جو ایک باپ، ماں کے دل پر گزر رہی ہے۔ زندگی بھیانک روپ دکھانے پہ آجائے تو آخری حد کیا ہوگی شاید انسان کبھی نہ جان سکیں۔ جنگ عظیم اول اور دوم کے مصائب بھی لوگوں نے جھیلے جلی کٹی لاشوں کے انبار سے بھی لوگ زندہ برآمد ہوئے۔ مہاجرین بھی اتنے دکھ جھیلنے کے باوجود ہار ماننے کو تیار نہیں۔

آخر میں اب اس رویے کا تذکرہ جس میں درد کا حد سے بڑھنا دوا بن جانے کے مترادف کہا گیا ہے۔

مہاجرین نے آخر کار زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا کہ زندگی صرف طعنہ تشنیع اور رونے دھونے کا نام نہیں بلکہ آگے بڑھ کر جام کو ساقی سمیت اٹھا لینے کا نام ہے۔ اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ یوسفی صاحب لکھتے ہیں۔

جام اس کا ہے جو بڑھ کر خود ساقی کو جام و مینا سمیت اُٹھا لے

گلی گلی خاک پھانکنے اور دفتر دفتر دھکے کھانے کے بعد قبلہ کے قلب حزیں پر کچھ القا ہوا۔ وہ یہ کہ قاعدے قانون داناؤں اور جابروں نے کمزور دل والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ جو شخص ہاتھی کی لگام تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ جام اس کا ہے جو بڑھ کو خود ساقی کو جام و مینا سمیت اُٹھا لے۔ بالفاظ دیگر جو بڑھ کر تالا توڑ ڈالے، مکان اسی کا ہوگیا۔۔۔ مذکورہ بالا القا کے بعد برنس روڈ پہ ایک اعلیٰ درجے کا فلیٹ اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماربل کی ٹائلز، سمندری ہوا کے رخ کھلنے والی کھڑکیاں جن میں رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ دروازے کے زنگ آلودہ تالے پر اپنے علیگ تالے کی ایک ہی ضرب سے فلیٹ میں اپنی آبادکاری بلامنت سرکار کرلی۔۔۔ فلیٹ پر قابض ہونے کے کوئی چار ماہ بعد قبلہ اپنے چوڑی دار کا گھٹنا رفو کررہے تھے کہ کسی نے بڑے گستاخانہ انداز سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مطلب یہ کہ نام کی تختی کو پھٹ پھٹایا۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا آنے والے نے خود کا تعارف اس طرح کرایا گویا اپنے عہدے کی چپڑاس ان کے منہ پر اٹھا کے دے ماری، افسر، محکمہ کسٹوڈین،

ایویکوی پراپرٹی پھرڈپٹ کر کہا بڑے میاں فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ۔ قبلہ نے واسکٹ کی جیب سے حویلی کا فوٹو نکال کر دکھایا۔ "یہ چھوڑ کر آئے ہیں۔" اس نے فوٹو کا نوٹس نہ لیتے ہوئے قدرے درشتی سے کہا۔ بڑے میاں! سنا نہیں؟ الاٹمنٹ آرڈر دکھاؤ۔ قبلہ نے بڑی رسان سے اپنے بائیں پیر کا سلیم شاہی جوتا اُتارا اور اتنی ہی رسان سے کہ اُس کو گمان تک نہ ہوا کیا کرنے والے ہیں، اس کے منہ پر مارتے ہوئے بولے یہ ہے یاروں کا الاٹ منٹ آرڈر، کاربن کاپی بھی ملاحظہ فرمایئے گا، اس نے اب تک یعنی تادم تذلیل، رشوت ہی رشوت کھائی تھی، جوتے نہیں کھائے تھے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔ ۵۰

قرۃ العین حیدر آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر نے ہجرت کی تفہیم، ہجرت کے بعد ہونے والی شکست و ریخت، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ پر کئی ناول تحریر کیے۔ ہائوسنگ سوسائٹی، سیتا ہرن، آگ کا دریا، ان سب میں ناسٹیلجیا کی عناصر کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بدلتے تیور اور انسانی رویوں کی ہا ہمی کے ساتھ انسان کا وقت کے ساتھ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ہجرت اُن کے نزدیک رشتوں کے مابین ایک طرح کا خط تنسیخ ہے جو اتنی واضح اور شدت کے ساتھ کھینچا گیا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اب اس کو ختم نہیں کر سکتی ۔

آگ کا دریا میں کراچی پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے جو قرۃ العین حیدر نے کیا۔ اس تبصرے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ۱۹۵۶ء میں کیے گئے اس تبصرے کے جاندار ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

قرۃ العین حیدر کی مستقبل بینی کی داد دینی پڑتی ہے اُنھوں نے اس اقتباس میں مستقبل کے متعلق جو گفتگو کی اس کی سچائی مانے بغیر چارہ نہیں قرۃ العین حیدر کا یہ اقتباس اگر آج پڑھا جائے تو لگتا ہے کہ آج کے حالات بعینہ وہی ہیں جو آگ کا دریا میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس اقتباس کا ہر لفظ ہر سطر حسب حال معلوم ہوتی ہے۔ ملک عزیز کی سیاست، انتظامی عہدوں پر متمکن لوگ، خواتین، اعلیٰ عہدے دار غرض ہر شعبے پر کی گئی یہ کمنٹری چشم کشا ہے۔

قوموں کی زندگی میں ادیب قوم سے متعلق جب گفتگو کرتے ہیں اور خاص طور پر جب قوم کی اجتماعی بے حسی پر بات ہوتی ہے تو اس ادیب کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں

پھیلائی جاتی ہیں ۔لیکن جب وقت کا پہیہ اُسی مقام پر پہنچتا ہے جس کی ادیب نے نشان دہی کی ہوتی ہے تو ہمارے پاس کھسیانی ہنسی کے سوا کچھ نہیں بچتا۔کراچی کی جو تصویر یہاں دکھائی گئی تھی آج حقائق اس کی صداقت کے گواہ ہیں۔

کراچی

کراچی مملکت خداداد پاکستان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اور دنیا کے پانچویں بڑے ملک کا دارالحکومت جہاں کے سلمز اور پناہ گزینوں کے جھونپڑے عجائبات عالم میں شمار کیے جاتے ہیں۔خصوصاً وہ غلیظ ترین بھیانک جھگیاں جو قائداعظم کے مزار کے آس پاس پھیلی ہوئی ہیں ۔اس شہر میں سفید فام غیر ملکیوں خصوصاً امریکیوں کی بہت بڑی نو آبادی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں بے انتہا خوب صورت کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان متوسط طبقے نے اپنی ساری تاریخ میں آج تک اس قدر زبردست خوشحالی حاصل نہیں کی تھی۔ یہاں نئے دولت مند متوسط طبقے کی حکومت ہے۔ان کا نیا سماج ان کے نئے اصول کراچی بے حد ماڈرن شہر ہے۔ یہاں روز رات کو اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں ایک جگمگاتی کائنات آباد ہوتی ہے۔ ماہرین عمرانیات کے لیے یہ مسئلہ انتہائی دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے کہ پچھلے نو سال میں کس طرح ایک نئے معاشرے نے اس ملک میں جنم لیا ہے ۔اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے اور روپیہ بناؤ اور دولت حاصل کرو۔آج بہتی گنگا میں ڈبکیاں لگالو، کل جانے گنگا خشک ہوجائے یا اپنا رخ بدل لے۔ تیسرا عنصر شدید ترین فرسٹریشن کا احساس ہے۔ بلیک مارکیٹیئے کو فرسٹریشن ہے کہ مزید بلیک مارکیٹ کیوں نہیں کرسکتا ۔بائیں بازو کا انٹلکچوئل روتا ہے کہ اب انقلاب کی کوئی اُمید نہیں ۔جماعت اسلامی والا چلا رہا ہے کہ مسلمان عورتیں بے پردہ گھوم رہی ہیں اور بال روم میں ناچتی ہیں۔ متوسط طبقے والی کی جان کو ہزار فکریں کھا رہی ہیں ۔سفارش کے بغیر نہ ملازمت ملتی ہے نہ بچوں کا اسکول اور کالج میں داخلہ ہوسکتا ہے نہ عہدوں میں ترقی ہوتی ہے اوپر سے بنگالی، اور پنجابی مہاجر اور مقامی آبادی کی کشمکش اعصاب پہ سوار ہے۔ یہ کش مکش اتنی شدید ہے جتنی غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلمان کی تھی کچھ لوگ کہتے ہیں آخری اُمید اب فوجی انقلاب میں باقی ہے۔

آگ کا دریا اور مہاجر

ایک جماعت مہاجرین کی کہلاتی ہے۔ یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر، قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی اس کا ہیڈ کوارٹر ہے ۔اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے۔ تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمہارے کلچر اور تمہارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیوں سوار ہو؟ چنانچہ یہ قوم مہاجر بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک مصیبت کا سامنا درپیش تھا، لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی، دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ لہذا ہر مہاجر نے کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے۔ بڑی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ اتر پردیش کی اس آبادی نے کس خوش اسلوبی سے اپنے آپ کو ٹرانس پلانٹ کرلیا ہے۔ اب یہاں جگہ جگہ ان کی کالونیاں قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں ، ادھر رسپوریوں کا جتھا ہے۔ وہ حیدر آباد دکن کے جانبازوں کا محلّہ ہے۔ اس طرف گڑھ والے، لکھنو والے، دلی والے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے مکان قرضہ لے کر بنائے گئے ہیں ۔ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے، لارنس روڈ، الٰہی بخش کالونی، جہانگیر روڈ، مارٹن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص ٹھوس مسلمان متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی دنیا ہے اور مہاجرین کی سماجی زندگی کی گویا ریڑھ کی ہڈی۔ ان کی لڑکیاں برقعے پہن کر بسوں میں بیٹھ کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی جاتی ہیں ۔ بندر روڈ پر خریداری کرتی ہیں۔ ریڈیو پر عورتوں کے پروگراموں میں حصہ لیتی ہیں۔ ویمنز نیشنل گارڈ میں پریڈ کرتی ہیں ۔ یہ طبقہ اب کراچی میں اس طرح رہتا ہے گویا صدیوں سے یہیں رہتا آیا ہے۔ یہ لوگ "جنگ" اور انجام اور "ڈان" پڑھتے ہیں۔ کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کچھے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں جس کو یہ اب تک " گھر" کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مراد آباد ہے، ملک پاکستان

اندھوں میں کانا راجا

دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے۔ پچھلے نو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے اور محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے اب قصہ "سوتے جاگتے کا" اس کے مقابلے

میں بالکل ہیچ سمجھو یعنی کل جو صاحب بالکل گمنام اور ہما شما قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ اُن کے ہاتھوں میں ہے۔ نہایت ادق بین الاقوامی سیاسی مسائل پر اس فراٹے سے اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ انتہائی معمولی قابلیت کے حضرات اقوام متحدہ اور دوسرے بڑے بڑے عالمگیر اداروں میں ملک کی نمائندگی فرماتے ہیں اور ہاؤلرز کرتے ہیں مگر کوئی برا نہیں مانتا۔ ان گنت خواتین و حضرات اندھوں میں کانے راجا بنے بیٹھے ہیں۔

پاکستانی بیگمات

اور خواتین! پاکستان کی بیگمات بھی دنیا کی عجائبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی ساڑھیاں، ان کے زیورات، ان کے ڈنر اور پارٹیاں، بیرون ملک میں ان کے سفر، ان کی زندگی کا عکاس اور گویا ان کی اوفیشل آرگن ماہنامہ "مرر" ہے جس میں ان کی دعوتوں کی تصویریں چھپتی ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان دراصل کس قدر ترقی یافتہ اور دولت مند ملک ہے جس کی آدھی آبادی صرف ڈنر اور ایٹ ہوم کھاتی ہے اور سمبا ناچتی ہے۔[۵۱]

یہ طویل اقتباس گویا زندگی، رویوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کو بیان کرتا ہے کراچی کی زندگی، مہاجروں کا مکمل بیان اس اقتباس میں ملتا ہے۔

اس اقتباس کو ملک عزیز کی موجودہ صورتحال کے تناظر میں دیکھیں تو بھی کوئی چیز نہ اضافی لگتی ہے نہ غیر متعلق۔ اس لیے اس طویل اقتباس کو پیش خدمت کیا ہے۔

ویسے سارا اقتباس آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے لیکن ملک عزیز کہ سب سے گھناؤنے رویے کی طرف قرۃ العین حیدر نے جو اشارہ کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے کہ

اس معاشرے کی بنیاد روپیہ ہے

آج اردگرد نگاہ دوڑائی جائے اور اس جملے کی ہم گیریت کے آثار دیکھے جائیں معاشرہ جس اخلاقی اور علمی گراوٹ کا شکار ہے اس کا خلاصہ گویا اس جملے میں مقید ہے۔ قرۃ العین حیدر نے گویا بیماری کی نشاندہی

۱۹۵۶ء کے آس پاس ہی کردی تھی ۔ کراچی کی معاشرتی زندگی کی سچی، جیتی جاگتی تصویر اس اقتباس میں گویا سمٹ آئی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے کراچی کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور معاشرتی حوالوں سے اپنے تجربات کی روشنی میں جو ناول تخلیق کیے ان میں کراچی کی ابتدائی جھلکیاں آنے والے دنوں کی گھمبیرتا کے اوّلین نقوش ہیں۔ کراچی جس کرب سے گزرا اور گزر رہا ہے اس کو اگر سب سے پہلے کسی نے پوری شدت سے سمجھ لیا تھا تو وہ لکھنے والے اور بالخصوص قرۃ العین حیدر ہیں۔ آگ کا دریا ، سیتا ہرن، ہاؤسنگ سوسائٹی ،اس کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ ناول ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو شرنارتھیوں کا دکھ بھی بڑی صراحت سے قاری کے سامنے رکھتے ہیں جو ہجرت کے وقت پاکستان سے ہندوستان پہنچے۔نام ومقام کے فرق کے ساتھ یہ لوگ اسی اذیت سے گزرے جو مسلمان مہاجرین نے برداشت کی۔

کراچی اپنی ہار نہ ماننے والی سرشت سے مجبور ہے اس شہر کے باسی اپنی معاشرتی زندگی کو رواں رکھنا جانتے ہیں شاید ہی پاکستان کا کوئی اور شہر اتنے کرب سے گزرا ہوگا جتنا کہ یہ شہر۔لیکن جینے کی نئی اُمنگ کے ساتھ اک نئے جذبے کے ساتھ اس کے رہنے والے تقسیم سے اب تک آگے بڑھتے چلے آئے ہیں۔اس باب کی ابتدا شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی سے ہوئی اور اختتام قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا پر ایک ناول نے ابتدائی معاشرت کے رنگ سامنے رکھے تو دوسرے نے مستقبل کا نقشہ کھینچا۔ دونوں فن پاروں کی درست تفہیم کراچی کی موجودہ زندگی کو سمجھنے میں ازحد معاون ثابت ہوتی ہے۔شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر نے اپنے وجدان سے جو کچھ دیکھا محسوس کیا وہ درحقیقت حال و مستقبل کا بیان تھا۔اس بیان کو اگر بروقت سمجھ لیا جاتا تو آنے والے خطرات سے بچا جا سکتا تھا پر افسوس ایسا نہ ہو سکا اور ایک دکھ بھرے راستے اور آتش وخون کی بارش سے گزرنے کے بعد پاکستان کے سب سے بڑے شہر کی اذیت کچھ کم ہوتی نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۱۱۰، ۱۱۱

۲۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۱۸۵، ۱۸۶

۳۔ ایضاً ص ۱۸۷

۴۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۱۵۶

۵۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۱۵ء ص ۹۸

۶۔ ایضاً ص ۱۳۷

۷۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۱۸۸

۸۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، رکتاب پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۵ء ص ۳۰۴، ۳۰۵

۹۔ ایضاً ص ۳۶۹

۱۰۔ ایضاً ص ۳۷۳

۱۱۔ ایضاً ص ۳۷۴

۱۲۔ ایضاً ص ۴۰۴

۱۳۔ ایضاً ص ۴۷۹

۱۴۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء ص ۳۸۲

۱۵۔ ایضاً ص ۴۳۵

۱۶۔ ایضاً ص ۴۵۸

۱۷۔ ایضاً ص ۴۶۰، ۴۶۱

۱۸۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۱۹۶،۱۹۵

۱۹۔ سید مظہر علی، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۶۴

۲۰۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۳۸، ۳۹

۲۱۔ ایضاً ص ۳۹

۲۲۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۲۶

۲۳۔ ایضاً ص ۳۶

۲۴۔ ایضاً ص ۱۸۳

۲۵۔ ایضاً ص ۱۸۶

۲۶۔ ایضاً ص ۲۳۳

۲۷۔ ایضاً ص ۲۳۴

۲۸۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء ص ۹۰

۲۹۔ ایضاً ص ۲۲۰

۳۰۔ ایضاً ص ۲۲۱

۳۱۔ ایضاً ص ۴۵

۳۲۔ ایضاً ص ۲۲۳، ۲۲۴

۳۳۔ ایضاً ص ۵۲

۳۴۔ ایضاً ص ۲۸۸، ۲۸۹

۳۵۔ ابن انشا، "چاکی واڑہ میں وصال"، مشمولہ: آج، خصوصی شمارہ نمبر ۵۲، مرتبہ، اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۵۱۸

۳۶۔ اشفاق احمد، "محمد خالد اختر"، مشمولہ: آج، خصوصی شمارہ نمبر۵۲، مرتبہ، اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ کراچی، ۲۰۰۵ء ص ۵۳۳

۳۷۔ طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، مکتبہ تخلیق ادب، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۲۸۳

۳۸۔ رمضان بلوچ، لیاری کی ان کہی کہانی، راحیل پبلی کیشنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۷ء ص ۹۳

۳۹۔ محمد خالد اختر، چاکی واڑہ میں وصال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۶ء ص ۴۹، ۵۰، ۵۱

۴۰۔ ایضاً ص ۲۵

۴۱۔ محمد خالد اختر، چاکی واڑہ میں وصال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۸۵

۴۲۔ ایضاً ص ۹۵

۴۳۔ ایضاً ص ۶۱، ۶۲

۴۴۔ ایضاً ص ۷۶

۴۵۔ ایضاً ص ۶۹

۴۶۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۱۹۱

۴۷۔ مشتاق احمد یوسفی، آب گم، جہانگیر بکس، لاہور، ۲۰۱۳ء ص ۱۰۲، ۱۰۳

۴۸۔ ایضاً ص ۱۰۹

۴۹۔ ایضاً ص ۴۴

۵۰۔ ایضاً ص ۴۵

۵۱۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۴۲۱، ۴۲۲

باب سوم

کراچی کی سیاست، معیشت اور اُردو ناول

کراچی کی معاشرتی ، تمدنی ، سماجی اور سیاسی زندگی کے کئی شیڈ ہیں۔ یہاں کے لوگ کثیر الجہتی ثقافتی بیک گراؤنڈ لیے ہوئے ہیں۔ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے پٹھان، بلوچستان کے بلوچ، اندرون سندھ کے سندھی، ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے بڑی تعداد میں مہاجر اسکا ثقافتی تنوع بناتے ہیں۔ ان تمام لوگوں کا رہن سہن، خوراک، بود باش، زبان اور معاشرتی رویے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ان کی اس زندگی کے باہم گھل مل جانے سے کراچی کا مشترکہ کلچر وجود پاتا ہے۔ اس کلچر کے وجود پانے میں معاشرت کے علاوہ مذہبی رنگ بھی شامل ہوتا جاتا ہے۔ کراچی میں پارسی، بوہری، بہائی، اہل تشیع کے ساتھ ساتھ ہندو، سکھ، عیسائیوں کی بھی ایک بڑی تعداد آباد ہے جو اپنے اپنے ڈھنگ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سب لوگ عرصہ دراز سے کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ انھوں نے کراچی کو ترقی دینے اور عالمی معیار کا شہر بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے نامور لکھنے والوں نے کراچی کے ان رنگوں کو اپنے افسانوں، ناولوں، کہانیوں میں جگہ جگہ پینٹ کیا ہے۔ تحقیق کے تیسرے باب میں کراچی سے متعلق مزید چار ناولوں کا انتخاب کیا ہے۔

ان میں کوکب جمیل کا مٹھی بھر ہوا، زاہدہ حنا کا نہ جنون رہا نہ پری رہی ، رضیہ فصیح احمد کا نصف صدی کا قصہ اور جوگندر پال کا خواب رَو شامل ہیں۔ ان ناولوں میں کراچی کی زندگی، کراچی کی معاشرت اور تمدن کا بھرپور بیان ہے۔ رضیہ فصیح احمد کا ناول نصف صدی کا قصہ ضمناً کراچی کے بارے میں بحث کرتا ہے لیکن باقی ماندہ ناول تفصیل سے کراچی کی رنگارنگ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔

کراچی ملک کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر ہونے کے ناطے منی پاکستان کہلاتا ہے۔ کراچی میں ملک کے کونے کونے سے لوگ معاشی تنگدستی کے مارے پہنچتے ہیں اور کراچی ان کی معاشی ضرورتیں پوری کرتے ہوئے بڑے سماج کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اکثر لوگ تلاش معاش کے لیے آتے ہیں اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کراچی کی کشش انھیں واپس نہیں جانے دیتی۔

مٹھی بھر ہوا کوکب جمیل

کوکب جمیل کا ناول مٹھی بھر ہوا قیام پاکستان سے لے کر دوسری فوجی حکومت (ضیاء دور) کے آغاز تک کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی حالات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد اور مشکلات کا بیان شوکت صدیقی یا مشتاق احمد یوسفی کے طرز پر تو نہیں کیا گیا لیکن آمد کے بعد اُن کی زندگیوں میں آنے والی تبدیلی مشاہدے میں آتی ہے۔

قیام پاکستان کے وقت اور بعد میں بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ دائیں بازو والوں کی زور آزمائی بھی نظر آتی ہے۔ سیاسی حالات میں جناب صدر ایوب خان کی آمد اور سیاست میں ان کی مشکلات کا دھیرے دھیرے بڑھنا، ذوالفقار علی بھٹو کی آمد روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ، مشرقی بازو کا ہم سے جدا ہونا اور دوبارہ مارشل لاء کا لگنا، یہ سب عوامل ناول میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

ناول کا پلاٹ سادہ ہے کہانی سیدھے سادھے انداز میں آگے بڑھتی ہے اور قدرے خوش کن انجام پر ناول ختم ہوتا ہے۔ بائیں بازو کی سیاست جو کراچی میں قیام پاکستان کے بعد اپنا ایک وجود رکھتی تھی۔ کراچی یونیورسٹی میں طلبہ تنظیمیں موجود تھیں جو بائیں بازو کی سیاست کرتی تھیں اور ان کا وجود بجا طور پر محسوس کیا جاتا تھا۔ یہ جماعتیں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ جماعت اسلامی کی آمد سے ان جماعتوں کے مابین ابتدائی جھڑپوں سے بات قتل وخون ریزی تک جا پہنچی اور ضیاء کے دور میں ان جماعتوں کے کارکنوں کو قید و بند بھی کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لوگ منظر سے ہٹتے چلے گئے اور مذہبی جماعتوں کا قبضہ ملکی سیاست پر آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔

کراچی میں معاشی ترقی کے امکانات اور سماجی رویوں پر اُن کا اثر

کراچی کی تاریخ بتاتی ہے کہ حب ندی کے کنارے کھڑک بندر کے بند ہو جانے کے بعد وہاں کے رہائشیوں نے سیٹھ بھوجومل کے ساتھ مل کر نئی بندرگاہ ڈھونڈنی شروع کی تو ان کی نظر موجودہ کراچی کے ساحلی علاقے پر پڑی۔ ان لوگوں نے یہاں پڑاؤ ڈالا اور یوں ایک چھوٹے شہر کی ابتداء ہوئی (یہ تاریخی تفصیل پہلے باب میں بیان کی جا چکی ہے) گویا کراچی کی ابتدا ہی لوگوں کی معیشت کو بہتر کرنے سے ہوتی ہے۔ انگریزوں کی آمد اور پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اس بندرگاہ کا کردار یہ سب ظاہر کرتے ہیں کہ اس شہر نے ہمیشہ لوگوں کی معیشت کو بہتر بنایا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جب لوگوں نے قافلوں کی شکل میں ہجرت کی تو ان میں سے اکثر کو کراچی ہی جائے پناہ نظر آئی۔ کراچی پہنچنے کے بعد ایک جدوجہد شروع ہوئی جس میں اکثر لوگ کامیاب ہوئے۔ کراچی کی شہرت "غریبوں کی ماں" کے طور سے ہوئی اور بعد میں ۱۹۶۰ء میں پٹھانوں کا ۱۹۷۱ء میں بہاریوں کا اور پھر افغان جہاد کے دوران افغانیوں کا یہاں پہنچنا دراصل کراچی کی غریب پروری کے سبب تھا۔

کوکب جمیل کے ناول مٹھی بھر ہوا کے مرکزی کردار علیم الدین جو علی میاں کے نام سے معروف ہیں ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ ناول ہجرت کے مصائب اور مہاجرین کی مشکلات سے متعلق زیادہ آگاہی نہیں دیتا۔ کراچی چونکہ اپنی بنیاد میں غریبوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے لہٰذا علی میاں جب کراچی پہنچے تو معمولی موٹر مکینک تھے لیکن کراچی کی غریب پروری سے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے ہوئے ایک بہت بڑے کاروبار کے مالک بن جاتے ہیں۔ علی میاں کی اس ترقی کے مزید عوامل اپنی جگہ لیکن کراچی میں آگے بڑھنے کے جو بے پناہ مواقع ہیں ان کا بھی اس میں کلیدی کردار ہے۔ کراچی ۱۸۴۳ء سے لے کر تا حال کبھی ساکت و جامد شہر نہیں رہا۔ اس شہر نے آگے بڑھنا اور نئے افق چھونا کبھی ترک نہیں کیا۔

علی میاں کو بھی کاروبار بڑھانے کے اکثر مواقع ملتے ہیں۔ جن سے وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ بڑھتی آبادی، معیاری چیزوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے جو تاجر ایمانداری اور خلوص نیت سے کاروبار کرے اس کی کامیابی یقینی نظر آتی ہے۔ شہر کی بڑھتی غذائی ضروریات کے پیش نظر جب اُن کے رفیق کار میاں نسیم الحق اُن کے سامنے کاروبار کو وسعت دینے کی بات کرتے ہیں تو شہر کی تیز رفتار زندگی کا تذکرہ بھی آتا ہے۔

کوکب جمیل لکھتے ہیں۔

> چنانچہ انھوں نے علی میاں کو ایک سکیم پیش کی کہ کراچی کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں اب روزمرہ کی طلب اور ضرورت کے طریقے بدل رہے ہیں اور وقت کی کمی بڑھ رہی ہے۔ نیچے سے اوپر تک کے طبقے کے لوگوں کی احتیاجات نئے روپ دھار رہی ہیں اس لیے کیوں نہ بسکٹ اور ڈبل روٹی اور اس کے متعلقات بنانے کا کارخانہ لگایا جائے۔ میاں نسیم الحق، علی میاں کے حضور اپنی ذہانت، لیاقت اور حسن کارکردگی سے وہ مقام تو پیدا کر ہی چکے تھے کہ ان کی کوئی بات یا تجویز جب کہ وہ فائدہ مند بھی ہو نہ ٹالی جائے۔ چنانچہ علی میاں نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام شروع کر دینے کی منظوری میاں نسیم الحق کو دے دی۔[1]

علی میاں، موٹر مکینک سے مٹھائی کے کارخانے اور پھر ہوٹلوں کے مالک اور کشادہ گھروں کی ملکیت حاصل کرنے کا سفر اسی کراچی میں طے کرتے ہیں۔ کراچی میں ایسے اکثر لوگ ملتے ہیں جن کی کہانی علی میاں جیسی ہو جو دو کپڑوں میں کراچی پہنچے اور اپنی ہمت اور محنت کے ساتھ ساتھ کراچی کی مہربانی سے بڑے بڑے تاجروں میں شمار ہونے لگے۔

ان بڑے بڑے سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ساتھ ساتھ ان کے حواری بھی معاشی منازل کو بڑی تیزی سے طے کرتے ہیں اور سیٹھ کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد خود ان کی زندگی بھی بڑی تیزی سے ترقی کی شاہ راہ پر دوڑتی نظر آتی ہے۔

سیٹھوں، ساہوکاروں اور تاجروں کے کارندے مٹھی بھر ہوا میں بھی جا بجا نظر آتے ہیں جو ان کی چھپر چھایا میں زندگی کے مراتب تیزی سے طے کر رہے ہوتے ہیں۔ میاں نسیم الحق اور علی میاں کے منشی رفیق احمد کے ساتھ ساتھ مذہبی طبقے کے نمائندے مولوی تفضّل حسین بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔

کراچی جو ۱۹۴۷ء میں مہاجرین کی آمد کے ساتھ ہی جھگیوں کی ایک بڑی بستی میں تبدیل ہو گیا تھا اب آہستہ آہستہ کروٹ لے کر چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔ جہاں یہ جھگیاں گھروں میں تبدیل ہو رہی تھیں وہاں ضروریات زندگی بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھیں۔

اب پرانے ساز و سامان کی جگہ گھروں کی آرائش اور ضروریات زندگی بھی بدل رہی تھیں۔ معاشرت کی یہ تبدیلی انسانوں کے رویے بھی تبدیل کر رہی تھیں۔ ضروریات زندگی کی تبدیلی سے متعلق ایک اقتباس۔

> انھوں نے گراموفون کو ریڈیو اور ریڈیو گرام پھر ٹرانزسٹر اور سینما کو ٹیلی ویژن میں بدلتے دیکھا تھا۔ مٹی کے کورے گھڑوں کے پانی کو ریفریجریٹر میں رکھی جانے والی بوتلوں میں بھرے پانی سے تبدیل ہوتے دیکھا تھا۔ بجلی کے پنکھے کی ٹھنڈی ہوا کو ائیر کنڈیشن کی بدن کو آسودگی سے زیادہ پہنچانے والی ٹھنڈک میں بدلتے دیکھا تھا۔[۲]

یہ اقتباس معاشرے میں در آنے والی تبدیلیوں کی روداد ہے۔ اس عمل سے لوگوں کی زندگیوں میں ایک تیزی پیدا ہوئی۔ شہروں کا اور خاص طور پر بڑے شہروں کا مزاج دیہاتوں سے خاصا مختلف رہا ہے۔ اگر اندرون سندھ، جنوبی پنجاب اور بلوچستان کے دیہاتی علاقوں کی زندگی دیکھیں تو ٹھہراؤ کی ایک کیفیت نظر آتی

ہے ۔لوگ اپنے معمول کے مطابق زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ زرعی زندگی، زرعی معیشت کے تحت لگے بندھے پیسوں سے اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ اس کے برعکس شہری زندگی میں ایک ہلچل ہر وقت بپا رہتی ہے۔

کراچی کی شہری زندگی بھی اس کُلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد ہوئی مہاجرین کی معیشت کا دارومدار تجارت اور سرکاری ملازمت پر تھا۔ ان کی ضروریات زندگی کے بڑھنے پر اضافی محنت مزدوری یا سرکاری نوکری کے علاوہ کوئی اور ذریعہ معاش ممکن نہ تھا۔ اس رویے کے تحت خاندان کے ہر شخص کو آمدنی بڑھانے میں اپنا حصہ ڈالنا پڑتا۔ شہری معاشرت کے اس بوجھ کی وجہ سے شہریوں کے رویے میں تبدیلی کا آنا ناگزیر تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ہندو پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان جا رہے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے کراچی ہندو اکثریتی شہر تھا۔ یہاں ہندوؤں کی تعداد ۹۶ فیصد تھی جو بعد میں صرف ۲ فیصد رہ گئی ۔ جب ہندو اور سکھ یہاں سے گئے تو ان کی جائیداد پر غیر قانونی قبضے شروع ہوئے ان کا کچھ احوال آب گم کے حوالے سے بیان ہو چکا ہے۔ مسلمان شہریوں نے ہندوؤں کی متروکہ املاک پر قبضے کیے اور ان کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کے حصول کے لیے تمام غیر قانونی کام کیے۔ اس رویے کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رہے کہ اکثر مہاجرین اپنا سب کچھ چھوڑ کر جب پاکستان پہنچے تو اُن کے خیال میں ان کے لیے یہ جائز تھا کہ اپنی جائیداد کے بدلے میں وہ پاکستان میں جائیداد حاصل کریں۔ اب جو لوگ کلیم نہیں لائے تھے انھیں جائیداد کے حصول میں مشکلات پیش آنے لگیں۔

معاشی بوجھ، ضروریات زندگی کا بڑھنا، آمدن کم ہونا یہ سب انسان کو بسا اوقات ایسے کاموں پر مجبور کرتے ہیں جو وہ نہیں کرنا چاہ رہا ہوتا۔ معاشی مجبوریاں بعض اوقات حرام، حلال کی تمیز بھلا دیتی ہیں۔

کوکب جمیل بھی انسانی نفسیات کی تصویر کشی کرے ہوئے لکھتے ہیں۔

> پاکستان میں مسلمانوں کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی آزادی ہوگی ۔ظاہر ہے اس جملے سے حق سوختگی ، حق تلفی اور بے راہ روی مراد نہیں تھی ۔لیکن جب یہاں اپنے چاروں طرف آنکھیں کھول کر دیکھا تو اُن کو کچھ ایسا نظر آیا کہ وہ جو اس سرزمین سے نہیں تھے اور تقسیم ہو کر دوسری طرف رہ جانے والے علاقے سے آئے تھے اور وہ جو اسی سرزمین کے تھے اور تقسیم کی

وجہ یہاں پر ہی انھیں رہنا تھا سب نے اس جملہ کا مطلب اپنی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق تیار کیے گئے سانچوں میں ڈھال کر نکالا تھا۔ تقسیم ہوجانے والے علاقوں سے آنے والے لوگ جو سرکاری ملازمتوں میں وہاں کم تر درجے کے تھے یہاں بہتر درجوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور جو اسی علاقے کے تھے وہ ان سے بھی آگے بڑھ کر اپنا حق سنبھال رہے تھے۔ ان کے نزدیک پاکستان کے قیام کا مطلب مسلمانوں کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے مواقع نصیب ہوجانا ہی اور زیادہ بلند مرتبے حاصل کرنا ہی مقصد مراد پاتا تھا۔ یہی حال تجارتی حلقوں سے متعلق لوگوں کا تھا جو ٹھیلہ لگاتے تھے، پھیری کر کے سامان بیچتے تھے وہ یہاں سے جانے والوں کی دکانوں، گوداموں، کارخانوں اور کوٹھیوں پر قابض ہو رہے تھے۔ اس میں باہر سے آنے والوں اور یہیں پر اپنے گھر میں رہنے والوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جو لوگ کبھی چھوٹی چھوٹی کچی بھٹیوں پر کچا لوہا پگھلاتے تھے وہ بڑے بڑے کارخانہ دار بن رہے تھے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے وہ طلبہ جو تحریک پاکستان کے نعرے لگاتے تھے سول حکام بن گئے تھے۔ لیکن سینوں میں وہ دہکتی آگ جو زمین کو کندن بنانے کے کام آسکتی تھی اب خواہش حصول جاہ و منزلت کی راکھ میں دب کر بجھنے لگی تھی۔ [۳]

لوٹ کھسوٹ کی یہ ابتدائی شکلیں تھیں جو اس ناول کے صفحات پر نظر آرہی ہیں۔ کراچی کا موجودہ منظر نامہ شاید ایسے ہی کسی پس منظر کا زائیدہ ہے۔ آنے والے وقتوں میں سب نے دیکھا کہ کراچی پر قبضے کی ایک جنگ چھیڑ دی گئی۔ گھروں، فلیٹوں، کارخانوں پر قبضے کرنے کی جو رسم قیام پاکستان کے بعد شروع ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ پورے شہر پر قبضے کی جنگ میں بدل گئی۔ خودغرضی، مفاد پرستی، حصول جاہ و منزلت کے لیے

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کی عملی شکلیں نظر آئیں۔ شروع میں بھتہ خوری، زمینوں پر قبضے اور آگے چل کر ٹارگٹ کلنگ، بم دھماکے اس شہر کو یکسر ملیامیٹ کر دینے کی کوشش تک کی گئیں۔ یہ سب شاید انھی ابتدائی ایام کے آفٹر شاکس ہیں جو آج تک کراچی میں محسوس کیے جارہے ہیں۔ سیاسی جماعتیں، مذہبی جماعتیں، کالعدم تنظیمیں غول در غول کراچی پر حملہ آور ہوئیں اور اس کو بھنبھوڑنے میں مصروف ہوگئیں۔

انسانی رویوں کی تبدیلی کا عندیہ کراچی پر لکھے گئے ناولوں میں جابجا نظر آتا ہے۔ خدا کی بستی

حکومت تک کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ضیاء دورِ حکومت میں اس عمل کو مزید توانائی فراہم کی گئی جس سے یہ اس قدر پھیل گیا کہ ملک کے طول وعرض سے مجاہدین کی ٹولیاں تیار ہونے لگیں۔

مٹھی بھر ہوا اس سارے عمل کی ابتدا کو بیان کرتا ہے۔ مذہبی طبقے نے جو عمودی اُٹھان بھری اس کی ابتدائی جھلکیاں مٹھی بھر ہوا میں نظر آتی ہیں۔ مولوی تفضّل حسین اسی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد دین کی خدمت سے منسلک تھے۔ مولوی تفضّل حسین ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ یہاں پہنچنے کے بعد علی میاں کے توسط سے آہستہ آہستہ مسجد اور مدرسے کی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ آگے چل کر سیاسی میدان میں اُترا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے خصوصی ہوم ورک بھی کر رکھا تھا تا کہ مناسب انداز میں اپنی سیاسی کامیابیوں کا سفر شروع کریں۔ مذہبی طبقے کی موجودہ اجارہ داری کے پیچھے بہت سارے عوامل ہیں۔ ان لوگوں نے مسجد اور مدرسے سے ابتدا کی اور پھر ایوان بالا اور ایوان زیریں ہر جگہ اپنا آپ منوایا۔ بلکہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ملک کے بڑے بڑے فیصلوں میں ان کی شراکت لازمی سمجھی جانے لگی۔ مذہبی سیاسی جماعتیں اس کی زندہ مثال ہیں۔ ان کی قومی اسمبلی کی نشستوں کی تعداد کبھی متاثر کن نہیں رہی لیکن ایم۔ایم۔اے کے پلیٹ فارم سے ان کو اقتدار ملا تو ان لوگوں نے اس قدر عملی سیاست کر کے دکھائی کہ بڑے بڑے جغادری سیاستدانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمان) گروپ کے مولانا فضل الرحمان اور جماعت اسلامی کے سابقہ امیر قاضی حسین احمد اس طرز سیاست کی زندہ مثالیں ہیں۔ ملکی سیاست کا منظر نامہ ان جماعتوں کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

اس طرز سیاست کی کامیابی میں کچھ کردار علامہ طاہر القادری اور موجودہ زمانے میں علامہ خادم حسین رضوی کی جارحانہ آمد سب کی ابتدائی جھلکیاں ناول مٹھی بھر ہوا میں ملتی ہیں۔

مذہبی اجارہ دار کیسے عام لوگوں کو اپنے دام میں پھنساتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے اپنا قد اونچا کرتے ہیں اس کے ابتدائی خط وخال ناول مٹھی بھر ہوا کے ذریعے نظر آتے ہیں۔

کوکب جمیل کا ناول مٹھی بھر ہوا اور نئی نسل

نئی نسل سے ہمیشہ پرانی نسل کو شکوہ رہا ہے۔ معاشرتی رویے شروع دن سے بدلتے رہے ہیں۔ نئی نسل کی اپنی دلچسپیاں اور مشاغل رہے ہیں۔ ناول کے دو مرکزی کردار منشی رفیق احمد اور مولوی تفضّل حسین دونوں کو نئی نسل سے شکوے ہیں۔ دونوں پرانی اقدار کی شکستگی پر حیران نظر آتے ہیں۔ منشی رفیق احمد کی صاحبزادی رفیقن

کو جب زبردستی علی میاں سے شادی پر آمادہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنے باپ سے بغاوت کا علم بلند کرتی ہے اور جب وہ باپ کی بات مانتی ہے تو باپ کو زندگی سے نکل جانے کا کہتی ہے۔

مولوی تفضّل حسین کے صاحبزادے مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہو کر نئی روشنی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پندار کی شکستگی پر دونوں بزرگ بے حد پریشان ہیں۔ یہ ایک ایسا دکھ ہے جو معاشرے میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ پرانی نسل کا یہ پرانا شکوہ ہے کہ نئی نسل پرانی اور عمدہ اخلاق سے دور ہوتی جارہی ہے۔ ہر نسل کو اپنا زمانہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں پر بھی کچھ ایسا ہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے جب دونوں بزرگ اپنی اپنی اولاد کے گلے شکوے ایک دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں تو مولوی تفضّل حسین اس موقع پر کہتے ہیں۔

> منشی جی ! ایک اور بات ہے۔ہم نے زمانے کی رفتار کو اس کے تقاضوں کو محسوس نہیں کیا۔ ہمارے کچھ خواب تھے بس اُن کو پورا کرنے کی دھن میں لگے رہے۔ ہمارے آس پاس نوجوان نسل میں جو تبدیلیاں زمانے کے بھنور پیدا کر رہے تھے ان کو ہم نے محسوس نہیں کیا۔ آج کا نوجوان ہمارے تجربوں کی حاصل زندگی نہیں گزارنا چاہتا وہ زندگی کو اپنے تجربوں کے سایہ عافیت میں گزارنا چاہتا ہے۔ ۵

مٹھی بھر ہوا اور ملک کی سیاسی صورتحال

مٹھی بھر ہوا قیام پاکستان سے لے کر صدر ضیاء کی آمد تک کے زمانے کے سیاسی حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ سارا زمانہ سیاسی ہلچل کا زمانہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہی ملکی سیاسی صورتحال دگرگوں رہی۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد گویا آفتوں نے پاکستان کو دیکھ لیا یکے بعد دیگرے حکومتیں اور وزیراعظم تبدیل ہوتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے مارشل لاء نافذ کر کے باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی اور پھر ۱۹۷۱ء کا دل دہلا دینے والا واقعہ جس میں بنگلہ دیش ایک جدا ملک بن گیا۔

صدر ایوب کے بعد جنرل یحییٰ کے مختصر زمانے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو آئے اور پھر ان کے دردناک انجام کے بعد صدر ضیاء نے مارشل لاء لگا کر ملک کو گویا اپنے قبضے میں کر لیا۔

ملک پاکستان کی سیاسی صورتحال شاید کبھی مثالی نہیں رہی۔ لیکن شروع کے کچھ سال تو گویا اقتدار کا

میوزیکل چیئر چل رہا تھا۔ایک کے بعد دوسرا وزیر اعظم تخت نشین ہوتا رہا لیکن سیاسی استحکام نصیب نہ ہوا۔اس کی قیمت قوم ادا کرتی رہی ہے۔

ناول میں صدر ایوب کے زمانے کا احوال بیان ہوا ہے۔صدر ایوب کے زمانے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ انتخابات وہ تھے جن میں فاطمہ جناح صدر ایوب کے مقابل تھیں۔پورے ملک میں کراچی اور مشرقی پاکستان سے صدر ایوب کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔کراچی نے صدر ایوب کو منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔کراچی کی اس گستاخی کی بہت سخت سزا دی گئی۔

کراچی ویسے بھی صدر ایوب کا پسندیدہ شہر نہیں رہا شاید اسی لیے ملکی دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔

کراچی سے جب صدر ایوب کی مخالفت میں ووٹ پڑے تو گوہر ایوب نے صدر ایوب کی ملک بھر سے فتح پر کراچی میں ایک جشن کا اہتمام کیا،اس جشن کے نتیجے میں کچھ لوگ اپنی جان سے گئے۔

کچھ دانش وروں کا ماننا ہے کہ متحدہ قومی موومنٹ اسی دن قائم ہوگئی تھی جب گوہر ایوب نے گویا ایک طرح کراچی پر لشکر کشی کی تھی۔کراچی کی اس گستاخی کی سزا شاید اب تک کراچی بھگت رہا ہے۔آمر کا ساتھ نہ دینا کتنا بڑا گناہ ہوتا ہے،کراچی کے باسی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔اس واقعے کا احوال مٹھی بھر ہوا میں کچھ یوں ملتا ہے۔

> ایوب خان اپنی بیوروکریسی کی شعبدہ گری سے محترم فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخابات جیتنے میں کامیاب رہے تھے۔کراچی میں ایک عرصے سے ایک خاص علاقے کے جو افراد تلاش روزگار میں آکر آباد ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار پر پوری طرح چھا گئے تھے۔پہلے گھروں کے ذاتی ملازم کی حیثیت سے ان کے نوعمر لڑکے کام کرتے تھے پھر ان کے بجائے مشرقی پاکستان کے افراد کا ریلا آکر اُن کی خالی جگہ پر کرتا گیا تھا۔صدارتی انتخابات سے پہلے بڑی افراتفری تھی کہ صدارتی انتخابات میں صدر ایوب کی کامیابی کے جشن نے کراچی کے ایک علاقے میں ٹرانسپورٹ کے کاروباریوں اور کارکنوں کے حوالے سے خون کی ہولی کھیلی گئی اور صدر ایوب کے حامیوں نے اس غلط روش کی ابتدا کی جس نے آگے چل کر ایک خطرناک اور خوفناک علاقائی افتراق کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔کرفیو بھی لگے اور راستے بھی

بند ہوئے۔خوف و ہراس کی فضا میں ہر گلی اور محلے میں راتوں کو احتیاط اور حفاظت کے لیے بجلی کے تاروں کو سہارا دینے والے لوہے کے کھمبے بھی بجائے جاتے رہے، مگر افسوس فسادات کے بھوت کو نہیں بھگایا جاسکا۔[۶]

کہتے ہیں کراچی کے حالات بگڑنے کی ابتدا اُسی جشن سے ہوئی جو صدر ایوب کی فتح پر منایا گیا تھا۔کراچی اور بنگلہ دیش دونوں نے صدر ایوب کو شکست دی اور دنوں نے سزا پائی۔صدر ایوب کے دور اقتدار میں وہ مطلق العنان رہے۔ان کی شخصیت ہی ملک کے تمام فیصلے کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے بعد حالات صدر ایوب کے ہاتھوں سے نکلنے لگے۔معاہدہ تاشقند کے بعد ذوالفقار علی بھٹو وزارت سے الگ ہوئے اور صدر ایوب کے لیے مشکلات میں اضافہ کرنے لگے۔طلبہ تنظیمیں بھی میدان میں کود پڑیں اور رفتہ رفتہ حالات صدر ایوب کے ہاتھ سے پھسلنے لگے اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ انھیں ملک کی باگ ڈور جنرل یحیٰی کے سپرد کرنی پڑی۔

اور صدر ایوب کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اپنے اقتدار کو تادیر قائم نہ رکھ سکے۔اس پس منظر اور اس کے نتائج پر بھی مٹھی بھر ہوا میں خاصا مواد موجود ہے۔

ایوب خان اپنی پروقار اور لوگوں پر چھا جانے والی شخصیت کے باوجود نڈھال ہو گئے تھے۔اور جلد ہی سیاسی طالع آزماؤں اور سول اور فوجی بیوروکریسی کی نئی چالوں نے ان کے قدم لڑکھڑا ڈالے اور حالات کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اُنھوں نے اب مکمل طور پر دوسروں کے کاندھوں کا سہارا لینا شروع کر دیا۔[۷]

مٹھی بھر ہوا ایک سادہ پلاٹ پر لکھا ہوا ناول ہے۔علی میاں، رفیقن سے شادی کرتے ہیں اور ان کی وفات پر ان کی اہلیہ ان کے کاروبار کو مزید وسعت دیتی ہیں اور کراچی شہر کے معاشی امکانات سے بے پناہ فائدہ اٹھاتی ہیں۔مذہبی طبقہ اپنی اہمیت بڑھانے میں مصروف ہے اور نئی نسل بیرون ملک تعلیم حاصل کر کے اپنے مستقبل کو مزید بہتر بنانے میں مگن ہے۔ناول مجموعی طور پر سیاسی حالات کو بیان کرنے کے ساتھ کراچی آنے والے مہاجرین کی معاشی ترقی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔سید مظہر جمیل اپنی کتاب آشوبِ سندھ اور اردو فکشن میں مٹھی بھر ہوا سے متعلق لکھتے ہیں۔

ایسے سیدھے سادھے پلاٹ میں تو کوئی ایسا کہانی پن نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی گھمبیر ناول

کی اساس اٹھائی جاسکتی ہو۔ یوں کہانی بیان کرنا ناول نگار کا اصل مقصد معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا واقعات کے اظہار میں ماجرائیت سے زیادہ گردو پیش کی تاثراتی فضا کی تشکیل پر زیادہ دھیان دیا گیا ہے۔ کہانی کے کرداروں کی سرگزشت میں ان کے عہد کی تصویر کشی ہی اصل مقصد و مدعا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان رویوں اور طرزِ زندگی کی کہانی جو ابتداء ہی سے بعض مہاجر خاندانوں نے حصول دولت کے لیے اپنائی تھی اور اس بنیاد کج پر سندھ کے شہری معاشرے کی بنیاد استوار ہوئی اور مآل کار مہاجروں کی آئندہ نسلوں کے ہاتھ کیا آیا؟ بس مٹھی بھر ہوا جو ہر چند نہیں ہوتی لیکن ہم اسے مٹھی میں بھینچے رہنے کی خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ۸

جوگندر پال کا ناول خواب رَو

جوگندر پال کا ناول خواب رَو ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی کہانی ہے۔ جوگندر پال نے لکھنو کے مہاجرین کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھنو ہندوستان میں ایک قدیم اور عظیم تہذیبی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے اپنے آپ کو اس شہر سے وابستہ ہونے پر بجا طور پر فخر کا ایک اظہار سمجھتے ہیں اور اس اظہار سے قطعاً نہیں چوکتے۔ سلطنتوں، شہروں، ملکوں کے باشندے اپنی جنم بھومی کی عظمت کے گن گاتے آئے ہیں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن جب اس احساس تفاخر سے کسی دوسرے کی عزت نفس پہ ضرب آئے تو اس بات کو اکثر پسند نہیں کیا جاتا۔ مہاجرین جب لکھنو، مراد آباد، دلی، کان پور، علی گڑھ، سندیلہ سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تو ان میں سے اکثر نے بہتے بہاتے کراچی کا رخ کیا اور کراچی مہاجرین کی ایک بڑی بستی بن گیا گو سندھ کے دوسرے شہروں جیسا کہ حیدر آباد، میر پور خاص میں مہاجرین کی ایک بڑی تعداد آج بھی آباد ہے لیکن سمندر کنارے بسے اس شہر میں مہاجرین بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اور مہاجرین کے حوالے سے صرف کراچی ہی ذہن میں آتا ہے۔

مہاجرین کی آمد سے سندھی معاشرے میں ہلچل مچ گئی۔ شروع میں تو مہاجرین کا خوش دلی سے استقبال ہوا لیکن رفتہ رفتہ یہ تعلق شکر رنجی کی حدوں کو توڑتا ہوا مغائرت میں بدل گیا۔

یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے عوامل کیا تھے؟ جوگندر پال نے مہاجرین کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سوالوں کے جواب تلاش کیے ہیں۔

مہاجرین کے ساتھ سندھ کے باسیوں کے رویے میں یہ تبدیلی کیسے آئی؟ کیوں آئی؟ اس کے بارے

میں ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ میں راہ نمائی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بقول زیادہ تر لوگوں نے سندھ اور بلوچستان کے لوگوں کو سمجھا ہی نہیں سندھی کیا سوچتے ہیں؟ بلوچ کیا چاہتے ہیں؟ یہ جانے بغیر ان کے بارے میں ان کی تہذیب وثقافت کے بارے میں نے جو اندازے قائم کیے ہیں ان اندازوں نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔لوگ اس گمراہی کی وجہ سے ان بھولے بھالے سندھیوں کی عزت نفس بری طرح مجروح کرتے ہیں، اُن کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں جس سے مسئلے بنتے اور بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ہندوستان کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ پنجاب اور سرحد اور بالخصوص ان کے وسطی علاقے قدیم زمانے سے حملہ آوروں اور فاتحوں کی گزرگاہ رہے ہیں چنانچہ اس علاقے میں کوئی اہم اور قابل ذکر مقامی حکومت کبھی زیادہ دیر قائم نہیں رہی ۔۔۔اس علاقے میں کوئی مضبوط مقامی نیشنلزم بھی جڑیں نہیں پکڑ سکا بلکہ اس کے برعکس یہاں کے لوگوں میں " گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں" کے مصداق نت نئے فاتحین کے ساتھ معاملہ کرنے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پیدا ہوگئی۔۔۔اس کے برعکس سندھ اور بلوچستان تاریخ کے دوران زیادہ تر الگ تھلگ رہے وہاں بیرونی فاتحین کا عمل دخل بہت کم رہا۔نتیجۃً وہاں مقامی نیشنلزم کی جڑیں بھی خوب گہری ہوئی اور تہذیبی اور ثقافتی روایات بھی پختگی کے ساتھ قائم ہوئیں۔مزید برآں وہاں کے لوگ مقامی سرداروں اور حکمرانوں کی تو بدترین غلامی کو بھی برداشت کرنے کے عادی بنے اس لیے کہ یہ مقامی سردار "خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری" کے مصداق اپنے مقاصد اور مفادات کے لیے مقامی نیشنلزم کو بھی استعمال کرتے رہے۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ سندھیوں اور بلوچوں میں بیرونی فاتحین اور بدیسی حکمرانوں کے خلاف ہمیشہ نفرت اور بغاوت کے جذبات موجود رہے۔[۹]

سندھ کے باسیوں کے بارے میں انگریزوں کے پھیلائے پراپیگنڈے نے بھی سندھیوں کو خاصا

بدنام کیا۔شاید یہی وجہ تھی کہ سندھ کے لوگ انگریز کی فوج میں کرائے کے سپاہی بننے سے انکاری ہو گئے تھے اور بدلے میں انگریزوں نے انھیں غیر عسکری قوم کا خطاب دے کر فوج کے دروازے ان پر بند کر دیے۔آج ملک پاکستان کی افواج میں بھی سندھیوں کا تناسب خاصا کم ہے۔سندھی کم گو، شرمیلا اور اپنی زبان وثقافت سے ٹوٹ کر پیار کرنے والا مٹی کا دلیر سپوت ہے۔

ان سب عوامل کو جانے بغیر جب مہاجرین اپنی مقفٰی زبان کے ساتھ اور چمکیلی بھڑکیلی تہذیب کے ساتھ یہاں پہنچے تو ارضی حقیقتوں کے ساتھ شناسائی نہ بنا پائے۔ یہاں کے لوگوں کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت ، بود باش، رہائش ، خوراک ، پھلوں اور سبزیوں تک کو نہ اپنا سکے اور صبح و شام ہائے لکھنو، ہائے دلی کی تانیں اُڑانے لگے۔

بجائے اس کے کہ سندھ کی مہربان دھرتی کا پانی پیتے ہی سندھ کے باسیوں سے گھل مل جاتے مہاجرین نے کراچی کو ہی لکھنو، ملیح آباد، دلی، آگرہ ،علی گڑھ بنانے کی ٹھان لی۔اس عمل نے وقتی طور پر تو انھیں ناسٹلجیائی تسلی فراہم کی لیکن اس کے نتائج ایک طویل عرصے بعد بہت بھیانک شکل میں سامنے آئے۔

ان عوامل کی وجہ سے آج بھی کراچی کی گلیوں میں جا کر دیکھیں فاروق ستار، مصطفٰی کمال ، وسیم اختر، بابر غوری آج بھی مہاجر ہیں ۔تقسیم کے ۷۰ سال بعد بھی یہ لوگ اپنے آپ کو اس دھرتی میں ضم نہ کر سکے بلکہ اپنا جداگانہ تشخص تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

بات صرف تشخص کی نہیں بعد کے دنوں میں سندھی، مہاجر، تصادم کی بنیاد بھی یہی ناسٹلجیائی احساس اور احساس تفاخر تھا۔ جوگندر پال نے خواب رَو میں ایسے ہی مہاجرین کی کہانی بیان کی ہے جو مسلسل خواب میں چل رہے ہیں اور جاگنے کو تیار نہیں گویا۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ناسٹلجیائی کیفیت کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والے منفی رویے

مہاجرین کی کراچی آمد، قیام پاکستان کے بعد ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔مہاجرین کے آنے سے کراچی کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوئیں ۔معاشرتی اور سماجی رویے نئے بننے لگے اور پہلے سے قائم رویوں پر سوال اٹھائے جانے لگے۔مہاجرین نے شہر کی ایک نئی شکل ،نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔اس تہذیب کی بنیاد جس مرکزی پہلو کے گرد تعمیر کی گئی تھی اس پہلو کا نام ناسٹلجیا تھا۔

گو کہ ہجرت اور ترک وطن ہمیشہ سے ناسٹلجیا کو جنم دیتا ہے۔ اس کے بارے میں سب لوگوں کا رویہ ہم دردانہ رہا ہے۔ لیکن یہ "ناسٹلجیا" جو مہاجرین اپنے ساتھ لائے تھے اس قدر شدید تھا کہ اس کی حدت اور تپش سے قدیم سندھی قدرے بوکھلا گئے۔ سندھ میں تقسیم سے پہلے بھی پنجاب اور بلوچستان سے لوگ ہجرت کر کے آئے تھے اور وہ لوگ سندھ کی ثقافت میں یوں رچ بس گئے تھے کہ اُن کو دیکھ کر فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ لوگ پنجابی ہیں یا سندھی۔

لیکن مہاجرین کا معاملہ سراسر مختلف تھا ان لوگوں کی مشکل یہ تھی کہ ان کو نئی زمین میں جڑیں بنانے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی اور شاید مہاجرین کی کوششیں بھی اتنی شدید نہیں تھیں جتنی کہ ہونی چاہیں تھیں۔ "ناسٹلجیا" کی اس کیفیت کا اظہار جوگندر پال کے ناول خواب رَو کی پہلی سطر سے ہی واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس ۱۱۸ صفحے کے مختصر ناول میں ہر جگہ بکھرا نظر آتا ہے۔ ناول کے شروع میں ہی جوگندر پال لکھتے ہیں۔

> یہ لکھنو ہے۔ ملک کی تقسیم پر جب لکھنو کے مہاجرین کراچی چلے آئے تو ذرا سنبھلتے ہی انھوں نے یہاں بھی وہی امین آباد کا چوک کھڑا کر لیا۔ ویسے ہی یہاں بھی چھ سات راستے ٹوپیاں ٹیڑھی کیے ادھر ادھر سے بیک وقت آ داخل ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ ساری دنیا ادھر ہی چلی آ رہی ہے۔ امین آباد میں آخر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی اور مہاجرین امین آباد کے گرد و پیش پاؤں جمانے لگے اور اس طرح ہوتے ہوتے پورا لکھنو آباد ہو گیا۔ صرف پرانا شہر ہی نہیں، پرانے شہر کے بطن سے پیدا ہو کر نیا نویلا شہر بھی نواح میں اپنی کھلواڑ کا سماں باندھنے لگا۔ کہتے ہیں کہ لوگ آتے جاتے ہیں مگر مقامات ہمیشہ وہیں مقام کیے رہتے ہیں، مگر یہاں تو مہاجرین دل ہی دل میں شہر کا شہر اٹھا لائے، کوئی اپنے گھر کی اینٹیں، کوئی جوں کا توں پورا گھر، کوئی ساری گلی، کوئی گلی سے باہر تیز تیز چلتی سڑک۔۔۔ جو بھی جس کے دل میں سمایا اور پھر جب کراچی پہنچ کر اُن کی سانس میں سانس آئی تو انھوں نے اپنے دلوں سے اینٹ اینٹ سارا شہر برآمد کر لیا۔ خدا جانے جہاں یہ شہر واقع تھا وہاں اب کیا رہ گیا ہوگا۔ یہاں تو اس کی پھبن کا یہ عالم ہے کہ کوئی کراچی کی سیر کو آئے تو اُس سے بار بار پوچھا جاتا ہے، کراچی میں لکھنو دیکھا۔[۱۰]

تقسیم کا عمل کبھی خوشگوار نہیں رہا اس عمل میں صرف زمین کا بٹوارہ نہیں ہوتا بلکہ یادیں، گاؤں، گلی، محلّہ، پنگھٹ، سکول، یونیورسٹی سب کے سب اس عمل سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ مہاجرین

اپنے کاندھے پر چھوٹے موٹے سامان کے ساتھ یادوں کی بڑی بڑی گٹھڑیاں اُٹھا لائے تھے اور جب یہاں آبادکاری شروع کی تو یادوں کی گٹھڑیاں کھول کھول کر نئی دنیا بسانی شروع کی۔ اس بظاہر نئی دنیا میں سب کچھ پرانا تھا، گلی، محلے، چوبارے، سڑکیں، یہ سب سجا کر انھوں نے کراچی میں میرٹھ، لکھنو، ملیح آباد، مراد آباد، اعظم گڑھ، الہٰ آباد اور امروہہ تک آباد کر لیے۔ وہی مساجد وہی امام باڑے غرض بس چلتا تو آسمان بھی وہی سر پر تان لیتے۔

یہ کیفیت جس سے مہاجرین دو چار تھے ارادی یا خود پر بزور مسلط کرنے والی نہ تھی بلکہ اُن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا کرتا لیکن مہاجرین نے خود کو اور اپنی نئی نسل کو اس کیفیت سے نکلنے ہی نہ دیا۔ جس کا نتیجہ کوئی اتنا خوشگوار برآمد نہ ہوا۔

ناسٹلجیا کی اس شدت نے مہاجرین کو اپنے خول میں بند کر دیا۔ جوگندر پال نے اس کیفیت کو بہت خوبصورتی سے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ دیوانے مولوی صاحب جو کہ ہمہ وقت لکھنو میں رہتے ہیں ایسا کردار ہیں جو خواب میں ہیں۔ جاگنے پر آمادہ نہیں آزادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی دیوانے مولوی صاحب نیند سے بیدار ہونے پر تیار نہیں۔

مولوی صاحب تو ایک کردار ہیں جو مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مہاجرین کے خول میں بند ہونے کے عمل کو کراچی میں جابجا آج بھی دیکھا جاسکتا ہے اس عمل نے اُنھیں کراچی، سندھ اور ملک کے دوسرے شہروں کے ساتھ قلبی لگاؤ پیدا کرنے ہی نہیں دیا۔

رہن سہن، بود باش تو ایک طرف یہ لوگ پھل، ترکاری تک اپنے علاقے کی پسند کرتے ہیں۔ آم کھانا چاہتے ہیں تو ملیح آباد کے اور امرود تو الہٰ آباد کے ہی کھانے لائق ہیں۔

گویا یہاں کی تہذیب کے ساتھ جو لگاؤ مطلوب تھا وہ بھی نہ بن پایا۔ جوگندر پال اس کی وجہ یاد ماضی کی اُس گرہ کو قرار دیتے ہیں جو تقسیم کے وقت ان لوگوں کے دل میں بندھ گئی تھی اور بعد میں وقت گزرنے کے باوجود وہ گرہ جوں کی توں بندھی رہی۔ اس گرہ کشائی کا مرحلہ تا حال نہیں آیا شاید مستقبل میں یہ لوگ خواب سے جاگ جائیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مہاجرین کو یہاں پر قبول عام حاصل نہیں ہوا اور زندگی ان پر تنگ کر دی گئی ہو تو وہ یاد ماضی میں رہنے پر مجبور کر دیے گئے ہوں اس میں یہ بات یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ مہاجرین کی پاکستان آمد اضطراری بھی تھی اور ارادی بھی۔ ارادی ہجرت کرنے والے حالات کا رخ متعین ہونے کے بعد ہی ہجرت کرتے ہیں۔ یعنی مہاجرین کو جب یہاں سر چھپانے اور رہنے کو ٹھکانے کے ساتھ ساتھ روزگار کے حصول کے ذرائع میسر ہوئے تو اُن کے باقی ماندہ عزیز و اقربا ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ان مہاجرین نے پاکستان آنے کے بعد جھگیوں سے چھوٹے بڑے فلیٹ تک کا سفر طے کیا اور آج قدرے آسودہ حال ہیں۔ ان کی اسی مادی ترقی کا احوال جوگندر پال بھی اپنے ناول میں دکھاتے ہیں۔ ایک جگہ بہت صراحت سے وہ یہی بات بیان کرتے نظر آتے ہیں کہ مہاجرین کی مادی ترقی قابل رشک ہے یعنی اس ناسٹلجیائی کیفیت جس کا وہ شکار ہیں کا سبب ان کا یہاں پر کسمپرسی کی زندگی گزارنا نہیں ہے۔

جوگندر پال لکھتے ہیں۔

> یہ نہیں کہ مہاجرین نے معاشی ترقی نہ کی ہو۔ معاشی طور پر تو وہ بعض اعتبار سے نہ صرف سندھیوں بلکہ دوسرے مقامی پاکستانیوں سے بھی بازی لے گئے ہیں اور محنت اور حکمت عملی سے صوبائی اور قومی سطح پر تجارت، کارخانہ داری، سرمایہ کاری اور نوکر شاہی میں برابر حاوی ہوتے چلے گئے ہیں۔ اتنے حاوی کہ لکھنو کے راستے ہر جانب سے کراچی میں کچھ اس طرح کھل گئے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ہی میرٹھ، مراد آباد، ملیح آباد، اعظم گڑھ یا الٰہ آباد پہنچتے ہیں۔ چار پانچ برس پہلے دیوانے مولوی صاحب کا چچیرا بھائی ہندوستان سے لکھنو اُن سے ملنے آیا تو اُسے حیرت سے اپنا دماغ اُدھڑتے ہوئے محسوس ہونے لگا۔[11]

اس معاشی ترقی کے باوجود نہ جانے کیوں مہاجرین کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دیار غیر میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اُن کی آتما وہ سکون نہیں پاتی جو ایک مقامی کو میسر ہے۔

اس بے قراری سے اُس رویے نے جنم لیا جو آگے چل کر سندھی، مہاجر فسادات اور زبان کے جھگڑے پر منتج ہوا۔ لسانی جھگڑے کی ابتدا اردو کی دیگر مقامی زبانوں پر برتری کی وجہ سے ہوئی۔ مہاجرین کی زبان کم و بیش اردو تھی گو کہ وہ اس کو اپنے مقامی لب و لہجے میں بولتے تھے لیکن بحیثیت مجموعی وہ اُردو لکھنے پڑھنے بولنے والے تھے۔ اس رویے کے مدنظر جب سندھی قوم پرستوں کی طرف سے سندھی زبان کو سکول اور کالجوں میں نافذ کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو لسانی، چپقلش اور کھینچا تانی نے زور پکڑا اور جب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں یہ قانون کی صورت نافذ ہوا تو مہاجرین نے اس کا ردعمل دیا جس سے اس مسئلے کی ابتدا ہوئی جسے آگے چل کر بڑی خون

ریزی کو جنم دینا تھا۔اس بے قراری نے مقامی، غیر مقامی کی تفریق کو جنم دیا۔ سندھ کے لوگ خود کو مقامی اور زمین کا جائز اور حقیقی وارث مانتے تھے جب کہ مہاجر اپنی قربانیوں کے پیش نظر اپنے آپ کو زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔مہاجرین کی طرف سے جب مقامی آبادیوں اور مقامی لوگوں کے زبان، کلچر، تہذیب کو فرسودہ اور نا قابل عمل سمجھا اور اپنی آپ، جناب کی تہذیب کو معیاری اور زیادہ مہذب گردانا تو دونوں قومیتوں کے درمیان دوری بڑھتی چلی گئی۔ یہ دوری جب زیادہ بڑھی تو پھر آپسی جھگڑے اور مناقشے بڑھتے چلے گئے۔اس مقامی، غیر مقامی تقسیم کے اشارے جوگندر پال کے ہاں ملتے ہیں۔اپنے ناول خواب رَو میں لکھتے ہیں۔

> کراچی کے مہاجرین کو یہی مشکل درپیش ہے کہ اپنے مقام سے عبارت ہونے کے باوصف مہاجرت پر مجبور ہوگئے اور ان میں سے اکے دکے تو صدمے سے پاگل ہوکر اپنے ذہنی تناؤ سے نجات پاگے۔مگر جو پاگل نہ ہوئے وہ بھی بوکھلائے ہوئے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کی ٹھمری کو سائیں بھلے شاہ کی کافیوں کے طرز میں چمٹے پر کیسے ترتیب دیں، جیسے بھی ہے دو جداگانہ سروں کی پرامن باشندگی تو ان کی باہمی ترتیب وتہذیب سے ہی ممکن ہے۔سارنگی اور چمٹا بذات خود کارگر کیوں نہ ہوں، اُن کے جداجدا سروں کے ناگہانی اجتماع پر یقیناً تصادم اور فساد کے شور کا ہی گمان ہوگا۔برصغیر کی آزادی اور تقسیم کی ہڑبونگ میں تو یہ شور دبا دبا رہا تاہم اس ہمہ گیر ہڑبونگ کے بعد جب پہرے اور پولیس کے ضوابط کا انعقاد ہونے لگا اور مہاجرین کے پاؤں جمنے لگے تو یہ شور وشغب واضح طور پر سنائی دینے لگا۔انہی سالوں میں نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ مقامی اور غیر مقامی شہریوں کے فسادات اور شور وشغب کے سوا کہ مقامی اور غیر مقامی جہاں خاموشی طاری ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ کسی لحظہ دھماکے سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔[۱۲]

یہ اُس لسانی جھگڑے کی ابتدائی آہٹیں ہیں جو ناول نگار سن رہا ہے اور بعد کے حالات جوگندر پال کو درست ثابت کرتے ہیں۔مہاجرت کے دکھ، آلام اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں جن کو کسی طور جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے لیکن مقامی لوگوں کو اگر ہر وقت قیام پاکستان کے وقت اپنے آباؤ اجداد کی قربانیوں کے راگ سنائے جائیں تو ان کے کان اس راگ کی شدت سے پک جائیں گے۔کچھ ایسا ہی ہوا۔مہاجرین اپنے دکھوں کے سیلاب میں اس بات کو فراموش کر گئے کہ مقامی لوگ بھی جذبات رکھتے ہیں ان کے جذبات کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔مہاجرین نے کبھی خود کو اس دھرتی میں پیوست کرنے کی کوئی شعوری کوشش بھی نہیں کی۔

جس کے نتیجے میں حالات میں کچھ سدھار آتا۔ ان کے ناسٹلجیا کی رویے نے منفی رویے جنم دیئے جو دونوں قومیتوں کو بھگتنے پڑے۔

احساس تفاخر اور زمینی رویوں سے گریز

مہاجرین کے ہاں دوسرا رویہ اپنی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی برتری کا بھی تھا۔ سندھ کی تہذیب زرعی تھی اور کراچی کے علاوہ باقی ماندہ شہروں میں یہ زرعی تہذیب ہی سندھی ثقافت و کلچر کا اظہار تھی۔ اس کے برعکس مہاجرین شہری علاقوں سے آئے تھے اور ان میں سے اکثر زرعی پس منظر نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے جب یہاں کہ لوگوں کو دیکھا تو مرتبے، حیثیت کے علاوہ ان کی زبان، رہن سہن، لباس غرض ہر چیز کو اپنی تہذیب سے پس ماندہ پایا اور بقول مہاجرین کے انھوں نے آکر لوگوں کو نیا شعور دیا۔ آگہی دی۔

یہ بات درست بھی ہوسکتی ہے لیکن اگر اس کا اظہار درشتگی اور نفرت سے کیا جائے تو یہ بذات خود ماحول میں زہر گھولنے والی بات ہوگی۔

جوگندر پال کے ناول سے مثال دینے سے قبل مہاجرین کے احساس تفاخر اور تکبر کی ایک مثال ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں کچھ یوں دی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ میں رقم طراز ہیں۔

> اردو اور سندھی کی اس بحث میں شدت اور تلخی پیدا کرنے میں مہاجر بھائیوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ، کچھ دخل ان کے احساس برتری اور اس کے جا و بے جا اظہار کو بھی حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اہل سندھ کے بظاہر سادہ اور دیہاتی طور طریقوں میں مضمر اعلیٰ تہذیبی اقدار کو نہیں دیکھ پائے بلکہ انھوں نے دہلی، لکھنو اور حیدر آباد دکن کی تکلف سے مرصع اور تصنع سے مزین تہذیب ہی کو معیاری گردانتے ہوئے قدیم سندھیوں کو بنظر استحقار دیکھا، یہاں تک کہ ان کا مذاق اُڑانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ یہ طرز عمل ان میں سے بعض زیادہ مہذب لوگوں کا پنجابیوں کے ساتھ بھی رہا جنھیں وہ ازراہ تفنن "پنجابی ڈھگے" کہتے ہیں) اسی طرح انھوں نے اپنے اہل زبان ہونے کے گھمنڈ میں سندھی زبان وادب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اگرچہ اندرون سندھ مہاجرین کی نئی نسل اب سندھی زبان میں بلاتکلف گفتگو کرلیتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام بول چال کی زبان کا استعمال اور شے ہے اور کسی زبان کے

اعلیٰ ادب کا ذوق پیدا ہونا اور اس میں علمی و ادبی تقریر پر قادر ہونا بالکل دوسری بات ۔ بہر حال اس کا ردعمل مقامی سندھی آبادی میں شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔[۱۳]

عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ بیان میں کچھ مبالغہ ہو یہ بھی ممکن ہے انھوں نے درست نتائج کا استنباط نہ کیا ہو لیکن ان کے بیان کو کلی طور پر رد کرنا بھی ممکن نہیں کیونکہ جوگندر پال کے ناول کا متن اس بیان کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔

مہاجر احساس تفاخر یا احساس برتری کئی سطحوں پر تھا۔ تہذیبی، لسانی حوالے تو موجود ہی تھے لیکن پھل، ترکاری تک میں یہ جذبہ سرایت کر گیا تھا۔ آم ملیح آباد کے اور امرود الہٰ آباد کے۔

اسی تہذیبی برتری کو جوگندر پال ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں۔

> قبلہ مولوی صاحب ! کیا عرض کروں؟ مجھے تو معلوم ہو رہا ہے ہمارا اصل لکھنو دراصل یہیں واقع ہے اور آپ نے ہمارے یہاں سے مہاجرت نہیں کی، شاید ہم ہی لوگ یہاں سے وہاں چلے گئے۔ دیوانے مولوی صاحب کے چچیرے بھائی نے اپنے نکتے پر داد طلب کرتے ہوئے اُن کی طرف دیکھا۔ ہم کہیں سے کہیں نہیں آئے برادر۔ دیوانے مولوی صاحب کو کھٹکا ہوا کہ ایک اور پاگل سے پالا پڑ گیا ہے۔ آنا جانا تو ٹورسٹ کا کام ہوتا ہے۔ ہمارا لکھنو واحد لکھنو ہے ہم کسی اور لکھنو کو تسلیم نہیں کرتے ۔ آیا سمجھ میں؟ اُنھوں نے اپنے مہمان کو زعفرانی زردے کا پان پیش کرنے کے لیے اُس کی طرف اپنی چاندی کی ڈبیا بڑھائی۔ اور مزید سنیے لوگ بھی دراصل مقام سے عبارت ہوتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو منہ کھول کر دکھاؤں؟ یہ دیکھیے ارے حضرت اور قریب آ کر دیکھیے میرے گلے میں نواب آصف الدولہ کی ٹھمری کی محفل جمی ہوئی ہے۔[۱۴]

یہ جو ٹھمری کی محفل ان کے گلے میں جمی ہوئی ہے وہ تہذیبی و ثقافتی برتری ہے جس نے ان لوگوں کو سندھی تہذیب و ثقافت میں یک جان ہو کر اس زمین کے سپوت بننے سے روکے رکھا ہے۔ کیا کبھی ان لوگوں نے یہ سوچا ہے کہ جس زمین پر آ کر انھوں نے آگرہ، علی گڑھ، مراد آباد، لکھنو بسا لیے ہیں اس زمین کی ایک ہزاروں سال پرانی تاریخ ہے۔ جس سے کلچر، ثقافت اور ایک تہذیب و تمدن نے جنم لیا ہے۔ کیا اس پر یہ گراں نہیں گزرے گا؟

مہاجرین نے ان کی زمین پر اُن کی مرضی کے بغیر اپنی دنیا بسالی اب یہ توقع کرنا کہ آپ کی اس دنیا کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائیں جائیں تھوڑی زیادتی کی بات ہے۔

تہذیبی برتری کے بعد معاشرتی، خاندان برتری کا کچھ احوال بھی پیش کیا جائے گا۔ مہاجرین نے یہاں آباد ہونے کے بعد کوشش یہی کی کہ ان کی خاندانی زندگی اس نہج پر چلتی رہے جیسا کہ پہلے بھی یعنی اپنے ہی خاندانوں میں رشتے دیے اور لیے جائیں۔ ظاہر ہے جب اولاد بڑ ہوگی تو اس کی مرضی ومنشا بھی کچھ ہوگی۔

ناول میں ایسے دو واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں خاندان سے باہر شادی ہوتی ہے۔ ان دونوں شادیوں کو قبول تو کیا جاتا ہے لیکن بڑے بھاری دل کے ساتھ گویا یہ لوگ ہماری برابری کے تو نہیں پر کیا کریں مجبوری میں ہمیں اس بات کو قبول کرنا پڑ رہا ہے لیکن اب ماحول کافی بدل چکا ہے اور مہاجرین کو اس حقیقت کو ماننا پڑ گیا ہے کہ ان کی اولاد اب اس خیالی دنیا میں نہیں رہ پائے گی جس کو انھوں نے اپنے تصور میں بسا رکھا ہے۔ اس سے بھی حالات بہتر ہونے کی کچھ اُمید ہو چلی ہے۔ جوگندر پال خواب رَو میں ایسی ہی ایک شادی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> دو ساون پہلے یہی تو ہوا۔ حکیم صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے ہاشم علی کی سب سے بڑی بیٹی شہزادی ایک صبح منہ اندھیرے باغ میں آنکلی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی جھولے تک پہنچ پائے۔ ایک پکا ہوا آم اپنی جان پر کھیل کر اُس کے سر پر آگرا۔ رک جاؤ بی بی! مگر وہ سننے والیوں میں تھوڑا ہی تھی۔ اپنے جھولے پر آنکی تو دم لیا اور ذرا دم لے کر دو چار جھٹکوں میں ہی جھولے کو اتنا اونچا کھینچ لے گئی کہ دھڑام سے حویلی کی دیوار سے باہر جا گری اور پھر وہاں سے ایک کالے کلوٹے کوے کے پروں میں چھپ کر چشم زدن میں پُھر سے اُڑ گئی۔ حکیم صاحب نے اپنی پوتی کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کیا پھر بھی کامیاب نہ ہوئے مگر کوے تو مقامی ہی ہوتے ہیں۔ چھ آٹھ ماہ میں وہ آپ ہی اپنی دلھن کو لے کر آپہنچا۔ حویلی میں واویلا مچ گیا۔ حکیم صاحب اُن کے نکاح کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ تھے۔ [۱۵]

اس شادی کو تسلیم کرنا پڑا اور آگے چل کر شہادت بتاتی ہے کہ شہزادی کا فیصلہ درست تھا۔ خاندانی وجاہت وبرتری والے معاملے کو دیکھیں تو لازماً مہاجرین کو ان کے بقول سمجھوتے کرنے پڑے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہاں کے لوگ گنوار بھی تھے اور بدتہذیب بھی لیکن زمینی حقیقوں سے گریز کا رویہ ان کے درمیان موجود

رہا جہاں تک ہوسکا اس رویے کو مہاجرین نے نبھایا۔ مہاجرین کے ہاں خواب رَو کے حوالے سے ایک رویہ جو محسوس کیا گیا ہے وہ یہ تھا کہ مہاجرین صرف انھی کو مہاجر مانتے ہیں جو اُتر پردیش سے ہجرت کر کے آئے وہ لوگ جو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب یا پھر پنجاب سے ہجرت کر کے کراچی پہنچے اُن کا مہاجر ہونا ان کے نزدیک مشکوک ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟

اصل میں مہاجرین کے نزدیک مہاجر ہونا ایک خاص طرح کے مرتبے کا حامل ہونا ہے اور ہما شما اس مرتبے کے اہل نہیں اور اُتر پردیش کا ٹھپا ہی گویا مہاجر ہونے کی مضبوط سند اور دلیل ہے۔ اسی لیے مہاجرین آج ستر (۷۰) سال گزرنے کے باوجود بھی شناخت کے مسئلے سے نکل نہیں پائے کبھی اپنے آپ کو پانچویں قومیت کہتے ہیں کبھی جدا صوبے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن انھیں تسلی نہیں ہوتی۔ سوچتے ہیں بات ادھوری ہے۔ پوری نہیں ہوئی۔

بات پوری تو جبھی ہوگی جب وہ خود کو اس مٹی میں ضم کریں گے۔ اس کے سپوت بنے گیں، جب کہ مہاجر اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی خود کو مہاجر ماننے پر مصر ہیں۔ یہ قدیم سندھی اور جدید سندھی تو ان کا ایک سیاسی حربہ ہے جو ناکام ہوگیا ہے۔

سیاسی جماعت بنانا اس کے ذریعے کامیابی حاصل کرنا، شہر کو قبضے میں کرنا، یہ سب کچھ کرنے کے باوجود مہاجر قومیت اس مسئلے کو حل نہیں کر پائی کہ وہ کون ہیں۔ ان کی تیسری نسل جوان ہے آگے بڑھ رہی ہے۔ امکانات لامحدود ہیں اس نسل کے سامنے لیکن آج بھی گلی کوچوں اور محلوں سے ایک ہی صدا آتی ہے کہ مہاجر کے ساتھ زیادتی، مہاجروں کے حقوق گویا ستر سال پہلے جہاں سے سفر شروع کیا تھا آج بھی تیسری جوان نسل وہیں کھڑی ہے۔ خدا جانے یہ دائروں کا سفر کب ختم ہوگا۔

اسی تناظر میں ناول میں پیش آنے والی ایک دلچسپ صورتحال کا تذکرہ جس میں گھریلو خاتون خانساماں کے مہاجر ہونے پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ جوگندر پال لکھتے ہیں۔

"اتنے میں چاند بی بی بھی برآمدے میں آ گئی ہے۔

کون آیا ہے اچھی اماں؟

اسحٰق نے نیا باورچی بھیجا ہے۔

اچھی بیگم کی بہو پہلے تو جگمگا اُٹھی ہے مگر سائیں بابا کا معائنہ کر کے بدلی کی لپیٹ میں آ گئی ہے ۔یہ تو کوئی سائیں ہے۔

میرا نام سائیں بابا آہے بی بی سائیں۔

تو پھر کھانا وانا کیسے بناؤ گئے؟ چاند بی بی اپنی ساس کے پہلو میں ایک کرسی میں بیٹھ گئی۔

ہم ویسا نہیں کھاتے، جیسا تم لوگ کھاتے ہو۔

(آگے چل کر یوں گفتگو ہوتی ہے)۔

غور سے سنوں نہیں بابا اتنے بڑے گھر کا معاملہ ہے ۔ہم یہاں صرف اپنے لوگوں کو ہی رکھتے ہیں۔آپ مجھے رکھ لیں گی بڑی بی ۔سائیں تو آپ کا نمک کھا کر میں کوئی گیر تھوڑا ہی رہوں گا۔میں دوسری بات کر رہی ہوں۔ چاند بی بی اُسے سمجھانے لگی۔ وفاداری کی بات ۔اس لیے ہم مہاجروں کے سوا کسی کو نوکر نہیں رکھتے۔اوہو چھوٹی بی بی سائیں میں بھی مہاجر ہوں۔(اچھی خاصی جرح کے بعد) اچھی بیگم نے چڑ کر کہا قصہ کوتاہ، تم مہاجر نہیں ہو۔

(یہ خاصا طویل اقتباس ہے اسے کاٹ پیٹ کر پیش کیا گیا ہے اب اس کے اختتامی حصے کا احوال اس گفتگو کے اختتام پر دیوانے مولوی صاحب تشریف لاتے ہیں اور سائیں بابا کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں)۔

پھر وہ سائیں بابا کو دیکھ کر چونکے ہیں ۔کون ہو میاں؟

میں آپ کا نیا باورچی ہاں۔ بڑے مولوی سائیں۔

اچھی بیگم نے انھیں بتایا کہ سائیں بابا کو اسحٰق مرزا نے بھیجا ہے اور اُس نے اسے کام پر رکھ لیا۔ دیوانے مولوی صاحب نے سائیں بابا کا بغور جائزہ لیا ہے اور کہا سندھ، وندھ کے معلوم ہوتے ہو بھیا؟ جی ہاں بڑے سائیں۔

کیا تم لوگوں کو اپنے دیس میں کام وام نہیں ملتا؟

کام تو بڑی مشکل سے ملتا آہے سائیں۔ سائیں بابا کی سمجھ میں نہ آیا کے دیوانے مولوی

صاحب اُس سے کیا جواب طلب کررہے ہیں۔ اسی لیے سندھی اور پنجابی مہاجرین کی کثیر تعداد ہمارے نواح میں آبسی ہے۔

وہ اچھی بیگم کے پیچھے دروازے کی طرف ہوتے ہوئے ایک بار پھر سائیں بابا کی طرف مڑے ہیں۔ خوب جی لگا کر کام کرو بھیا، لکھنو بڑی قسمت والوں کو بلاتا ہے۔[۱۶]

یہ طویل اقتباس پیش کرنے کی وجہ بیان کی پوری معنویت بیان کرنا تھی۔ مہاجر صرف ہم ہیں، ہم ویسا نہیں کھاتے، وفاداری کی بات ہے۔ سندھ وندھ کے معلوم ہوتے ہو۔ غرض جملوں کی پوری قطار ہے جو اپنا ماضی الضمیر چیخ چیخ کر بیان کررہی ہے۔ یہی وہ تہذیبی، تمدنی، ثقافتی برتری کا احساس ہے جس کی وجہ سے سندھ وندھ کے لوگوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

اس اقتباس کے بعد مہاجرین کے اُن اِکا دُکا کرداروں کا بیان جو قدرے مختلف اور زمینی حقائق سے پوری شناسائی رکھتے ہوئے خود کو سندھی تہذیب وتمدن کے حوالے سے دیکھتے ہوئے اک نئی پہچان بنانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

اسحاق مرزا خواب رَو کا ایک منفرد کردار

اسحاق مرزا کے کردار پر گفتگو کرنے سے قبل ایک تعارفی پیراگراف خواب رَو سے جو بعد کی گفتگو کے لیے تمہید ہے۔

اسحٰق مرزا کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا اور یہیں پڑھا لکھا۔ کراچی یونیورسٹی سے قانون میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھر والوں کی کڑی مخالفت کے باوجود ایک سندھی لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا تھا۔ اسی زمانے سے اپنے لکھنو سے دور اپنی فیملی کے ساتھ سندھیوں کی ایک پرانی بستی میں رہ رہا ہے۔ شادی کے بعد دو ڈھائی سال اُس نے اپنے لوگوں کا منہ تک نہ دیکھا پھر جب اُس تک خبر پہنچی کہ اس کی جدائی میں اچھی ماں کو غش آتے رہتے ہیں تو لکھنو آنے جانے لگا۔[۱۷]

اسحٰق مرزا کی فطرت کیسے تبدیل ہوئی؟ یا وہ شروع سے مختلف طبعیت کا مالک تھا؟ اس بارے میں جوگند رپال کا قلم خاموش ہے۔ لیکن بسا اوقات حادثات، حالات انسان کی ذہنی تشکیل میں خاص کردار ادا کرتے ہیں اور بعض اوقات ایک واقعہ ساری زندگی کی راہیں تبدیل کرکے رکھ دیتا ہے۔ اسحٰق مرزا ایسا ہی منفرد کردار ہے جو

نہ صرف خود زمین سے جڑنے کا خواہش مند ہے بلکہ اس کی اپنے گھر والوں کے ساتھ اس معاملے پر اچھی خاصی بحث ہوتی ہے اور وہ ان کو پاکستان بنانے کے مطالبات کیا تھے؟ اور اب ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ جیسی بحثوں میں مشغول نظر آتا ہے۔

لازماً مہاجرین میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو قدرے مختلف سوچتے ہوں گے۔ اسحٰق مرزا اُنھی کرداروں میں سے ایک ہیں۔ اپنے بھائی اور مولوی صاحب سے اسحٰق کی ایک دفعہ کی بحث کا حال جوگندر پال کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> "دیکھو بھائی اور بھائی جان آپ بھی سوچیے ہم کیونکر حق بجانب ہیں کہ ان کی زمین اور جھونپڑے اُنہی کے پیسوں سے خرید کر اپنے لکھنو اور ملیح آباد بسا لیتے ہیں۔"[۱۸]

آگے چل کر اپنے ماموں زاد بھائی ہاشم کو خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

> کیوں بھائی ہاشم، اب اندازہ ہوا کہ سندھی حضرات ہمیں دیکھ کر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں۔ ہاں بھئی اور کیا ہمارے لکھنوی اہتمام کی بدولت اہل لکھنو کو تو یہاں پہنچ کر اپنا گم شدہ لکھنؤ مل جاتا ہے مگر مقامی لوگ اپنے شہر کا سراغ کہاں سے پائیں۔ غضب خدا کا، اُن کا شہر تو عین اپنے مقام پر کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔ کیوں اور کہاں غائب ہو گیا۔[۱۹]

اسحٰق مرزا کا نکتہ نظر خواب میں چلنے والوں کی سمجھ میں آنے سے رہا اس لیے اس کے ساتھ بحث تو کرتے لیکن اس کی باتوں کو دل سے تسلیم کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ اپنے احساس برتری کو یوں اتنی جلدی زمین پر پٹخ دینا اتنا آسان کام تو نہیں۔ مہاجرین نے پاکستان میں اپنی جو الگ دنیا بسائی تھی وہ ستر سال بعد بھی اس میں مگن رہنا چاہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے ساتھ گھلنا ملنا اور ان کو اپنے دکھ درد کا ساجھی بنانا انھوں نے ابھی تک نہیں سیکھا لیکن حالات سدا ایک جیسے نہیں رہتے۔

مقامی لوگوں کو جو خوف اور خدشے تھے ان میں سب سے بڑا خود اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو جانا اور تہذیب و ثقافت اور زبان سے ہاتھ دھو بیٹھنا بھی تھا۔ مقامی لوگوں کی نفسیات دفاعی نوعیت کی تھیں لیکن جب دفاعی پوزیشن سے کام نہ بنا تو مقامی لوگوں نے مہاجرین کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ اور بڑھتے بڑھتے بات دنگے فساد تک جا پہنچی۔ ماہر نفسیات ہی ان گتھیوں کو کھول سکتے ہیں۔ لیکن جوگندر پال کا ایک اقتباس جس میں مقامی لوگوں کی نفسیات اور اکثریت سے اقلیت بننے کا غم بیان ہوا ہے۔ اقتباس سے پہلے یہ

بات بتانی ضروری ہے کہ تقسیم سے پہلے کراچی ہندو اکثریت کا شہر تھا اور شہر میں ۹۶ فیصد ہندو بستے تھے اور جو تقسیم کے بعد ۱۹۵۱ء تک صرف ۲ فیصد رہ گئے تھے۔

> ایک ہی سماج کے لوگ اگر مقامی اور غیر مقامی میں بٹ کر رہ جائیں ہاشم! تو فرقہ واریت ایک مستقل عذاب کی صورت کھڑی کیے رکھتی ہے۔ مثلاً غیر مقامی جب مقامی ہو جاتے ہیں تو مقامیوں کے غیر مقامی ہونے کی باری آجاتی ہے۔ چند ہی روز پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے لاکلب کے سالانہ ڈنر میں بہت سے وکلاء جمع تھے اور خوب ہنس کھیل رہے تھے اور ہمارے اتنے بڑے ہنستے کھیلتے مجمع میں ایک واحد شخص تھا جو منہ دبائے بیٹھا تھا اور شاید کوئی منجھا ہوا وکیل ہونے کے باوجود صرف ہاں میں ہاں ملانے کے لیے اپنا سر ہلا دیتا تھا۔ میں سبھوں کو چھوڑ کر اس کی طرف سرک آیا اور اپنا تعارف پیش کیا۔ جواباً اس نے بھی اپنا نام بتایا۔ چندانی نام کا کوئی ہندو جج تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس کے سارے رشتہ دار ہندوستان چلے گئے تھے۔ مگر اس کا اصرار تھا کہ سندھو دیش ہی اس کا اصل مقام ہے۔ کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں میرے بھائی کہ اُس وقت ساری محفل میں ایک وہی شخص غیر مقامی معلوم ہو رہا تھا۔[۲۰]

اس اقتباس نے ساری بحث کو سمیٹ دیا ہے۔ اسحٰق مرزا اس کرب سے واقف ہو گئے تھے جس سے مقامی آبادی گزر رہی تھی۔ ان کو اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا کہ اگر مہاجرین کے دل دکھے ہوئے ہیں تو دکھی وہ لوگ بھی ہیں جن سے دیکھتے دیکھتے ان کا شہر ان کا تشخص چھن رہا تھا اور چھیننے والے لوگ اس بات کی داد بھی چاہتے تھے۔ اس بات سے اُن کا متفکر ہونا بجا تھا کہ ہم اپنے گھر میں غیر بنتے جا رہے ہیں اور اس کا احساس کسی کو نہیں۔ مہاجرین ہر وقت اپنی قربانیوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور بات بے بات جتلاتے ہیں کہ ملک پاکستان کے لیے کس قدر قربانیاں دے کر آئے ہیں کیا مقامی لوگ ساری زندگی ان کی یہ گردان سن اور برداشت کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا ہرگز ممکن نہیں اور تاریخ شاہد ہے ایسا ہوا بھی نہیں۔ بعد کے ادوار میں باہمی جھگڑے طول پکڑتے گئے۔ ان سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید الجھتا چلا گیا اور دونوں قومتیں اپنے اپنے خول میں بند ہوتی چلی گئی اور بعد میں پٹھانوں، پنجابیوں اور افغان جہاد کے بعد افغانیوں کی آمد نے مسئلے کی گھمبیرتا کو اور بڑھا دیا۔ جوگندر پال کے ناول پر سید مظہر جمیل کا تبصرہ پوری بحث کو سمیٹ دے گا۔

> مہاجرین نے دراصل اپنے ماحول اور فضا سے اپنے ہی ماحول اور فضا کی طرف ہجرت کی

تھی۔ چنانچہ نقل مکانی کے طویل فاصلے اور سبک رفتار وقت کی پرواز تک ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اپنے کلچر کی برتری اور ثقافتی نخوت نے انھیں نہ صرف احساس مغائرت کے کرب سے مار رکھا تھا بلکہ انھیں زمینی حقائق کو سمجھنے کے قابل تک نہ چھوڑا تھا اس خود ساختہ معاشرتی تنہائی نے انھیں روزہ مرہ زندگی کے گوناگوں مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لائق بھی نہ رہنے دیا تھا۔ اس طرح سندھ میں واقع مہاجر بستیاں بالعموم ثقافتی جزیروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ صورت حال آنے والے دنوں میں بعض مخصوص سیاسی، معاشی، معاشرتی مسائل اور مشکلات کا سبب بھی بنی ہے جن کی فصل آنے والے دنوں میں مہاجروں کی نئی نسلوں کو کاٹنی پڑی ہے اور اگر کوئی حقیقت پسندانہ تدبیر کاری اختیار نہ کی گئی تو ازل کے لیے کہیں یہ دل گرفتگی مہاجر نسلوں کا مقدر بن کر رہ جائے۔ [۲۱]

اس اقتباس میں پوری مہاجر نسل کا المیہ خواب رَو کے حوالے سے بیان ہے۔

نہ جنوں رہا نہ پری رہی زاہدہ حنا، کراچی کی پارسی کمیونٹی

کراچی تقسیم سے پہلے ہی برصغیر پاک و ہند کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی اپنی تجارتی اہمیت منوا چکا تھا۔ کراچی کو ان بلندیوں پر لے جانے میں کراچی میں رہنے والے ہندوؤں اور انتظامی عہدوں کے حوالوں سے انگریزوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

کراچی مختلف قومیتوں کا مسکن رہا ہے۔ جنھوں نے کراچی کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کراچی میں ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ کراچی ہندو اکثریت کا شہر تھا۔ ہندوؤں نے اس شہر کو سنوارنے سجانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ شہر میں مختلف تعلیمی ادارے ڈی جے کالج (دیا رام جیٹھ مل)، فلاحی ادارے، ہسپتال، لائبریریاں بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ہندوؤں کے ساتھ ساتھ شہر کی پارسی برادری نے بھی بڑھ چڑھ کر رفاہِ عامہ کے کاموں میں حصہ لیا۔ کراچی کی پارسی برادری اپنی نرم طبیعت، ملنساری، رحم دلی کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔ یہ لوگ حد درجہ حلیم اور انسان دوست کہلاتے ہیں۔ کراچی کے چپے چپے پر پارسیوں کے احسانات کے نشان پائے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بائی ویر بائی جی سپاری والا سکول (BVS) جو آج بھی ایک معیاری درسگاہ مانا جاتا ہے۔ ماما پارسی ہائی سکول اور موجودہ انجینئرنگ یونیورسٹی (NED) یعنی نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا جس کے لیے نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا

نے دو لاکھ روپے کا خطیر عطیہ دیا۔اسی طرح مختلف ڈسپنسریاں، جانوروں کے ہسپتال اور جانوروں کے پانی پینے کے لیے جگہ جگہ پیاؤ بنائے اُن میں سے کچھ آج بھی موجود ہیں۔

کراچی کے میئر جمشید نسروانجی رستم جی مہتا، جن کو بابائے کراچی بھی کہا جاتا ہے کا عہد ایک مثالی عہد تھا جس کے تذکرے کے بغیر کراچی کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔غرض پارسیوں کے بغیر موجودہ کراچی کی وہ شکل نہیں ہونی تھی جو آج ہے اس کے لیے کراچی کے باسی آج بھی ان عظیم ہستیوں کے شکر گزار ہیں۔

پارسی لوگ

اپنی شرافت، ایمانداری، خلوص، شرم وحیا اور فلاحی کاموں کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔جہانگیر ہرمز جی کوٹھاری جنھوں نے ساحل سمندر کوٹھاری پریڈ تعمیر کرائی تا کہ لوگ سمندر کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا سکیں۔ اردشیر کاؤس جی تیس سال انگریزی اخبارات خاص طور پر ڈان میں کالم لکھتے رہے سچے، بے باک نڈر تجزیہ کار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔کاؤس جی فاؤنڈیشن بنائی جو طلبہ کو تعلیمی وظائف دیتی ہے۔

اگلے ناول کا تعلق بھی پارسی برادری سے ہے۔ ناول نگاروں نے اس کمیونٹی ان کے رسم و رواج، رہن سہن اور صدیوں کے علمی ادبی اثاثے کو جانے کیوں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔قرۃ العین حیدر کے ہاں اس کمیونٹی کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں لیکن مکمل اور بھرپور بیان صرف زاہدہ حنا کے ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں نظر آتا ہے۔

زاہدہ حنا کا ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی

کراچی پر لکھے اردو ناول کے مطالعے کا سفر اب زاہدہ حنا کے ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی تک پہنچا ہے۔ان ناولوں کے کردار کراچی کے گلی کوچوں کے باسی ہیں۔کراچی کے لوگوں کے دکھ درد سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن زاہدہ حنا کا ناول اس حوالے سے مختلف اور منفرد ہے کہ اس میں کراچی کی معاشرت کے ساتھ ساتھ پارسی کمیونٹی کی زندگی کی بڑی جان دار جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پارسی لوگ کراچی کے محسن ہیں۔ان لوگوں نے کراچی پر بے شمار احسان کیے ہیں۔اپنی دولت، وقت اور محبت اس شہر پر لٹائی ہے تو بدلے میں کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ زاہدہ حنا کا یہ ناول ان لوگوں کے ایثار، قربانی، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ ان کے دکھ درد میں جھانکنے کی بھی ایک کوشش معلوم ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے زندگی کو کیسے بسر کیا؟ اور کر رہے ہیں؟ اپنے عظیم تاریخی ورثے کو کیسے ان لوگوں نے سینوں سے لگا رکھا ہے۔ اپنی اقدار کو سینے سے لگائے یہ حلیم لوگ کتنے پر

خلوص ہیں۔اس کا اندازہ ناول پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔

کراچی کی معاشرت کا منظر نامہ جس میں مہاجر، پٹھان، سندھی، عیسائی، سکھ، بلوچ، ہزارے وال، گلگتی، پارسی سب شامل ہیں۔ بہت وسیع ہو چکا ہے۔اس وسیع منظر نامے کو ناول نگار اپنے اپنے کینوس پر پینٹ کرتے رہے ہیں۔ پارسی بود باش اور معاشرت پر زاہدہ حنا کا یہ ناول ایک عمدہ اضافہ ہے۔

اس ناول میں کراچی پر لکھے گئے دوسرے ناولوں کی طرح ہجرت کا رنگ نمایاں ہے۔اس کی بنیاد بھی مہاجرت کے تکلیف دہ المیے ہجرت سے ہے، جو شاید کراچی کی گلیوں میں منجمد ہوگی ہے۔اس لیے کراچی پر قلم اٹھاتے ہی لکھنے والا ہجرت کی طرف چل پڑتا ہے۔اس ناول کی کہانی بھی ہجرت سے شروع ہوتی ہے اور خود غرضی، ہوس زر، اپنوں کے غیر بننے اور غیروں کے مہربان بننے تک چلتی ہے۔ ماں کا دکھ اور کرب، باپ کی آہیں، بھائی کا پیار بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

ہجرت کے بعد جب لوگوں نے تھوڑا قرار پکڑا تو جس جذبے نے تھوڑی دیر کے لیے سب کو اپنے قبضے میں کرلیا وہ ہوس زر کا جذبہ تھا۔ یہ جذبہ اتنا زور ور تھا کہ انسان اشرف المخلوقات کے بڑے رتبے سے گرتا گرتا پاتال تک جا پہنچا۔ پیار، محبت، وفا، سچائی، ہم دردی، خلوص سب ایک ایک کر کے زندگیوں سے رخصت ہونے شروع ہوگئے۔

اس المناک درد میں کچھ مہربان کردار سامنے آتے ہیں جو خلوص، وفا کے پتلے ہوتے ہیں جو غیر ہونے کے باوجود اپنوں سے بڑھ کر وفا کرتے ہیں۔

نہ جنوں رہا نہ پری رہی پارسی تہذیب وثقافت کے ساتھ خلوص اور محبت کی کہانی ہے۔ ناول کے اس تمہیدی بیان کے بعد ناول میں موجود موضوعات پر تفصیلی بحث۔

کراچی کے گلی کوچے، شاہراہیں، سمندر، کلفٹن

موجودہ کراچی اپنی وسعت اور پھیلاؤ میں قیام پاکستان کے بعد والے کراچی سے بے حد مختلف ہے۔ اس وسعت اور ہمہ گیری ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔شہر کی وسعت کے بہت سے اسباب ہیں۔ آبادی کا بے ہنگم پھیلاو اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔آبادی کے اس پھیلاؤ نے شہر کے لسانی رنگ کو مزید گہرا کردیا ہے۔شہر میں مختلف قومیتیں اپنے اپنے جدا لسانی تشخص کے ساتھ آباد ہیں۔ اندرون ملک لوگوں کی ہجرت کے بعد یہ لسانی رنگ اور گہرا ہوگیا ہے۔

مہاجرین کی اپنی بستیاں ہیں۔ سندھی لوگ جدا رہتے، پٹھان، بلوچ لوگوں کے اپنے اپنے علاقے ہیں جہاں اُن کی مستقل سکونت ہے۔

ناول کی مرکزی کردار برجیس داور علی جب پہلی مرتبہ کراچی پہنچی تو ایک بے آسرا اور بے سہارا لڑکی تھی جس سے اپنے کھو چکے تھے ان کی تلاش اُس کو پاکستان لائی۔ یہ تقسیم ہندوستان کا ابتدائی زمانہ تھا۔ تقسیم کے بعد لوگ اپنے اپنے مسائل میں گھرے ہوئے تھے اور کراچی آج کل کا کراچی نہیں تھا۔ برجیس داور علی نے اُس پاکستان کو بھی دیکھا اور بعد میں جب ایک طویل مدت بعد کراچی پہنچی تو اس نے نئے کراچی کو بھی دیکھا۔ ناول نگار نے فرق کی بڑی چابک دستی سے وضاحت کی ہے۔

پہلے دنوں کا کراچی اور بعد کا کراچی دونوں کے درمیان بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا ۔کراچی کے باسیوں نے بھی اس عرصے میں معاشی ترقی کی جو کراچی کے گلی کوچوں سے بھی نمایاں نظر آتی ہے ۔اس کا تذکرہ بھی ناول میں نظر آتا ہے۔

ناول کی ابتدا سے ایک اقتباس جو مہاجرین کے لیے بسائی گئی اولین کالونی پیر الٰہی بخش کالونی کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

> "کاؤس جی کی مورس پی آئی بی کالونی میں داخل ہوئی، کاؤس جی کوارٹروں کے نمبر پڑھتے ہوئے گلیوں میں دائیں بائیں مڑ رہے تھے۔ گھروں کے آگے لوگ مونڈھے ڈالے بیٹھے تھے اور ان کی گاڑی کو تجسس سے دیکھ رہے تھے۔" ۲۲

یہ کراچی کے اولین اور ابتدائی نقوش ہیں۔ کراچی کی گلیاں، لوگ اور ان کی زندگی، یہاں سے ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔

ناول نگار اس منظر سے بغیر کچھ کہے ایک سفر پر نکلتی ہیں جو آگے چل کر کراچی شاہ راؤں، ہوٹلوں، جم خانوں، سمندر سے چلتا چلتا ایک نئے انوکھے اور حیران کر دینے والے موڑ پر آ جاتا ہے۔ گویا یہ کہانی کرداروں کے ذریعے نہیں بلکہ کراچی کے بے جان نظاروں کے ذریعے سنائی جا رہی ہے۔

معاشی ترقی ہر شخص کا ایک خواب رہا ہے اور کراچی آنے والے تمام لوگ یہی خواب آنکھوں میں سجائے اس شہر پہنچتے ہیں اس کے بعد دن رات کا چکر اُن کو مسلسل دھنکتا رہتا ہے اور جو لوگ اس کا جبر اور کرب برداشت کر پائیں وہی دنیاوی کامیابی سمیٹ سکے ہیں۔ ناول سے کراچی کا ایک اور منظر۔

"وہ دونوں میدان عبور کر کے جمشید روڈ پر آ گئیں۔ سڑک پر بسوں کا، سائیکل رکشوں اور گاڑیوں کا شور تھا۔ سڑک کے دوسری جانب شاندار کوٹھیاں تھیں۔ ان کے مکین ہندوستان جا چکے تھے اور ہندوستان سے آنے والے ان کوٹھیوں میں آباد تھے۔" ۲۳

ہندوؤں کی اکثریت کراچی چھوڑ کر ہندوستان جانے لگی تو پاکستان آنے والے مہاجرین کو ان مکانات میں بسایا جانے لگا۔ کراچی میں زندگی کی ابتدا ہوتے ہوتے وقت لگا۔ مہاجرین اپنے کلیم ساتھ لائے تھے ان میں سے اکثر کلیم درست تھے لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو جعلی کلیم کے ذریعے پاکستان میں بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک بن گئے۔ تقسیم کے بعد ایک عجیب سی چھینا جھپٹی کا عالم تھا جو کراچی میں سب سے زیادہ محسوس کیا جا رہا تھا۔

آگے چل کر زاہدہ حنا کراچی کی گہما گہمی کا ایک اور منظر دکھاتی ہیں۔ کراچی اپنی ساخت میں ایک متحرک شہر ہے جو ہار نہیں مانتا، مشکل سے مشکل حالات میں بھی اس شہر نے زندگی کو نہ صرف برت کے دکھایا بلکہ نئے نئے امکانات کے در بھی وا کیے ہیں۔

"وہ بالکنی کی ریلنگ سے ٹکی ہوئی سڑک کو دیکھتی رہی۔ ٹن ٹن کرتے ہوئے سائیکل رکشے، گاڑیاں، ٹیکسیاں، گھوڑا گاڑی، پیدل چلنے والے، غرض سڑک پر ایک دنیا آباد تھی جو پل پل بدل رہی تھی۔" ۲۴

اسی پل پل بدلتی دنیا کی کہانی اس ناول میں نظر آتی ہے۔ یہ پل پل بدلتی دنیا کراچی کے بے جان اور جاندار سارے کرداروں کو بہت تبدیل کر رہی تھی۔ کراچی کے منظرنامے میں پچھلے ستر سالوں میں کیا تبدیلی آتی ہے اور شہر کن حادثوں سے گزرتا ہے اس کا سارا احوال اگلے منظر میں پیش کیا گیا، ایسا لگتا ہے اقتباس نہیں کراچی شہر کا تاریخی منظرنامے کا اختصار ہے۔ اس منظرنامے کو پڑھنے کے بعد کراچی کو سمجھنا قدرے آسان ہو جائے گا۔

اس تمہید کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ کراچی کی زندگی، صرف ایک منظرنامے نے کس قدر وضاحت سے پیش کر دی ہے۔

"ائیر پورٹ سے ہوٹل تک شہر اتنی تیزی سے پھیلا تھا جیسے بدن میں کینسر پھیلتا ہے۔ دیواروں پر کوڑھ پھوٹا ہوا تھا۔ شہید بابری مسجد کی پکار، ریپ انڈیا، نعرہ سندھ، جئے سندھ، شیعہ کافر، جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حقدار ہے۔ قادیانی واجب القتل ہیں۔ ماریں گے مر جائیں گے

مہاجر صوبہ بنائیں گے۔"[۲۵]

اس اقتباس کی ایک ایک سطر ایک ایک جملہ چشم کشا ہے۔ یہ منظر برجیس داور علی نے اس وقت دیکھا جب وہ ایک لمبے عرصے بعد کراچی آئیں۔ کراچی کی شاہ راؤں کے اردگرد کی دیواروں نے انھیں گویا پچھلے ستر برس کی روداد سنادی۔ یہ پیراگراف گویا کراچی کے حالات کا خلاصہ ہے یہ اُس دکھ کی داستان ہے جس سے کراچی اور اس کے شہری گزرے ہیں۔

شہر کی وسعت اس قدر تیزی سے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لی گی کسی نے سوچا تک نہ تھا وہ علاقے جو شہر سے باہر تصور کیے جاتے تھے اب شہر کے دامن میں سمٹ آئے تھے۔ بمشکل چند لاکھ کا شہر اب دو کروڑ لوگوں کو اپنے دامن میں جگہ دیئے ہوئے تھا۔

سندھ کے قدیمی باشندوں اور جدید سندھیوں کی کشمکش کا تذکرہ بھی نظر آتا ہے قدیم اور جدید کا یہ تصادم شہر کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہا ہے۔ شہر اب اپنی نئی پہچان بنانے میں مگن ہے۔

مذہبی منافرت کا رنگ بھی ہماری زندگیوں میں زہر گھول رہا ہے کراچی میں یہ منافرت شیعہ، سُنی تنازعات محرم کے جلوسوں پر حملے سب اسی منافرت کا شاخسانہ ہیں۔

ایم۔ کیو۔ ایم کی قائد سے وفاداری جو منزل نہیں راہ نما مانگتی ہے جو قائد سے بے لوث وفاداری کا تقاضا کرتی ہے اور قائد کو منزل سے بڑھ کر چاہتی ہے پھر مہاجروں کے تقاضے، مطالبے، جدا صوبے کا مطالبہ اس اقتباس میں گویا شہر کی خونچکاں تاریخ ہے۔ اس کرب کا بیان ہے جو شہر کے باسیوں نے بھوگا ہے اس اقتباس سے گویا شہر کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔

اب شہر کے بسنے والوں کے رویے، خیالات بدلنے کا احوال جو ناول کا مرکزی موضوع بھی ہے۔

سگے رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، خودغرضی، موقع پرستی

ناول کا مرکزی کردار برجیس داور علی ہے۔ برجیس کے والد داور علی خان پٹنہ میں جج تھے۔ برجیس کی والدہ کی وفات کے بعد داور علی خان نے دوسری شادی کر لی۔ برجیس اپنے والد کی بہت لاڈلی بیٹی تھیں۔ موسیقی کا شوق ہوا تو ابا میاں نے موسیقی سکھانے کے لیے للو مہاراج کی خدمات حاصل کر لیں۔ گریجویشن کے بعد لکھنو سے انگریزی میں ماسٹر کرنے کا جی چاہا تو سب کی مخالفت کے باوجود ابا میاں راضی ہوگئے۔ ابا میاں کے ہوتے

برجیس کو کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئی۔ زندگی پرسکون انداز میں آگے چل رہی تھی کہ مصیبتیں ایک ایک کر کے آنے لگیں۔ ان مصیبتوں کا احوال اس لیے ضروری تھا کہ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اپنوں کے غیر بننے کا عمل اتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ انسان زندہ درگور ہو جاتا ہے۔

ایسی مطمئن زندگی میں پہلی اینٹ اس وقت سرکتی ہے جب ابا میاں کے شدید علیل ہونے کی خبر آتی ہے اس کے بعد تو گویا مصیبتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ابا میاں کے فوت ہونے کے بعد جیسے تیسے برجیس اپنا ایم۔اے مکمل کر پاتی ہے، جیسے ہی وہ اپنے گھر پٹنہ پہنچتی ہے۔

وہی گھر جو اس کے بچپن، جوانی کی یادوں کا امین ہے جو اس کے ابا میاں کی یادوں کا مسکن ہے اس کے لیے اجنبی ہو چکا ہے۔ سوتیلی ماں پہلے بھی اتنی مہربان نہ تھی لیکن اب تو لگتا ہے تلوار سونت کر مقابلے پر آ گئی ہے۔

برجیس کو سب سے پہلے جس رشتے سے سب سے زیادہ دکھ پہنچتا ہے وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ جو ابا میاں کے ہوتے تو کھل کر سامنے نہ آسکی، اب ان کی وفات کے بعد سارے حساب برابر کرتی نظر آتی ہیں۔ زندگی کے سراب ایک ایک کر کے اپنا اصل چہرہ سامنے لاتے ہیں۔ سوتیلی ماں نے برجیس کے آنے سے پہلے ہی گاڑی اپنے میکے بھجوادی اور اس کے آتے ہی گھر کو فروخت کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ گھر کا سامان اسباب دن دیہاڑے بکا، باپ کی یادیں سرعام نیلام ہوئیں اور برجیس داور علی خان پر قیامت بیت گئی رشتوں نے اپنی اصلیت دکھانی شروع کر دی۔ ایک منظر نہ جنوں رہا نہ پری رہی کا کچھ یوں ہے۔

> فائنل کا آخری پرچہ دے کر برجیس لکھنو سے پٹنہ پہنچی تو گھر، مکان ہو چکا تھا۔ وہ بوکھلائی ہوئی سارے گھر میں پھرتی رہی۔ ابا میاں کے کپڑوں کی الماری میں ان کی خوشبو ڈھونڈتی ہوئی، کتابوں میں ان کا لمس تلاش کرتی ہوئی، چھوٹی امی کے طعنوں کے تیر کچھ زیادہ نکیلے ہو گئے تھے۔ ندرت اور بھیا اس کے پاس آتے تو سہمے اور سمٹے ہوئے۔ شاگرد پیشہ میں خاک اُڑتی تھی، فٹن بک چکی تھی۔ آگے چل کر ایک موقع پر سوتیلی ماں سے گفتگو ہوئی۔ چھوٹی امی نے اُس کی بات کاٹ دی۔ یہ گھر میرے نام ہے میں اس میں رہوں، بیچوں یا آگ لگاؤں۔ یوں بھی تمہیں کس بات کا غم ہے۔ جج صاحب نے تمہیں بی۔اے کرایا، ایم۔اے کرایا اور پھر تمہارے رہنے کو تو پورا پاکستان پڑا ہے۔ میری مانو تو اپنے اشرف چچا کے پاس چلی جاؤ۔[۲۶]

برجیس کے لیے یہ پہلا موقع تھا جب اسے معلوم ہوا کہ خودغرضی کا زہر جب رشتوں کو ڈس جائے تو ان رشتوں سے مہر و محبت ختم ہو جاتی ہے۔ برجیس کے لیے یہ سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنے چچا اشرف اور ان کے بیٹے پرویز جس کی وہ بچپن کی منگیتر تھی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جو نہ ہو سکا وہ پاکستان کے شہر کراچی چلے گئے تھے۔

برجیس جیسے تیسے کراچی پہنچے تو دو مہربان لوگوں نے جیسے اُسے تھام لیا ان کی ان کی مہربانیوں نے جیسے اُسے خرید لیا۔ یہاں پر رشتہ داروں کی تلاش شروع ہوئی۔ برجیس داور علی خان کی طرف سے اشتہار دیا گیا "ڈان" اور "جنگ" میں کہ برجیس کراچی میں ہے اس کے رشتہ دار رابطہ کریں۔ برجیس کے چچا اشرف اپنی اخبار بینی کے لیے مشہور ہیں، لیکن کافی دن تک کوئی رابطہ نہ ہوا۔

کچھ دنوں بعد ایک دور پار کے رشتہ دار حسنات احمد اور زبین چچی اسے اپنے گھر لے آتے ہیں کہ اشرف چچا کو ڈھونڈنا آسان ہوگا۔ برجیس ان کے گھر آتی ہے، شروع میں تو سب ٹھیک ہے۔ قمر بھائی اور شمع کے ساتھ اچھا وقت گزر رہا ہے۔ ایک دن اس پر یہ عقدہ وا ہوتا ہے کہ یہ رشتہ داری بھی جس بنیاد پر قائم ہے وہ اخلاص و محبت کے بجائے خودغرضی اور مطلب پرستی ہے۔

زبین چچی اور حسنات احمد اُسے اس آس پر اپنے گھر لے آئے تھے کہ اس کے پاس متروکہ جائیداد کا کوئی کلیم ہوگا۔ وہ اس کلیم کے ذریعے امیر ہونے کا منصوبہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اکیلی لڑکی ہے کہاں جائے گی؟ ہمارے ساتھ رہے گی تو ہم اس کا سب کچھ ہڑپ کر جائیں گے۔ برجیس پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ اس منظر کو زاہدہ حنا نے یوں بیان کیا ہے۔

بٹیا ای بتاؤ تم کاغذ پتر اپنے ساتھ لائی ہو کہ نہیں؟

حسنو چچا نے زبان کھولی۔

کیسے کاغذات چچا؟

ارے وہی جائیداد کی لکھا پڑھی، حسنو چچا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی زبین بول اٹھیں۔

کون سی جائیداد؟

تمرے ابا کی جائیداد۔

لیکن اس کے کاغذات سے میرا کیا تعلق؟

لو اور سنو۔ تمرا نہیں ہے تو اور کس کا ہے؟

تمری چچی کو بیچ میں بولنے کی عادت ہے۔ حسو چچا نے بات سنبھالی۔ یہاں سب لوگ اپنی اپنی زمین، مکان کا دعویٰ کیے ہیں۔ ہمرے ایک دوست ہیں وکالت کرے ہیں۔ ہم جب ان سے تمرے بارے میں بتایا تو او کہت لگے کاغذ پتر لے آؤ چار چھ مہینے میں یہاں کلیم مل جاوے گا۔

برجیس کی نگاہوں سے پردے اٹھ رہے تھے۔

میں کوئی کاغذ پتر نہیں لائی چچا۔۔۔

چچی میں تو صرف یہ کہہ رہوں کہ میں نہ کسی جائیداد کے کاغذات لائی ہوں نہ کلیم کا ارادہ ہے۔ اشرف چچا مل جائیں ذہن یکسو ہو جائے تو میں کسی کالج میں ملازمت کرلوں گی۔ میں زندگی دوسروں کے سرگزارنے کی قائل نہیں۔ [۲۷]

یہ طویل اقتباس تھوڑی کاٹ پیٹ کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ یہ تو ان رشتہ داروں کی بات ہوئی دور پار کے تھے کہ ان کے دل میں روپے پیسے کی محبت آسکتی ہے، لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی بلکہ آگے چل کر برجیس داور علی خان کو اُن رشتہ داروں سے بھی خود غرضی اور موقع پرستی کے سوا کچھ نہیں ملنا جن کے لیے اُس نے آنکھیں بند کر کے آگ میں چھلانگ لگا دی تھی۔ مہاجرین کی زندگی میں یہ چیز از حد دخیل ہوگئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنا مستقبل تعمیر کیا جائے چاہے اس کی بنیاد رشتوں کی پامالی پر ہی کیوں نہ اُٹھائی جائے۔

برجیس نے اخبار میں اشتہار دینے کے بعد اشرف چچا سے رابطہ نہ ہونے پر چچا حسنات کے گھر آنے کا فیصلہ کیا کہ وہاں سے چچا اشرف کا گھر ملنے میں آسانی ہوگی۔ چچا اشرف کا بیٹا پرویز اور بہن ثریا یہ لوگ برجیس کے ساتھ پلے بڑھے اور پرویز کو برجیس سے انسیت بھی تھی اور برجیس بھی اس کو چاہتی تھی۔ بڑا مان تھا اس کو پرویز پر، بچپن کا ساتھ نوک جھونک دل لگی کی باتیں وقتی غصہ لیکن دل میں پیار یہ سب ناول کی متنی شہادتوں سے آشکار ہے۔ مختصراً کہانی کچھ یوں ہے۔

برجیس کو پرویز کے اچانک پاکستان جانے اور پاکستان جانے کے بعد برجیس کو اطلاع دینے پر حیرانی

تو تھی لیکن پرویز کے دل میں کیا چل رہا ہے یہ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی وہ کراچی پہنچی پرویز اس کو ڈھونڈ نکالے گا اور ساری کلفتیں تمام ہو جائیں گی۔

اب جب سرِ راہ اس سے ملاقات ہوئی تو پرویز کا رویہ تھوڑا عجیب لگا کیونکہ پرویز اس کو گھر لے جانے کے بجائے شام میں آنے کا کہہ رہا تھا یا شام میں، میں خود لینے آجاؤں گا۔ اب گھر کوئی نہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب سننے پر برجیس کو حیرت تو ہوئی لیکن سمجھ نہ پائی۔

شام میں اس کی ملاقات ثریا، اشرف چچا، چچی سے ہوئی۔ دکھ درد سنے سنائے گئے۔ اگلے ہی دن جب وہ پرویز کے کمرے میں لفافہ لینے گئی تو دراز سے اسے وہ اخبار مل گیا جس میں برجیس داور علی خان نے اشتہار دیا تھا۔

پرویز نے وہ اخبار چھپا دیا۔ اس اخبار کے ملنے پر برجیس جیسے ڈھے سی گئی۔ ثریا نے اسے ساری کہانی سنائی کہ پرویز نے اپنے آپ کو کس قدر کم قیمت پر بیچ دیا ہے۔ اپنی قیمت لگوالی ہے۔ ثریا بتاتی ہے۔

> مہینہ بھر پہلے پرویز کی نسبت طے ہوگئی تھی، جمشید صاحب کی بیٹی سے آدھا کاروبار بھیا کے نام ہونے والا ہے۔ بڑا گھر اسی لیے لیا گیا تھا۔ میں نے آخری خط میں ساری تفصیل لکھ دی تھی۔ ثریا کے منہ سے نکلنے والے لفظ اس کی سماعت کے پیالے میں کھوٹے سکوں کی طرح گرتے رہے سارے رشتے حجرۂ مفت بلا میں رہتے تھے۔ اشرف چچا، ابا میاں کا خون، چچی جو اس کی خالہ تھیں اس کی ماں کی سب سے چہیتی گوئیاں، دائی کے ٹھیکرے میں چاندی ان ہی نے ڈالی تھی۔ پرویز کے ہونے والے خسر جمشید ان کا پھیلا ہوا کاروبار، سلسلہ طلسم جمشید، شہر، نیلام گھر ہر رشتہ برائے فروخت ہر ناتا روپوں میں تلتا ہوا۔ ترک وطن کرنے والے کلیم کے کاغذات، کاروبار اور روپوں کے انبار میں تل رہے تھے تول رہے تھے۔ ۲۸

یہ سب کچھ جاننا سننا کس قدر تکلیف دہ ہوسکتا ہے۔ آپ نے اپنے مقدر کا فیصلہ کس کے سپرد کر دیا اور وہ آپ کو اندھے کنویں میں گرادے کچھ ایسی ہی کیفیت برجیس کی ہوئی لیکن اس نے چاہا سب کچھ پرویز سے سن لے کہ پرویز کیا کہتا ہے؟ لیکن اس پر حیرتوں کا پہاڑ اُس وقت ٹوٹا جب اس نے پرویز کو ایک اجنبی کی طرح بولتے سنا یہ پرویز نہیں تھا۔ یہ کراچی کا ایک نیا کردار تھا جو اپنا لبادہ اُتار کر اپنی اصلیت بیان کر رہا تھا۔ جس کی زندگی کا مقصد آگے بڑھنا تھا اور راستے میں آنے والی ہر مشکل کو پاٹ جانا تھا۔ وہ مشکل کوئی رشتہ اپنا ہو، پرایا ہو

،کوئی بھی ہو اگر مادی فائدے کے آگے آرہا ہے تو اس کو پھلانگنا بے حد ضروری ہے۔

پرویز کا یہ کردار موقع پرستی کا شاہ کار ہے جو ذاتی فائدے کو ہر رشتے پر ترجیح دیتا ہے۔خود غرض معاشرے کا خود غرض کردار جو صرف اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس کردار نے معاشرے میں ایسا زہر گھولا کہ شہر کی ہوائیں مسموم ہوگئیں، اس کردار نے اخلاص، وفا، قربانی، ایثار کو شہر بدر کردیا۔ اس کردار کی وجہ سے شہر پر نحوست طاری ہوئی۔

جب زندگی کا مقصد صرف اور صرف روپے کا حصول بن جائے تو شہروں پر آنے والی آفتوں کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔آنے والے برسوں نے یہ بات ثابت کردی کہ خود غرض معاشرے کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ کراچی بھی ان بدقسمت شہروں میں سے ہے کہ تقسیم کے بعد کراچی کو ایسے مکروہ کردار کثیر تعداد میں ملے جنھوں نے شہر کی زندگی کو حرص و ہوس سے آلودہ کردیا۔

پرویز کی منگیتر اس کو ڈھونڈتی ڈھانڈتی کراچی پہنچتی ہے اخبار میں اشتہار دیتی ہے اس کو پڑھ کر پرویز چھپا دیتا ہے اور جب بات کھلتی ہے تو کس قدر ڈھٹائی سے یوں گویا ہوتا ہے۔ یہ اقتباس مرکزی موضوع پر بہت خوبصورتی سے صادق آتا ہے۔

> بات دراصل یہ ہے برجیس کہ ہم دونوں کی نسبت ہمارے بزرگوں کا چونچلا تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہوئی۔تمہارے مزاج میں خودسری بہت ہے۔تم جو درست سمجھتی ہو کر گزرتی ہو۔ مجھے اس وضع کی لڑکیاں پسند نہیں ، تم نے لکھنو جا کر ایم۔اے کرنے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے کو چچا جان بدلوا سکے اور نہ میں۔اس سے پہلے تمہارے سر میں گانے بجانے کا سودا سمایا تو نہ صرف یہ کہ تم نے گھر میں گانا سیکھنا شروع کیا بلکہ ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام بھی کرنے لگیں۔میرے اور تمہارے راستے بہت پہلے ہی الگ ہوگئے تھے۔ میں اسی لیے یہاں چلا آیا تھا کہ میرے خیال سے یہاں میرے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے جب کہ وہاں میں عمر بھر کلرکی کرتا رہتا ۔میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تم یہاں چلی آؤ گی۔اگر اس کا مجھے شائبہ بھی گزرتا تو بلا کم وکاست ہر بات لکھ دیتا۔وہ اشتہار تو سارے ہی عزیزوں کے نام تھا۔کوئی میرے یا ابا کے نام تو نہ تھا یہاں ہمارے سوا بھی بہت سے رشتہ دار ہیں تمہارے۔ برجیس نے بولنے والے کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن وہ شاید ہزاروں نوری میل کے فاصلے پر تھا پہچانا ہی نہ گیا۔ [۲۹]

ناول کی مرکزی کردار برجیس داور علی خان پر اپنے سگے رشتوں نے ایک قیامت توڑ دی انھوں نے اسے یوں دھتکارا جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ چیز ہو۔ اس کا سارا سفر رائیگاں گیا۔ اپنے غیر ہوگئے اس کے چچا، چچی دونوں نے اُس سے منہ موڑ لیا۔ زندگی بے مہر ہوگئی۔ رشتوں پر سے اس کا اعتماد اٹھ چلا۔

بڑے شہروں میں رشتے بھی مصنوعی اور غرض و غائیت کے لیے ہوتے ہیں ورنہ تو کون اور میں کون ،کراچی میں یہ ٹوٹتے رشتے نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں بڑی وضاحت سے بیان ہوئے ہیں۔

نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں پارسی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں

زاہدہ حنا کے ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں جہاں خودغرض مطلب پرستی کے بے مثال مرقعے نظر آتے ہیں وہیں اس ناول میں کچھ ایسے کردار بھی ہیں جو سراپا ایثار وخلوص کے پیکر ہیں۔ جنھوں نے ایک انجان، بے آسرا لڑکی اپنی بیٹی کی طرح چاہا، اس کا مشکل میں ساتھ دیا۔ یہ کردار نسروان پرویز کاوس جی اور ان کی بیگم بانو لشکری اور صاحبزادہ منوچہر کے ہیں۔

کراچی میں زمانہ قدیم سے آبادی پارسی کمیونٹی اپنی خدا ترسی، حِلم، بردباری اور محبت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس ملنسار طبقے نے کراچی کو سجانے سنوارنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ کمیونٹی اپنے عمدہ اخلاق کی وجہ سے مشہور ہے۔ برجیس داور علی خان ناول کے آغاز میں حادثاتی طور پر ان کے گھر پہنچتی ہے لیکن اس کے حالات سے مطلع ہونے کے بعد کاؤس جی اور ان کی بیگم نے اس کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھا۔

مطلب پرستی کے اس معاشرے میں ایسے کردار ایک نعمت سے کم نہیں جو بے غرضی اور ایثار کا نمونہ ہوں۔ برجیس پر جب اپنوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کیے تو کاؤس جی نے اپنا رحم دل دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ مسز کاؤس نے اس کا دن رات خیال رکھا۔

یہ دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کے غم سے بھی نڈھال ہیں جو ایک ہندو لڑکے کے ساتھ گھر چھوڑ گئی۔ شاید برجیس کی شکل میں انھیں اپنی بیٹی نظر آتی جس کا انھوں نے بھرپور ساتھ دیا۔

انسانی جذبات، احساسات سے گندھا ناول کا یہ حصہ کاؤس جی اور ان کی بیگم کی بے پایاں محبت کا نمونہ ہے۔ برجیس اُن کے لیے جس طرح کے جذبات رکھتی ہے۔ اس اقتباس میں ان کا خوبصورت تذکرہ کیا گیا ہے۔

میرے لیے کائنات میں تمہارا گھر آخری سچ تھا۔اس گھر کے لوگوں نے مجھ سے خون کا، دودھ کا، ٹھیکرے کی مانگ، مذہب، زبان کا حوالہ نہیں مانگا۔ میں ایک سہمی ہوئی لڑکی تھی اور اس گھر نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا میں سچ کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنے آئی تھی۔ ۳۰

پارسی قوم اپنے اسی رویے کے لیے مشہور رہی ہے۔ برجیس کو گھر اور دل دونوں میں جگہ دی۔ان لوگوں میں پارسی مذہب کی رسومات، لباس، گفتگو، خوشی، غم کے مختلف طریقے رائج ہیں جن کا تذکرہ کاؤس جی اور بیگم کاؤس جی کے ہاں اکثر ملتا ہے۔ایک جملہ جو کاؤس جی کی زبان پر اکثر جاری رہتا ہے۔

آہورمزدا سب کو اپنی مہربانی میں رکھے

اس کے ساتھ بیگم کاؤس کی زبان جو وہ اپنے خاص انداز میں بولتی چلی جاتی گجراتی لہجے میں کئی دفعہ اُن کے منہ سے سنے ہوئے جملے جذبات کی شدت کے باوجود بات یوں بیان کرتے ہیں کہ انسان اپنے اندر حوصلہ محسوس کرتا ہے۔ ناول کے شروع میں جب برجیس اُن کے گھر پہنچتی ہے تو اپنے بیٹے کے بارے میں بڑے پیار سے بیگم کاؤس جی کہتی ہیں۔

ابھی منوچہر اٹھیں گا تو وہ شور مچائیں گا، ہمارا بوٹ کیدر ہے، ہمارا ٹائی کیدر ہے۔ارے بابا تم مڈ نائیٹ آیا اپنے کمرے میں چینج کیا تو سب چیز وہیں ہوگا جیدر تم ہے۔پھر تیار ہوئیں گا، بولیں گا ہمارا آملیٹ کولڈ ہوگیا۔ ہمارا ٹوسٹ پاپڑ ہوگیا، کوئی اُس کو بولے مسٹر جب تم مڈ ڈے اُٹھیں گا تو آملیٹ ہاٹ کیسے ہوویں گا۔ ۳۱

اس اقتباس میں ماں کی مامتا اور پیار دونوں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔بیگم کاؤس آگے چل کر جب برجیس پرویز کی بے وفائی اور ڈھٹائی سے شکست خوردہ اُن کے پاس پہنچتی ہے تو بیگم کاؤس جی یوں کہہ کر اس کی ڈھارس بندھاتی ہیں۔

ابھی تم یہ کیا بے بی مافک روتا ہے۔کیدر تو بہت بریو بنتا ہے۔ملک ملک پھرتا ہے۔اپن کا کنٹری چھوڑ کر ایدر آتا ہے اور جب کبھی لائف اوپر نیچے ہوتا ہے تو پھر سوں سوں کرتا ہے ۔ارے تم کوئی لیڈی ہے یا کسی بیک ورڈ لوکالیٹی کا کوئی بے فضول سا چھوکری۔ ۳۲

بیگم کاؤس جی کا کردار بڑا نپا تلا، سلجھا ہوا اور ہر وقت متحرک رہنے والا ہے۔ گھر کو سجا سجایا اور خوب صورت رکھنے میں اُن کا بہت بڑا کردار ہے۔اپنی بیٹی کے غم میں گھل رہی ہیں لیکن منوچہر اور کاؤس جی کے

سامنے تذکرہ نہیں کرتیں۔

کاؤس جی اس گھرانے کے سربراہ ہیں اور برجیس کو ان میں اپنا ابا میاں کا عکس نظر آتا ہے۔انھی کی طرح بظاہر غصہ کرنا لیکن دل میں ٹوٹ کر محبت کرنا ، برجیس کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔منوچہر جو کاؤس جی کا بیٹا ہے برجیس کے چلے جانے کے بعد منوچہر منتظر کہلاتا ہے اور برجیس کے لوٹ آنے کا انتظار کرتا ہے۔ناول میں پارسی تہذیب وثقافت،عبادات، رسوم ورواج،لباس کی خاصی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ناول کی ابتدا ہی ساڑھی کے بروچ سے ہوتی ہے۔بیگم کاؤس جی کی ساڑھی سے گر جاتا ہے۔برجیس وہ انھیں دینے جاتی ہے۔بروچ ان کے لیے خاندانی ہونے کی وجہ سے بہت قیمتی ہوتا ہے۔بروچ فیملی فارچون ہونے کے باوجود برجیس جب ہندوستان جانے کا ارادہ کرتی ہے تو بیگم کاؤس جی وہ بروچ اس کو دے دیتی ہیں اس کے انکار کے باوجود وہ اصرار کرکے وہ خاندانی بروچ برجیس کو حوالے کرتی ہیں۔

ناول میں پارسی لوگوں کی مختلف رسوم کا تذکرہ بھی آتا ہے۔منوچہر کی سالگرہ پر بیگم کاؤس ایسی ہی ایک تقریب کا اہتمام کرتی ہیں جس میں ان کے خاندانی لوگ شریک ہوتے ہیں۔ برجیس کو بیگم کاؤس اپنی ایک بہت خوبصورت ساڑھی جو چائنا سے بنوائی جاتی ہیں پیش کرتی ہیں جو وہ نہیں لینا چاہتی مگر بیگم کاؤس جی بہ اصرار اس کے حوالے کرتی نظر آتی ہیں۔اس تقریب میں بھی پارسی لباس ، پارسی تہذیب کی خوب صورت جھلک نظر آتی ہے۔اس تقریب کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے۔

> مہمان آتے گئے۔گھر لوگوں سے چھلکتا گیا۔بوڑھی عورتیں،خمیدہ کمر مرد، بے رنگ نوجوان چہرے،لڑکیاں ٹھٹھرے ہوئے پودے، بجھتے ہوئے چراغ، طاق بُستاں،صدستون ،تخت جمشید زمین بوس۔آل مجوس، تاریخ کی سلاخوں پر اٹکی ہوئی ایک نیم جاں نسل،وقت کا گدھ ۳۱ھ سے انھیں نوچنے اور کھانے میں مصروف منوچہر کو اُس نے پہلی مرتبہ پارسی لباس میں دیکھا، گھٹنوں سے نیچے تک سفید جامہ،تنگ مہری کا سفید کھڑا پاجامہ،سر پر ٹوپی، وہ اس منوچہر سے کس قدر مختلف تھا جسے وہ وصبح وشام دیکھتی تھی۔بانو آنٹی اس پر نثار ہورہی تھیں۔کاؤس انکل ایک طرف بوڑھے رشتہ داروں اوردوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔مذہبی رسوم کا آغاز ہوا۔ نصف چہرے پر سفید نقاب ڈالے ہوئے ذاؤتار اور راسپی سفید فرش پر چار زانو بیٹھے۔افرگینو روشن ہوا۔پھولوں اور پھلوں سے بھری ہوئی تھالی درمیان میں سولہہ پھولوں سے بھری ہوئی

ایک اور تھالی زاؤتار کے داہنے ہاتھ پر۔اُسی تھالی کی سیدھ میں ملیدے کی طشتری، جلتا ہوا دیاراسپی نے چاندی کے چمچے سے صندل کی لکڑی کے ٹکڑے اور لوبان کا برادہ افرگینو کی روشن آگ میں ڈالا۔ ۳۳

آگ کی چونکہ پارسیوں کے ہاں خصوصی اہمیت ہے اور اس کی پرستش کی جاتی ہے اس لیے آگ کا تذکرہ ان کے ہاں جا بجا ملتا ہے۔

آگ جو سچ تھی، خداوند سے پیدا ہوئی تھی۔آگ جس کے عطر سے انسان بنایا گیا۔آتش بہرام مقدس ومنزہ آگ کہاں تھی؟ آگ کی پاک کی ہوئی سولہ اقسام جو۱۴ہزار گھنٹوں تک گاتھا کی آیتوں کے ورد کے دوران اکٹھا کی جائیں تو آتش بہرام وجود میں آئے۔آتش بہرام کہیں نہیں تھی۔ ۳۴

ان اقتباسات میں اس دھندلی اور مٹتی ہوئی تہذیب کے رسوم ورواج ہیں جو زمانے کے خلاف لڑتی ہوئی اب تھک ہار چکی تھی۔اس کے قوا مضمحل ہو رہے تھے یہ لوگ مہربان اور ملنسار تھے مگر گھٹتے جا رہے تھے ان کی آباد نقل مکانی کر رہی تھی ایسے کسی دیس کی تلاش میں جہاں یہ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر سکیں۔ قیام پاکستان کے وقت تقریباً (۶۰۰۰) چھ ہزار پارسی کراچی میں آباد تھے لیکن اب ایک اندازے کے مطابق صرف (۷۰۰) سات سو کے قریب پارسی بچے ہیں۔ان کی نئی نسل تو کراچی سے جا چکی ہے بوڑھے لوگ باقی ہیں جو اپنے اجداد کی ہڈیوں کو سینے سے لگائے اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ناول کے اختتام پر جب بیگم کاؤس جی کا انتقال ہوتا ہے تو ان کے مرنے کے بعد رسومات کا بھی تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ پارسی لوگ اپنے مردوں کو دفناتے نہیں ہیں بلکہ یہ اپنے مرنے والے کو نہلا دھلا کو محمود آباد کراچی میں بنے سائیلنس ٹاور پر دکھ دیتے ہیں جہاں گدھ اور چیلیں ان کے مردے کا گوشت نوچ نوچ کر کھا لیتے ہیں اور ہڈیاں ٹاور کے اندر نیچے بنے ہوئے کنویں میں گر جاتی ہیں۔۳ دن اس ٹاور کے قریب بنے ہوئے ہال میں یہ لوگ بیٹھتے ہیں اور مرنے والے کے لیے دعائیہ کلمات پڑھتے ہیں۔

اسی منظر کی بڑی مؤثر منظر کشی زاہدہ حنا نے کی ہے۔

دخمہ اب سامنے تھا۔ممی پتھر کے چبوترے پر رکھی گئیں۔آخری سگ دید ہوئی پھر ان کا چہرہ ڈھک دیا گیا۔منوچہر کے سینے میں درد نے کروٹ لی۔یہ صورت اب کبھی نظر نہیں آئے گی

۔نسی سالار انھیں پھر سے لے کر چلے۔ دخمے کا دروازہ کھلا۔ اب وہ لوہے کی سلاخوں پر آرام کریں گی۔عمر انھوں نے انتظار کے کانٹوں پر بسر کی۔ منوچہر نے سر اٹھا شفاف نیلے آسمان کو دیکھا۔ بلندی پر گدھ منڈلا رہے تھے، کچھ پیڑوں پر بیٹھے تھے اور کچھ دخمے کی منڈیر پر۔ گدھ جس سے زیادہ تیز نظام ہضم دنیا کی کسی مخلوق کا نہیں۔ سفاک آنکھیں اپنے شکار کو تاکتی ہوئی۔ نگاہوں میں تولتی ہوئی، سنا ہے یہ سب سے پہلے آنکھوں پر گرتے ہیں لمحے بھر میں انھیں نوچ لیتے ہیں۔ منوچہر کو جھرجھری آئی۔ ممی کی آنکھوں کے سب خواب وقت اپنے پنجوں میں نوچ کر لے گیا تھا اور ویران آنکھیں اب مردار خور پرندوں کے حوالے تھیں۔ ۳۵

ناول میں پارسی تہذیب وثقافت کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ برجیس کی کہانی بھی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ بنیاد ناول کی ہجرت کے دکھوں سے اٹھائی جاتی ہے پھر وقت کے ساتھ بدلتے انسانی رویے، موقع پرستی، خود غرضی کو بیان کرتی مہربان ہستیوں کے تعارف اور ان کی مہربانیوں کا احوال بیان کرتے ہوئے پارسی مذہب کے رسوم کا احوال بتاتے ہوئے بیگم کاؤس جی کی موت پر اختتام پذیر ہوتی۔

یہ مہربان لوگ، یہ ملنسار لوگ آج کل کی خودغرضی اور مطلب پرست دنیا میں گویا تپتے ریگستان میں نخلستان کی مانند ہیں جن کا وجود معاشرے کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

سید مظہر جمیل، زاہدہ حنا کے ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی کے بارے میں کچھ یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

کہانی تو اس ناول کی بھی آشوب ہجرت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔لیکن یہ ناول خونی رشتوں، ناتوں، واسطوں اور وسیلوں کے ٹوٹنے ہی کی کہانی نہیں بلکہ محبت کے شخصی اعتبار کی شکست کا بھی المیہ ہے۔اس میں جہاں خودغرضانہ موقع پرست بے حسی کے کافور کی بو بسی ہے وہیں بے ریا محبت کے مشفق ومہربان لوبان کی لپیٹیں بھی مشام جان کو تازگی بخشتی ہیں۔ محبت بھری غم گساری نے پوری کہانی میں حزینہ فضا پیدا کردی ہے۔ ماجرا گوئی کی سطح پر یہ بھی ہجرت کے موضوع پر لکھی جانے والی بے شمار اوسط درجے کی کہانیوں میں سے ایک ہوتی اگر اس میں زاہدہ حنا نے پارسی رہن سہن، پارسی لب ولہجہ، پارسی طرز احساس اور پارسی ثقافت کی مؤثر منظر کشی نہ کی ہوتی۔ایک مخصوص تہذیبی عنصر کی آمیزش نے اس ناول میں ایک ایسی تخلیقی ندرت

وتازگی پیدا کردی ہے جو اس کہانی کو امتیازی مقام دینے پر اصرار کرتی ہے۔ ۳۶

رضیہ فصیح احمد کا ناول ایک صدی کی کہانی

رضیہ فصیح احمد کا ناول ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی کہانی سناتا ہے۔ ناول میں ان مسلمان گھرانوں کا رہن سہن، طرز معاشرت، خاندانی رشتے، بچوں کی تعلیم و تربیت اور خاندانی نظام کی تصویر کشی ہے۔ یہ مسلمان گھرانے کیسے ہندوستان کے مختلف شہروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ تعلیم کی لگن بچوں کے مسائل سب کے سب اس ناول میں زیر بحث آتے ہیں۔

ناول میں کراچی کا تذکرہ تقسیم کے تناظر میں موجود ہے۔ کراچی کے سمندر میں ہندوستان کی تمام ندیوں نے آ کے گرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ تمام لوگ تقسیم کے بعد بہتے بہاتے کراچی پہنچے۔ یہاں ان کی زندگی نے کچھ نئی کروٹیں لیں بچوں نے کامیابیاں حاصل کیں نئے افق چھوئے، پاکستان کے حالات ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء بنگلہ دیش کا بننا سیاسی جماعتیں ان سب کا اجمالی تذکرہ بھی ناول میں موجود ہے۔

اپنے موضوع کے حوالے سے کراچی پر اس ناول میں جو کچھ موجود ہے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کراچی کی معاشرت میں ہجرت، مہاجر، نئی بستیوں کا بسنا ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ اس ناول میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ ناول ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کی تہذیب و تمدن، زندگی کے نشیب و فراز، بچوں کی تعلیم و تربیت، ماں باپ کی قربانیوں سے متعلق ہے۔ جا بجا خاندانی نظام اور علی گڑھ کالج کے بعد مسلمان بچوں نے تعلیم کے میدان میں جو کامیابیاں سمیٹیں ان کی طرف بھی ضمناً اشارہ موجود ہے۔

ایک ابتدائی اقتباس۔

> نانی بولیں۔ ارے ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہے، اب تیرے نانا کو کسی کی تعریف کرنے کی عادت نہیں، برائی نکالنے میں رہتے ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کسی کو کسی کی تعریف کرنے کی فرصت نہ عادت، جہاں ہر گھر میں دس بارہ بچے اوپر تلے کے ہوں، مختلف عمریں، مختلف عادتیں، مختلف خیالات وہاں آدمی کو دم مارنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ کہاں تعریف کرنی اور یہ دستور تو اب کچھ دن سے شروع ہوا ہے اپنے بچوں کی آپ تعریف کرنے کا۔ ورنہ ہم نے تو سدا یہی سنا ہے کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ اب تو میں سنتی ہوں کہ بچے انگریزی کے حروف الٹے لکھیں تب بھی ٹیچر بڑا سٹار بنا دیتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہ

دستور نہیں تھا تعریف تو شاید ہی کبھی ہوتی ہاں اٹھتے بیٹھتے ٹوکا ضرور جاتا تھا۔ہم نے تو یہی دیکھا اور بچوں سے بھی یہی کہا ہے تعریف وہ نہیں جو ماں باپ کریں ،تعریف وہ ہے جو دوسرے کریں۔ ۳۷

بچوں کے معاملات ، خاندانی مسائل ،مشترکہ خاندانی نظام یہ سب ناول میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں ۔اس اقتباس میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب اشارہ ہے کہ جب اساتذہ بچوں پر سختی کرتے ماں باپ بھی اساتذہ کی ہاں میں ہاں ملاتے اور بچوں کو زبردستی آداب کے سانچے میں ڈھالا جاتا۔ گوکہ آج کل اس عمل کو خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن ایک عرصے تک بچوں کی تربیت کا یہی مروجہ دستور تھا۔ یہ پیراگراف اسی زمانے کے ایک رجحان کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اپنے موضوع کی تحدید کو مدنظر رکھتے ہوئے ناول پر مزید بحث کرنے کے بجائے کراچی کے تذکرے پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک صدی کی کہانی اور کراچی

جیسا کہ ناول کے نام سے ظاہر ہے کہ پچھلی صدی کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ شروع کے پچاس سال کہانی ہندوستان کے مختلف شہروں کی کہانی ہے ۔کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے کردار بھی پھیلتے جاتے ہیں ۔ کہانی میں کسی بھی شہر کو جم کر تفصیل سے نہیں پیش کیا گیا مختصراً اشارے دے کر آگے بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان کے اکثر شہروں کے نام تک موجود نہیں ۔صرف ایک شہر کا تذکرہ ہے اور پھر کہانی آگے بڑھ جاتی ہے۔

نصف صدی کے قصے کے بعد جب اگلے پچاس سال کا تذکرہ آتا ہے تو پاکستان کی آزادی اور کراچی کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمان گھرانوں کے لیے بڑی مشکل آن پڑی تھی ۔ ہندوؤں، سکھوں کے تیور ہی بدل گئے ۔مسلمانوں کو صاف محسوس ہونے لگا کہ اب اس ملک میں ان کے بچوں کا مستقبل مخدوش ہے۔ اس بات کو اب ٹالا نہیں جاسکتا۔ ناول میں فلسفیانہ یا گھمبیر باتوں کا دخل کم ہے اور کہانی کے بیانیے کی طرف توجہ زیادہ ہے۔

متحدہ ہندوستان کی تقسیم

لیکن یہ سانحہ اتنا بڑا ہے کہ اس کا ذکر خود اپنے آپ کو بیچ میں کھینچ لاتا ہے ۔تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں اس اقتباس میں ان کی منظر کشی کی گئی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا،۱۴ اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کے

قیام کا اور پندرہ اگست ہندوستان کی آزادی کا دن ٹھہرا۔ بچوں نے بھی ریڈیو پر اعلان سنا، واصف نے شمسہ سے کہا ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں آزادی کے موقع پر بچوں کے کھیل تماشے ہورہے ہیں، پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ تم اور عالیہ بھی چلی جانا۔شمسہ اور عالیہ گئیں، ترنگے جھنڈوں کے سائے میں لڑکیاں جوش بھرے ہندوستانی نغمے گا رہی تھیں۔آخر میں جن من گایا گیا۔کھیل شروع ہوئے تو دو کھیلوں میں شمسہ اور ایک میں عالیہ جیتی ان کے نام لکھے گئے۔مگر جب انعام بانٹے گئے تو دونوں کا نام نہیں لیا گیا۔وہ مایوس گھر لوٹیں اور باپ کو بتایا، واصف نے تاسف کا اظہار کیا۔آثار اچھے نہیں ہیں۔ان لوگوں نے بچیوں کے اسلامی نام سن کر انھیں انعام نہیں دیئے۔ ۳۸

تقسیم کا اعلان ہوتے ہی دونوں اطراف کے لوگ ایک ہسٹریائی کیفیت میں چلے گئے اور قتل و غارتگری کا ایک بازار گرم ہوگیا۔صدیوں اکٹھے رہنے والے اچانک بپھر گئے اور پھر ایک دیوانگی کی لہر تھی جو سب کچھ بہا کر لے گئی۔مسلمانوں نے ہندوؤں اور ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے فرق صرف یہ ہے کہ ابتدا کس نے کی؟ لیکن دونوں اطراف کے لوگ اس میں برابر کے شریک تھے۔مسلمان خاندان جو ہندوستان میں تھے ان کے سر پر ہر وقت تلوار لٹکتی رہتی کہ نہ جانے کب کیا ہوجائے۔

ایسا نہیں تھا کہ سارے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آگئے اکثر مسلمان اب بھی ہندوستان میں رہائش پذیر ہیں جن مسلمان گھرانوں کے لوگ نوکری پیشہ تھے انھوں نے مناسب سمجھا کہ پاکستان ہجرت کی جائے اور زرعی پیشے سے منسلک اکثر مسلمانوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کو مناسب سمجھا۔

واصف جیسے مسلمانوں نے ہجرت کو مناسب سمجھا کیوں کہ آثار اچھے نہ تھے۔ہندوستان میں رہنے کی صورت میں جان، مال، آبرو کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہ تھی لہٰذا اب پاکستان کیسے پہنچا جائے یہ سوال زیر بحث تھا۔مشرقی پنجاب کے لوگوں نے پاپیادہ اور ٹرین کے ذریعے ہجرت کی لیکن ٹرین کا سفر میں خطرہ زیادہ تھا۔بحری سفر محفوظ تصور کیا جاتا تھا۔غرض یہی سوچ بچار ہر خاندان میں جاری و ساری تھی۔اسی افراتفری کا احوال رضیہ فصیح احمد نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات تو ہو ہی رہے تھے۔آزادی کے اعلان کے ساتھ مار دھاڑ کی خبریں بڑھنے لگیں۔مشرقی پنجاب سے سکھوں کے قافلے کے آتے ہی اسٹیشن پر ست سری اکال کے نعرے

لگنے لگے۔ایک دن خبر آئی کہ آج رات حملے کا امکان ہے۔آخر دونوں گھرانوں نے شہر جانے کا فیصلہ کیا۔[۳۹]

واصف کے گھرانے نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ان کے ساتھ اور بہت سے گھرانے بھی پاکستان آنے کے لیے تیار تھے ان سب نے بحری جہاز کے ذریعے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا۔ناول میں بحری جہاز کے سفر کا احوال بھی درج ہے خدا خدا کر کے بحفاظت یہ کنبہ پاکستان پہنچتا ہے۔رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں۔

جہاز چلتا رہا۔کچھ لوگ سوتے رہے، کچھ جاگتے رہے، کچھ نے دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور آخر کار پاکستان کی سرزمین بھی نظر آئی۔اس پر لوگوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ عورتیں رو رو کر اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں اور بچے خوش ہوئے کہ ان کے قدم دوبارہ زمین کو چھوئیں گے۔[۴۰]

پاکستان مہاجرین کی خوابوں کی سرزمین تھا یہ فیصلہ کرنا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی قیمتی ترین متاعِ حیات اولاد کو لے کر ایسے وطن کو نکل کھڑے ہونا جس کا صرف نام سنا ہے کوئی آسان کام نہ تھا۔خاندان، رشتہ دار، گھر بار مانوس فضائیں ان سب سے دستبردار ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔راستے کی مشکلات برداشت کر کے جب یہ لوگ پاکستان پہنچے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔سب نے اللہ کی بڑائی بیان کی۔سب نے اس سرزمین کو چوما، سجدے کیے کہ خدا نے بحفاظت پاکستان پہنچایا۔

مشرقی پنجاب کے مہاجرین کے علاوہ اُتر پردیش کے اکثر مہاجرین نے کراچی کا رخ کیا کراچی مہاجرین کی سب سے بڑی جائے پناہ تھا۔

جن لوگوں کے رشتہ دار کراچی میں موجود تھے انھوں نے اپنے رشتہ داروں کی طرف کوچ کیا باقی لوگ اپنے نئے ٹھکانے بنانے میں مصروف ہوگئے۔اُن دنوں کراچی بڑی تیزی سے انسانوں کے جنگل میں تبدیل ہو رہا تھا۔جھگیوں کا ایک جنگل آباد ہوتا جا رہا تھا۔

مہاجرین کی کراچی آمد اور اس زمانے کا کراچی

اس تحقیق میں اکثر ناول کراچی کی طرف مہاجرین کی ہجرت کا منظر دکھاتے نظر آتے ہیں۔کراچی کا کوئی بھی حوالہ تقسیم اور مہاجرت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔آج کل بھی جو افسانہ، ناول کراچی کا لوکیل رکھتا ہے اس میں ہر پھر کر تقسیم، ہجرت، مہاجر کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔کراچی دراصل مہاجرین کے شہر کے طور پر جانا جاتا رہا

ہے۔ اب تقسیم کے ستر سال بعد بھی کراچی میں مہاجروں کا تناسب دوسری قوموں سے زیادہ تو ہے لیکن اگلے بیس پچیس برس میں یہ تناسب پٹھان آبادی کے حق میں جھکتا نظر آ رہا ہے۔

کراچی آنے والے مہاجرین کئی طرح کے تھے وہ لوگ جن کے رشتہ دار یہاں تھے یا جو کراچی کو جائے پناہ سمجھ کر آئے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان کی آبادکاری، ان کے مسائل اور الجھنیں شروع ہوئیں۔

اس زمانے کا کراچی بہت مختلف تھا مناسب آبادی والا ہنستا بستا شہر جو کہ اپنا نام عالمی سطح پر بنا چکا تھا۔ جس کی صفائی ستھرائی، حسن ترتیب کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ جس کی صاف اور کشادہ سڑکیں روزانہ دھوئی جاتی تھیں۔

اس کراچی کا ایک منظر ناول میں کچھ یوں پیش کیا گیا ہے۔

> سلیمان راستے بھر کراچی سے متعارف کراتا رہا۔ یہ میری ویدر ٹاور ہے جو کراچی کا مشہور لینڈ مارک ہے۔ اس زمانے میں بھی کراچی میں ایسی بلند عمارتیں تھیں جو ان بچوں نے نہیں دیکھی تھیں۔ صاف ستھرا شہر تھا۔ سڑک پر کبھی کبھی سبز رنگ کی ٹرام چلتی نظر آتی تھیں۔ وہ بھی ان کے لیے ایک عجوبہ تھا۔ ان ہی سڑکوں پر اطراف میں اونٹ گاڑیاں بھی چل رہی تھیں اور گدھا گاڑیاں بھی دوڑ رہی تھیں جو سب ہی آنے والوں کی دلچسپی کا باعث تھیں۔ [۴۱]

کراچی کی کئی خصوصیات تھیں۔ پیر علی محمد راشدی بھی تقسیم سے پہلے کہ کراچی کی کچھ ایسی ہی کہانیاں سناتے ہیں۔ لوگ جب آج کے کراچی سے اُن کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ سب دیومالائی داستانیں معلوم ہوتیں ہیں۔ کراچی کی صفائی ستھرائی بے مثال تھی۔ اس کی سڑکیں کشادہ، مکانات کھلے اور ہوادار تھے اور موسم انتہائی معتدل، انگریز حیدر آباد سے کراچی صرف اسی معتدل آب و ہوا کی خاطر آئے تھے۔ سمندر کی کشش نے اس شہر کو سب کے لیے قابل قبول بنایا ہوا تھا۔ بدقسمتی آج کل سمندر کی وجہ سے ہی اکثر لوگ اس کے ساحلی علاقے پر نظریں جمائے ہوئے ہیں تا کہ وہاں پر رہائشی عمارات بنا کر مزید روپے بنائے جاسکیں۔

اس شہر کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ شروع دن سے (تقسیم کے بعد) ہی یہ چھینا جھپٹی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

مہاجرین کے ریلے اس شہر میں پہنچنے لگے نوزائیدہ حکومت کے لیے ان کو بسانا ناممکن تھا، نئے آنے والوں نے کچھ دن تو صبر کیا پھر انھوں نے لوٹ کھسوٹ اور چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ آب گم میں اسی جانب

واضح اشارے نظر آتے ہیں۔

مہاجرین کی آمد اور چھینا جھپٹی کی نفسیات

مہاجرین نے پاکستان پہنچنے کے بعد جب یہاں کہ حالات دیکھے تو انھوں نے اپنی مدد آپ کے تحت جھگیاں تعمیر کیں، پانی اردگرد کے گھروں سے لے لیا جاتا، زندگی کو کسی نہ کسی طور پر چلانا شروع کیا۔ اس عمل سے انھیں وقتی تسلی تو ہوئی لیکن جب اپنے ماضی کو یاد کرتے تو اداس ہو جاتے کہ اتنا اچھا گھر بار چھوڑ کر ان جھگیوں میں آبسے ہیں۔ اس سے ایک انتقامی جذبہ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کا اختتام لوٹ کھسوٹ اور چھینا جھپٹی تک جا پہنچا۔ جھوٹے کلیم بھی داخل کرائے گئے۔ غرض خود غرضی اور موقع پرستی کا جن جو وقتی طور پر حب الوطنی کی زنجیروں سے قید کیا گیا تھا آزاد ہو گیا اور اس نے تباہی مچانی شروع کر دی جس کے ہاتھ جو لگا لے اُڑا۔ یہ کراچی کے رزمیہ کا بڑا دردناک بیان ہے۔ وقتی طور پر یہ احسان، ایثار، خلوص کے جذبات جیسے اٹھا لیے گئے تھے۔ اس زمانے میں بھی بعض لوگوں نے حواس قابو میں رکھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں۔

> انھی دنوں کراچی میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور ہندو گھر چھوڑ کر جانے لگے۔ لوگوں نے گھروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ محلے والوں نے رفیق اور واصف سے بھی کہا کہ تم آبائی گھر چھوڑ کر آئے ہو تو یہاں کسی گھر پر قبضہ کر لو۔ مگر ان کے نزدیک قبضہ کرنے کا مطلب تھا غیر قانونی کام کرنا جس کا تصور بھی یہ بھائی نہیں کر سکتے تھے، کلیم کے لیے لوگوں کی آپا دھاپی دیکھ کر دل بجھ گیا۔[۴۲]

کراچی میں آہستہ آہستہ ان مہاجرین نے اپنے رہن سہن، روزگار کے سلسلے شروع کیے۔ کراچی کی غریب پروری نے ان کے دکھ درد کم کرنے شروع کیے۔ انھی مہاجرین کے بچے آہستہ آہستہ مختلف شعبوں میں ترقی کرنے لگے۔

پہلی نسل مہاجر ہو کر کراچی پہنچی تو بعد کی نسل امریکا اور انگلینڈ جا پہنچی۔ زندگیوں میں بڑی خوب صورت تبدیلیاں آئیں۔ ناول میں آگے چل کر فوجی حکومتوں کا بھی تذکرہ ہے۔ ساتھ ۱۹۷۱ء کے خونچکاں حادثے کا جس میں پاکستان اپنے مشرقی بازو سے محروم ہوا۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول ایک صدی کی کہانی کراچی اور اس کی آبادکاری کا مختصر احوال بیان کرتا

ہے۔ موضوع کے مطابق کراچی کا بیان اور کراچی آنے والی ایک نسل کا احوال بیان کیا ہے۔ ناول میں ہجرت، مہاجرین کی مشکلات اور مستقبل میں حالات کا بہتر ہو جانا سب کا تذکرہ ہے۔

ناول میں ملک کے سیاسی حالات کا تذکرہ ہے لیکن از حد اختصار کے ساتھ زیادہ توجہ کہانی کے بیان پر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کوکب جمیل، مٹھی بھر ہوا، مکتبہ بھوپال، کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۴۲

۲۔ ایضاً ص ۳۷

۳۔ ایضاً ص ۹۱، ۹۲

۴۔ ایضاً ص ۹۲، ۹۳

۵۔ ایضاً ص ۲۰۶

۶۔ ایضاً ص ۱۸۶

۷۔ ایضاً ص ۲۵۰

۸۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۴۴

۹۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۳۹، ۴۰

۱۰۔ جوگندر پال، خواب رَو، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۷، ۸

۱۱۔ ایضاً ص ۱۴

۱۲۔ ایضاً ص ۱۶، ۱۷

۱۳۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۵۸

۱۴۔ جوگندر پال، خواب رَو، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۱۴، ۱۵

۱۵۔ ایضاً ص ۳۰

۱۶۔ ایضاً ص ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۲، ۸۳

۱۷۔ ایضاً ص ۱۹

۱۸،۱۹۔ جوگندر پال، خواب رَو، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء ص ۲۰، ۴۸

۲۰۔ ایضاً ص ۵۰

۲۱۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۷۲

۲۲۔ زاہدہ حنا، نہ جنوں رہا نہ پری رہی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۴۶

۲۳۔ ایضاً ص ۷۳

۲۴۔ زاہدہ حنا، نہ جنوں رہا نہ پری رہی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۴۲

۲۵۔ ایضاً ص ۸

۲۶۔ ایضاً ص ۵۶

۲۷۔ ایضاً ص ۷۵

۲۸۔ ایضاً ص ۱۰۴

۲۹۔ ایضاً ص ۱۰۸

۳۰۔ ایضاً ص ۱۳۹

۳۱۔ ایضاً ص ۲۹

۳۲۔ ایضاً ص ۱۱۳

۳۳۔ ایضاً ص ۱۲۳، ۱۲۴

۳۴۔ ایضاً ص ۱۲۴

۳۵۔ ایضاً ص ۱۳۹

۳۶۔ سید مظہر جمیل، آشوب سندھ اور اردو فکشن، اکادمی بازیافت کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۷۵

۳۷۔ رضیہ فصیح احمد، ایک صدی کی کہانی، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء ص ۱۱

۳۸۔ ایضاً ص ۱۸۴

۳۹۔ رضیہ فصیح احمد، ایک صدی کی کہانی، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۱ء ص ۱۸۵

۴۰۔ ایضاً ص ۱۹۵

۴۱۔ ایضاً ص ۱۹۷

۴۲۔ ایضاً ص ۲۰۰

باب چہارم

کراچی کی طبقاتی صورتحال اور اُردو ناول

کراچی پر لکھے گئے ناولوں کے تناظر میں چوتھے باب میں جن ناولوں کا تذکرہ کیا جائے گا ان میں قرۃ العین حیدر کے دو ناولٹ ہائوسنگ سوسائٹی اور سیتا ہرن، محمد امین کا ناول کراچی والے اور فہمیدہ ریاض کا ناول کراچی شامل ہیں۔

فہمیدہ ریاض کے مذکورہ ناول کو "ناول" کہنے پر کچھ لوگ معترض ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کہانی کو کسی ہیئت میں مقید کرنا ممکن نہیں اسے سوشل رئیلزم، ڈاکومنٹری فکشن، کرٹی فکشن کوئی بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کراچی کے آشوب کو بیان کرتے ہوئے جو گتھیاں فہمیدہ ریاض نے کھولیں ہیں یا کراچی کی گنجلک صورتحال کو سمجھنے کی جو بے باکانہ کوشش ان کے ہاں ملتی ہے ویسی کسی اور کے ہاں نہیں ملتی۔ اس طویل بیانیے کو شامل کیے بغیر کراچی کے موضوع پر سیر حاصل بحث ناممکن ہوتی۔ اگر یہ ایک نان فکشن ہے تو بھی کراچی پر اس قدر بھرپور مواد کہیں ملنا مشکل ہے۔ اس لیے اس طویل کہانی کو بھی تحقیق میں شامل کیا گیا۔ کراچی کے حوالے سے اس تحریر کی بہت اہمیت ہے۔ کراچی پر ڈھکے چھپے انداز میں گفتگو ہوتی رہی ہے۔ خوف کے سائے سے ادیب، قلم کار کوئی بھی بچ نہیں سکا۔

ایک عرصے تک کراچی کے لوگ اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد جب گھر سے باہر نکلتے تو شام کو گھر لوٹنے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ موت کسی کو کہیں سے بھی اچک کر لے جاتی اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی فضا میں ایسی کھلی، واضح اور صاف منظر کشی کہیں اور نظر نہیں آئی۔

کراچی کے منظر نامے کو سمجھنے میں اس تحریر کی افادیت سے انکار ممکن نہیں اس لیے چوتھے باب کی ابتدا فہمیدہ ریاض کی طویل کہانی کراچی سے کی جاتی ہے۔

محترم جناب اجمل کمال فہمیدہ ریاض کی کہانی کراچی کے بارے میں کہتے ہیں۔

> کراچی کی کہانی کی جلد دوم میں شامل تحریر میں شہر میں جاری تشدد اور سماجی انتشار کی صورت حال کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس جلد کی ابتدا اردو کی معروف شاعر، نثر نگار اور مترجم فہمیدہ ریاض کی طوی تحریر کراچی سے ہوتی ہے۔ جس

میں شہر کی صورت حال کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنے کی تخلیقی کوشش کی گی ہے۔ اس تحریر کو ہیئت کے اعتبار سے کسی خانے میں قید کرنا ممکن نہیں، لیکن ایک زندہ اور جرأت مند ادبی دستاویز کے طور پر منفرد ہیئت اپنا جواز خود پیش کرتی ہے۔[1]

فہمیدہ ریاض کی کراچی

فہمیدہ ریاض کی یہ طویل کہانی کراچی دراصل کراچی سے متعلق ایک ایسی دستاویز ہے جو کراچی کے قلب میں اتر کر تخلیق کی گئی ہے۔ اس تخلیق میں کراچی کے سارے رنگ (اور بدقسمتی سے کراچی کے سارے رنگ ہی زہر میں لتھڑے ہوئے) شامل ہیں۔ یہ کراچی کی داستان ہے سرتاپا کراچی جو ملک عزیز کی پرونق بندرگاہ کا مالک ہے غرض یہ داستان حقیقت کے رنگ میں لکھی ہوئی ہے اور کراچی کے خط و خال کو سمجھنے میں آسانیاں فراہم کرتی ہے۔

اس کہانی کو تحقیق میں شامل کرنے سے کراچی کو قریب سے دیکھنے میں بہت سہولت ہوئی لہٰذا یہ کہانی تحقیق کا اہم حصہ ہے۔

اس کہانی کی بار بار کی قرأت کے باوجود یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ کہانی کے کس حصے سے اقتباس شامل کیے جائیں اور کس حصے کو شامل نہ کیا جائے کیونکہ بیان اس قدر بھرپور اور حقیقت کے قریب ہیں کہ ساری کہانی گویا تقاضا کرتی ہے کہ میرے بغیر بیان ادھورا ہوگا۔

کراچی کے بارے میں اگر اہم واقعات کی فہرست بنائیں وہ واقعات جو کراچی کو بنانے، بگاڑنے، سنوارنے کسی بھی عمل میں مصروف رہے ہیں تو وہ کچھ یوں ہوں گے۔

تقسیم اور مہاجرین کی آمد، ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء، صدر ایوب کا فاطمہ جناح سے مقابلہ، ذوالفقار علی بھٹو کا عروج اور لسانی جھگڑے کی ابتدا، طلبہ تنظیمیں، کراچی یونیورسٹی اور مہاجر قومی موومنٹ کا ظہور، چھینا جھپٹی، بھتہ خوری، قبضہ گروپ، جہادی عناصر، مہاجر پٹھان تنازعے، مہاجر قومی موومنٹ کی عملی سیاست، آپریشن کلین اپ، مشرف کا دور، متحدہ قومی موومنٹ کا سنہری دور۔

اس فہرست میں کمی بیشی کی گنجائش تو ظاہر ہے موجود ہے لیکن تحقیقی نقطہ نظر سے باقی واقعات انہی واقعات کی چھوٹی شاخیں ہیں۔ بڑے معاملات یہی ہیں جنھوں نے آگے چل کر کراچی کے منظر نامے پر اپنا عکس چھوڑا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے اس سارے منظر کو اپنی فنی مہارت اور چابک دستی سے یوں اُجالا ہے کہ تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے۔ کہانی کی ابتدا ایک عورت کے سفر سے ہوتی ہے جو اپنے داماد، بیٹی اور نواسی سے ملنے لندن جارہی ہے۔ یہ عورت کراچی سے تعلق رکھتی ہے اور کراچی کے بارے میں خیالات اس کے ذہن میں یکے بعد دیگرے آتے چلے جاتے ہیں جیسے سمندر کی لہریں ایک کے بعد دوسری متواتر۔ انہی خیالات میں وہ کراچی کے مسئلے کے وجود اور حل کے بارے میں سوچتی ہے اور پھر کہانی چل پڑتی ہے۔ یہ واضح رہے چونکہ تحریر میں ڈاکومینٹری کا عنصر نمایاں ہے تو اس کا بیان انھی ٹکڑوں کی مدد سے ہوگا واقعات میں زمانی تسلسل کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

عورت کی سوچیں ہی آگے بڑھ کر پوری کہانی کا روپ دھار لیتی ہیں ایک کے بعد ایک واقعات کی لہریں سر اٹھاتی ہیں۔ خون کے چھینٹے اُڑاتی ہیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ کہانی کے چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں جو کہانی کو ایک تسلسل سے آگے بڑھاتے ہیں۔

کراچی میں مہاجرین کی آمد، چھینا جھپٹی کی ابتدا

کراچی کے بارے میں لکھے گئے تمام ناول، کہانیاں اس بارے میں صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ کراچی کی جغرافیائی صورتحال میں جو ہری تبدیلی مہاجرین کی آمد سے ہوئی۔ کراچی کی آبادی ۴ لاکھ نفوس سے بڑھ کر ۱۱ لاکھ تک جا پہنچی تھی آبادی کا یہ سیلاب مہاجرین کی آمد تھا۔ مہاجرین کے ریلے رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اس مہاجرت کے دوران ان لوگوں نے آگ اور خون کے دریا عبور کیے تھے۔ اپنوں سے بچھڑنا، راستے کی صعوبتیں برداشت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ لوگ جب ان مشکل حالات سے گزر کر پاکستان پہنچے تو سندھ کے اکثر شہروں میں سکونت اختیار کی لیکن اکثریت کا رخ کراچی کی طرف تھا۔ کراچی آمد پر انھوں نے اپنی مدد آپ کے تحت رہنے کا انتظام کیا۔ کچھ اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچ گئے۔ کچھ نے قطار اندر قطار جھونپڑیاں، جھگیاں ڈال لیں۔ یہیں ایک اور رجحان کا بھی سراغ ملتا ہے کہ مہاجرین کی طرف سے ہندوؤں، سکھوں کی املاک کو بزور بازو اپنا بنانے کا رجحان۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن مہاجرین کے خیال میں چونکہ وہ قربانی دے کر ملک پاکستان پہنچے ہیں لہٰذا اب یہ اُن کا حق ہے کہ اپنے لیے وسائل حاصل کریں۔ یہ وسائل زیادہ تر مکانوں، فلیٹوں کی چھینا جھپٹی سے عبارت تھے۔ ایسا ہی ایک منظر فہمیدہ ریاض بھی دکھاتی ہیں۔ اس منظر کی خاصیت یہ ہے کہ نئی نسل جس نے ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۰ء میں جوان ہوکر ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے، ہوش سنبھالتے ہی کیا سیکھ رہی ہے۔ شاید مستقبل کی اس سے بہتر پیش گوئی ممکن نہیں۔

چھ برس کا جلال ایک سہ منزلہ عمارت میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ کے نیچے، دروازے پر کچھ خوفزدہ سا کھڑا حیرت سے ٹکٹکی باندھے برابر کی گلی کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک متروکہ مکان کا تالہ توڑا گیا ہے اور سامان لوٹا جا رہا ہے۔ گلی میں شور ہے، چھین جھپٹ میں لوگوں کے بال بکھر گئے ہیں، دامنوں کے چاک ادھڑ گئے ہیں۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ جلال چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تتلا کر پوچھتا ہے۔ یہ کا ہولہا ہے؟ کچھ نہیں سامان لوٹا جا رہا ہے۔ تم اندر آجاؤ۔ اماں جلال کی بڑی بہن کو اسے اوپر لانے کے لیے بھیج کر باورچی خانے میں واپس چلی جاتی ہیں۔ لٹتے مکان کے سامان میں کسی ہندو بچے کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکتی ہوئی جلال کی گلی میں پہنچ جاتی ہے۔ ننھا جلال ڈرتے ڈرتے اسے اٹھاتا ہے پھر جب اس کا اعتماد بحال ہوجاتا ہے تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے۔ گھر میں آکر وہ اماں کو گیند دکھاتا ہے۔ اماں دیکھو ہم نے بھی لوتا۔[۲]

ننھا جلال اپنی توتلی زبان میں آنے والے اُس سیلاب کی نشاندہی کر رہا ہے جو کراچی کی خوشیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ آئندہ دنوں میں کراچی نے بھتہ، لوٹ مار، بینک ڈکیتیاں، اغوا برائے تاوان، پروٹیکشن منی، زمینوں پر قبضے، اسلحہ کی خرید و فروخت غرض ناجائز طریقے سے دولت کمانے کے تمام ممکنہ طریقوں کو کراچی میں قابل عمل ہوتے دیکھا۔ اس شہر نے لوگوں کو اربوں پتی بنایا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ لمحوں کی خطا صدیوں کی سزا کراچی والوں پر عملی طور پر صادق آتی ہے۔

اسی لوٹ مار کا ایک اور واقعہ جو اپنے بیانیے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ بالکل ایک عام سی بات ہے کسی انہونی کا تذکرہ نہیں ہو رہا۔

پچاس کے قریب برسوں میں ایک میگا پولس بن جانے والے اس شہر کی آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ نفوس کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں یہ آبادی گیارہ لاکھ ہو چکی تھی۔ قدیم آبادی سے بھی دگنی تعداد میں یہاں آکر بسے مہاجروں نے اس شہر کو پلک جھپکتے میں ایک مہاجر شہر بنا دیا تھا۔ ان میں بھاری تعداد اردو بولنے والوں کی تھی جو مہاجر کیمپوں سے نکل نکل کر شہر بھر میں پھیل رہے تھے۔ جن سے بَن پڑا متروکہ مکانوں کے تالے توڑ کر ان پر قبضے کر رہے تھے یا جھگیوں جھونپڑیوں سے پٹے میدان نظر آسکتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی تک یہ لوگ مکانوں، فلیٹوں میں منتقل ہو چکے تھے۔[۳]

یہ اس کراچی کے ابتدائی خط و خال ہیں جو آگے چل کر کہانی کے ساتھ پھیلتا چلا جائے گا جس کی وسعت اس قدر ہوگی کہ غیر ملکی کھلاڑی بھی اس کھیل میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ چار لاکھ آبادی کا شہر دور کروڑ لوگوں کی آماجگاہ بنتے بنتے کتنے عظیم مصائب کا سامنا کر چکا ہوگا، یہ تفصیلی احوال فہمیدہ ریاض کے ہاں کثرت سے موجود ہے۔

یہ شہر امن وامان کا گہوارہ تھا۔ عیسائی، ہندو، سکھ، مسلمان سب اس شہر مین چین وآرام سے رہتے تھے۔ انگریزوں نے اس شہر کی ترقی کو بتدریج اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ اس شہر کی صفائی ستھرائی، ذرائع آمدورفت، خوب صورتی، موسم کی لوگ تعریف کرتے تھے اور کراچی آنا ان کے لیے ایک حسین تجربہ ہوتا تھا۔

گرمی کے ستائے سندھی وڈیرے اس شہر کا رخ کرتے ان کا تفصیلی احوال پیر علی محمد راشدی کے ہاں ملتا ہے جنھوں نے کراچی کی خوب صورت اور اس کے مہربان شہری نمائندوں کے قصے بڑی شیفتگی سے بیان کیے ہیں۔

شہر کراچی کے اس ابتدائی منظر نامے پر فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں۔

> اردو میں کٹ کٹ بولنے اور بولتے ہی رہنے والے مہاجرین (جیسا کہ بہت سے دوسری زبان بولنے والوں کو شکایت ہے) ۱۹۴۷ء میں جس شہر میں پہنچے وہ ایک خوبصورت، صاف ستھری اور مختصر بندرگاہ تھا، گو اس وقت بھی یہ اپنی ماہیت میں وسیع المشرب تھا۔ یہاں ایران سے ہجرت کر کے سورت کی بندرگاہ پر اُترنے اور پھر کراچی میں آکر بس جانے والے پارسیوں اور بہاریوں کی کالونیاں آباد تھیں، بوہروں اور خوجوں کے محلے تھے، پرتگالی اثر ونفوذ میں عیسائیت اختیار کرنے والے رومن کیتھولک گوانیوں کی بستیاں تھیں جنکے بنائے ہوئے چرچ جابجا ایستادہ ہیں۔[۴]

شہر کی یہ تفاصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آگے چل کر جب کہانی شہر کی تباہی بربادی کے نوحے بیان کرتی ہے تو قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس شہر پر کون سا آسیب مسلط ہوگیا ہے جس نے سارے شہر کو اپنے سحر جکڑ لیا ہے۔ شہر پر قبضے کی خاطر، کیونکہ شہر واقعتاً سونے کی چڑیا ہے۔ پاکستان کی معیشت میں مرکزی کردار ادا کرنے والے شہر پر قبضے کی خاطر تمام باسیوں نے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ کراچی قیام پاکستان سے ہی طوفانوں کی زد میں رہا ہے۔

ملکِ پاکستان غیر یقینی سیاسی صورتحال جو قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بعد شروع ہوئی اس نے پورے ملک پر بالعموم اور کراچی پر بالخصوص سیاہ بادل تان دیے تھے۔ لیاقت علی خان کی وفات کے بعد وزرائے اعظم کی یکے بعد دیگرے تبدیلی، برطرفی آخر کار صدر ایوب کی آمریت پہ منتج ہوئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سندھ سے کراچی کو جدا کر کے ملک کا دارالخلافہ بنا دیا گیا جس کو سندھیوں نے کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور رہی سہی کسر ون یونٹ نے پوری کر دی۔ گویا بربادی کے اجزا آہستہ آہستہ اکٹھے ہو رہے تھے۔

صدر ایوب اور کراچی

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد بدقسمتی یہ ہوئی کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان وفات پا گئے ان کی وفات نے سیاسی عدم استحکام کو جنم دیا۔ محلاتی سازشیں عروج پر پہنچ گئیں اور آخر کار ان کا انجام صدر ایوب کی فوجی آمریت پر ہوا۔

صدر ایوب کے دور اقتدار میں کراچی سے ان کی پرخاش واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ضرور رہی ہوگی لیکن فہمیدہ ریاض اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر صدر ایوب کی ذاتی زندگی کے ایک گوشے کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سلطنتوں، ریاستوں، حکومتوں اور ملکوں پر فرد واحد کی پسند و ناپسند بعض اوقات کس حد تک اثر انداز ہوتی، گویا پوری ریاست کا مقدر ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی شہر کراچی کے ساتھ ہوا۔ صدر ایوب نے دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کر دیا۔ یہ سب کیسے ہوا اس عمل کو فہمیدہ ریاض کیسے دیکھتی ہیں؟

> یہاں کا پانی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔ ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء لگانے کے بعد جب فیلڈ مارشل ایوب خان یہاں آئے تو ان کا ہاضمہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ملک کے دارالخلافے کو اس سمندری، گرم مرطوب علاقے سے (اور یہاں آبسنے والے دبلے پتلے، سانولے، تیزی سے چرچر بہت زیادہ بولنے والوں کے شور مچاتے جنگل سے) نکال کر دور شمال میں اپنے گاؤں ریحانہ کے پاس بسانے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی بدہضمی کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ (یہ بات راقم الحروف کو انیس سو باسٹھ یا تریسٹھ میں ایوب خان کی اُس وقت نوعمر صاحبزادی نے ان کے پرسکون گاؤں ریحانہ کی آبائی رہائش گاہ میں بتائی تھی۔ راقم کالج کی لڑکیوں کے ساتھ مری اور ایبٹ آباد کی سیر و سیاحت کو گئی تھی۔ ساتھ پڑھنے والی ایک

لڑکی ایوب خان کی صاحبزادی کی دوست تھی)۔[۵]

یہ حقائق چشم کشا ہیں کراچی کے موسم سے تو کد تھی ہی آگے چل کر حالات کچھ ایسے بنے کہ شہر کراچی بذات خود بھی ان کی نظروں سے گر گیا۔ کراچی اپنی نوع میں ایک ایسا شہر ہے جو ہار ماننے کو تیار نہیں اس کو فتح کرنے والے اکثر یہی غلطی کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کراچی کو فتح کر لیں گے لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں۔

صدر ایوب نے اس شہر کو اس کے موسم کو یکسر رد کر دیا۔ یہاں کے باشندے بھی ان کی نظروں میں غیر معتبر ٹھہرے اور یوں کراچی سے اس کا اختصاص بھی چھین لیا گیا۔ اس شہر نے اپنی صلاحیتوں اور اپنے باسیوں کی استعداد پر ایک دفعہ پھر بھروسا کیا اور سرخرو ٹھہرا۔ دارالخلافے کے منتقل ہونے سے بھی کراچی کی صنعتی ترقی پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ یہ شہر بڑی سرعت سے آگے بڑھتا رہا۔ اندرون ملک سے مہاجرت کا سلسلہ بھی جاری رہا اس کی آبادی بھی اسی سرعت سے بڑھتی رہی۔

صدر ایوب اس شہر کو کس نظر سے دیکھتے تھے فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں۔

> ۱۹۵۸ء میں ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے کے بعد، دراز قد، سرخ و سفید سربراہ مملکت جنرل ایوب خان دارالسلطنت کو کراچی سے اپنے گاؤں ریحانہ کے نزدیک لے گئے۔ اُنھیں کراچی اور کراچی کے باشندے کچھ خاص پسند نہ تھے۔ کلبلاتی آبادی کے روز افزوں شور شرابوں اور مطالبوں سے اکتا کر انھوں نے کہا تھا کہ اگر انہیں حکومت پسند نہیں تو جہاں چاہیں چلے جائیں آگے تو سمندر ہے۔ (ان کے منہ سے نکلا یہ جملہ آناً فاناً مشہور ہو گیا تھا اور آج تک اتنا مشہور ہے کہ وقتاً فوقتاً مہاجروں کے مسئلے سے تنگ آنے والے مذاق میں طنز میں اور کبھی سچ مچ انھیں سمندر کا رخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں)۔ کچھ عرصہ بعد جب ایوب خان نئی مسلم لیگ بنائیں گے۔ جو درحقیقت ان کی ذاتی مسلم لیگ ہوگی، تو کراچی کے باسی اس میں شامل نہ ہوں گے۔[۶]

اس خود وضاحتی پیراگراف کے بارے میں کچھ کہنا ہرگز ضروری نہیں لیکن ابھی وہ مقام نہیں آیا جہاں ان کچر کچر بولنے والے چھوٹے قد کے سانولے لوگوں کو سبق سکھانا ضروری ہو جاتا وہ مقام بس آیا ہی چاہتا ہے جب صدر ایوب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا۔

صدر ایوب اپنے بنائے ہوئے آئین کے تحت ہی صدارتی اکھاڑے میں اترے ہیں اور ان کے

مدمقابل فاطمہ جناح ہیں۔ خلق خدا ان کی پشت پناہ۔ اس مقابلے میں صدر ایوب فاتح بن کر ابھرے، ڈھاکہ اور کراچی دو ایسے مقام تھے جنھوں نے فاطمہ جناح کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ بات صدر ایوب کو قطعاً پسند نہیں آئی ان کے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، چوں کہ کراچی ایسا شہر ہے جو ہار نہیں مانتا چاہے کوئی آمر ہی مدمقابل کیوں نہ ہو، اتنا دم خم ہمارے کسی اور شہر میں کہاں؟

صدر ایوب کو کراچی سے شکست ہوئی لیکن وہ مجموعی طور پر صدارتی انتخابات جیت چکے تھے اُن کے صاحبزادے گوہر ایوب نے جشن فتح منانے کے لیے کراچی کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی یہاں کے باسیوں کو سبق سکھانے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تا کہ ان کو ان کی حد میں رہنا آجائے۔ اس سارے منظر کو فہمیدہ ریاض نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> یہ ۱۹۶۵ء ہے جنرل ایوب خان اور قائداعظم کی بہن فاطمہ جناح انتخابی حریف ہیں۔ اس کڑے مقابلے میں کراچی کے باسیوں نے مہاجروں کی اس پہلی بڑی لہر نے جو کراچی کی زمین پر چھا گئی ہے۔ فوجی جنرل پر جناح کی بہن کو ترجیح دی ہے۔ کراچی شہر نے جنرل ایوب خان کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے مراعات زدہ نظام تک میں بغاوت کی راہ نکالتے ہوئے فاطمہ جناح کو ووٹ دیا۔ ایوب خان بہرحال جیت گئے ہیں (کرسی نشین فوجی جنرل ہار نہیں سکتے) اور اب ان کے صاحبزادے مسمی گوہر ایوب کراچی والوں سے اس گستاخی کا انتقام لینے آئے ہیں۔ ایک جشن فتح منانے جس میں ان چرچر چرتیزی سے بولنے والوں پست قد، دبلے، پتلے، سانولے اور برصغیر کے نہایت گرم خطوں سے نازل ہونے والے سرکشوں کو سبق سکھایا جائے گا۔ اُس رات پی آئی بی کالونی پر حملہ نہیں ہوا تھا مگر شہر کی زیادہ غریب آبادیوں، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مہاجرین پر حملہ ہوتا رہا تھا۔ مارنے والے مقامی نہ تھے، وہ ملک کے شمالی مغربی سرحدی علاقوں سے خاص طور پر لائے گئے اجنبی بتائے جاتے تھے۔ ان وارداتوں نے شہر کے غریب اردو بولنے والے علاقوں میں شدید خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر شاید نہ ملے۔ مگر اس ملک کی اصل تاریخ اپنی لافانی نظموں میں رقم کرنے والے شاعر فیض احمد فیض نے ان ہی کے بارے میں لکھا تھا۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

قاتلوں کو کبھی پکڑا نہیں گیا تھا نہ کسی پر فرد جرم عائد کی گئی تھی

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا ۷

آمریت کے دور میں ایسا ہوتا رہتا ایسا ہی ایک سانحہ ۱۲ مئی ۲۰۰۷ء کو بھی کراچی میں ہوا تھا جس کے ذمہ داروں کا تعین آج تک نہیں ہوسکا، نہ کبھی مستقبل میں اس کا امکان ہے۔

صدر ایوب کی مطلق العنانی نے کراچی کو خاصے گہرے زخم لگائے تھے۔ کراچی کے شہری اس صدمے کو کبھی نہیں بھولے اور بعد میں حالات نے جو رخ اختیار کیا اس میں صدر ایوب کی اس سنگدلی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مہاجروں کا اپنے حقوق کے لیے متحد ہونا اور ایک نئی تنظیم کا سنگ بنیاد رکھنا اور پھر شہر پر ایک لمبے عرصے تک بلا شرکت غیرے حکومت کرنا یہ سب خواب صدر ایوب کی سنگ دلی نے دکھائے اور مہاجروں کی ہمت نے ان کو عملی جامہ پہنایا۔

مہاجر قومی موومنٹ کے ابتدائی خط و خال اسی دن طے ہوگئے تھے جب صدر ایوب نے نہتے جھگی نشینوں پر دھاوا بولا تھا۔ شہروں کی زندگی میں کوئی واقعہ چھوٹا بڑا نہیں ہوتا ہر واقعہ برگ و بار لاتا ہے۔ کراچی میں بھی ایسا ہی ہوا بہر کیف صدر ایوب کا دور کراچی کے لیے انتہائی مضر ثابت ہوا۔

کراچی، سندھی قوم پرستی اور مہاجر

صوبہ سندھ کو ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے الگ کر کے نیا صوبہ بنایا گیا۔ مسلمانوں نے اس کے لیے خاصی جدوجہد کی لیکن ۱۹۴۷ء تک کراچی میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ کراچی مکمل طور پر ہندوؤں کا شہر تھا۔ جب تقسیم ہوئی تو ہندوؤں کی کمی مسلمان مہاجرین نے پوری کی۔ سندھ کے مسلمان کراچی سے الگ تھلگ رہے۔ کراچی میں سندھ کے وڈیروں کی آمد گرمیوں کے موسم میں ہوتی اور موسم گرما گزارنے کے بعد وہ واپس اپنے علاقوں میں چلے جاتے۔

مہاجرین کی آمد کے بعد بھی سندھ کے لوگوں نے رہائش کے لیے کراچی کو پسند نہ کیا۔ سندھی لوگوں کی آمد ذوالفقار علی بھٹو کے بعد شروع ہوئی انھوں نے وڈیروں کو کراچی میں پلاٹ دیے لیکن سندھی وڈیروں نے

صنعت کاری، کارخانہ داری کے بجائے اُن جگہوں پر اپنے بڑے بڑے محلات تعمیر کر لیے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی شدید خواہش کے باوجود سندھی وڈیرے اپنے لائف سٹائل کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے سندھی لوگوں کو کراچی میں ملازمتیں دیں اور سندھ کے لوگ کراچی پہنچے اسی دوران سندھی زبان کا سکولوں کے نصاب میں لازمی قرار دینا اور کوٹہ سسٹم کا نفاذ سندھی، مہاجر تنازعے کی بڑی وجہ بنا۔ سندھی، مہاجر تنازعے کی وجہ سے ابتدا میں لسانی جھگڑے شروع ہوئے جنھوں نے آگے چل کر شہر کی فضا کو خاصا خراب کیا۔

فہمیدہ ریاض نے بھی اس مسئلے پر توجہ کی اور چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے ایک بڑا پیغام پہنچا دیا۔ فہمیدہ ریاض نے کسی بھی مسئلے کی اوپری پرت کو نہیں چھوا بلکہ انھوں نے مسئلے کی گہرائی میں اتر کر ایسا جان دار تجزیہ کیا ہے کہ اُس سے اختلاف کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔

سندھیوں کی کراچی آمد اور پھر اُن کا کراچی سے نکل جانا سندھیوں کا مہاجروں کے بارے میں رویہ اور مہاجروں کے لیے اُن کے دل میں پائی جانے والی کدورت کو بھی انھوں نے محسوس کیا ہے۔

بدلے میں مہاجرین بھی سندھیوں کو ناپسند ہی کرتے رہے ہیں۔ان سب کا تذکرہ فہمیدہ ریاض نے اپنے ناول کراچی میں کیا ہے۔سندھیوں کی آمد بھٹو کے زمانے میں شروع ہوئی ہر چند سندھیوں نے کراچی اور سندھ کو ایک دوسرے سے جدا کبھی نہیں سمجھا لیکن کراچی کبھی سندھی مسلمانوں کا اکثریتی شہر نہیں بن پایا، اس بارے میں فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں۔

> اندرون سندھ سے سندھی کراچی میں پہلی بار ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آئے ،کلرکوں اور نائب قاصدوں کے کئی گروہ جو سستی آبادیوں میں کم کرائے پر ملنے والے فلیٹوں اور کوارٹروں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے گول سروں اور گھنگھریالے بالوں والے چہرے اشتیاق سے چمکتے تھے۔ وہ جوش وخروش سے ہمارا کراچی کہنے لگے تھے۔ ۸

یہ لوگ آنے کو تو آ گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس طرح نہیں آیا جیسے مہاجر آئے تھے یعنی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اور بیچ باچ کر اور جن کے سامنے صرف سمندر تھا اس لیے یہ یہاں پر مستقل ضم نہ ہو سکے جیسے ہی ہوا مخالف چلی سندھی اپنے گوٹھوں میں واپس چلے گئے۔ سندھ کے وڈیروں اور عام لوگوں نے کبھی کراچی میں مستقل رہنے کی نیت ہی نہیں کی وڈیروں کے لیے یہ ایک پکنک سپاٹ تھا اور ہے عام سندھی صرف ملازمت کی

خاطر آئے تھے اور ملازمت کی ذمہ داریاں جیسے تیسے نبھا رہے تھے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو کب لائیں گے تو جواب دیتے۔

> اس پر انھوں نے معصوم اور بشاش قہقہہ لگایا تھا (جیسا کہ دیہات سے نئے آنے والے سندھی کلرک لگاتے ہیں) پھر ایک دوسرے کو چور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا تھا، اڈی، ادھر کا بھروسا ہی کیا۔ ابھی کل کو بھٹو کی حکومت چلی جائے تو ہم سب کان لپیٹے وری گوٹھ جا رہے ہوں گے۔ اور ہوا بھی یہی، بھٹو حکومت کے خلاف ۱۹۷۷ء میں پی این اے کی تحریک کے دوران سندھی کلرکوں کے فلیٹ کے نیچے رات رات بھر ڈھول بجائے جانے لگے۔ دو تین راتوں تک انھوں نے شہر کو خالی کر دینے کے اس صوتی مطالبے کی تھاپ سنی، پھر کان لپیٹے وری گوٹھ چلے گئے۔ ۹

سندھیوں کو بھی اسی طرح مہاجرین سے شروع کے ایام کے علاوہ جب اُن کی ہجرت اور مہاجرت کی وجہ سے مہمان نوازی کی گئی، کبھی کوئی خاص اُنس نہیں رہا بلکہ وہ ان کے وجود کو ایک بوجھ سمجھنے لگے۔ مہاجرین کی آمد سے سندھیوں کو کئی خوف دامن گیر ہوئے۔ پہلا تو اپنے کلچر، ثقافت اور سب سے بڑھ کر زبان کے مٹ جانے کا، دوسرا سندھ کی دھرتی میں اپنے گھر میں اقلیت بن جانے کا خوف یہ خوف بہت خطرناک تھا۔ سندھی اس خوف کو کبھی دل سے نہ نکال سکے کہ جب وہ اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن جائیں گے تو ان کی زندگی کیسی ہوگی۔

مہاجرین کراچی کی سیاست میں جب چھا گئے تو اُن کے دل میں صوبے کا حکمران بننے کی ترنگ تو جاگی ہوگی اگر ایسا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ وہ سوال ہے جو شاید سب سے پہلے سندھیوں نے اپنے آپ سے پوچھا ہوگا۔

اس سارے منظرنامے کو ذہن میں رکھا جائے تو سندھیوں کا مہاجرین کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہ رکھنا سمجھ میں آتا ہے۔ سندھ کے اخبار، سندھ کے باسی مہاجرین کو اپنے وسائل پر قبضہ کرنے والی مخلوق سمجھتے ہیں اس لیے جب فہمیدہ ریاض اس مسئلے پر گفتگو کرتی ہیں تو لکھتی ہیں۔

> وہ مہاجر صوبہ بنانے کا ملک سے علیحدگی کا نہیں، صرف صوبہ بنانے کا مطالبہ کرنے والوں کو حکومت کا بلکہ ریاست کا باغی قرار دیتے ہیں، اور انھیں (کم از کم کئی ہزار نفوس کو) سرعام

پھانسی پر لٹکانے کے جواز میں آئین سے شقیں نکال سکتے ہیں وہ تمام مہاجروں کو صرف
دہشت گرد کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔[۱۰]

اس سارے منظر نامے سے لسانی جھگڑے، سندھی مہاجر چپقلش کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کراچی میں مہاجرین کا اقتدار، سندھیوں کو کبھی اچھا نہیں لگا اس کا بدلہ انھوں نے پورے سندھ کی حکمرانی سے دیا اور جب کبھی ان دونوں کو اکٹھا رہنا پڑا یہ ایک مجبوری کا اور خود غرضی کا ساتھ اس میں دلوں کا ملاپ نہ کبھی پہلے ہوا اور نہ سر دست اس کے امکان ہیں۔

مہاجر قومی موومنٹ، آغاز، عروج، مسائل

کراچی پر لکھے گئے ناول یا کراچی پر کی گئی کوئی بھی بات مہاجرین کے تذکرے اور مہاجر قومی موومنٹ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ مہاجر قومی موومنٹ کراچی کی سیاست کی واحد ایسی جماعت ہے جو اکیلی اس شہر پر حکومت کرتی رہی ہے گو اس کو ہمیشہ بہت سی مشکلات کا سامنا رہا لیکن ایم کیو ایم نے اپنا تسلط کبھی کمزور نہیں پڑنے دیا۔ پاکستان کی باقی ماندہ سیاسی جماعتیں اپنے طور طریقوں میں ایم کیو ایم سے بے حد مختلف ہیں۔ ایم کیو ایم اپنے قیام سے لے کر الطاف حسین کی ملک دشمن تقاریر تک کراچی کے منظر نامے کی اکیلی مالک تھی۔ آج کل ایم کیو ایم کو مشکلات کا سامنا ہے۔ ان کے سامنے مستقبل کے اہداف واضح نہیں لیکن سر دست ماضی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

ایم کیو ایم کیسے بنی؟ اس نے یہ عروج کیسے حاصل کیا؟ جماعت کا نظم و ضبط اس قدر مثالی کیسے ہے؟ قائد سے غیر مشروط وفاداری کیوں؟ منزل نہیں راہ نما چاہیے؟ قائد کا غدار موت کا حقدار ہے؟

یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوال ہیں جو ایم کیو ایم کی بُنت کو سمجھنے کے لیے حل کرنے بے حد ضروری ہیں۔

ایم کیو ایم سے پہلے بھی مہاجروں کے حقوق کے تحفظ کی بات ہوتی رہی ہے کبھی آدھی کبھی ادھوری (اس کا تفصیلاً ذکر پہلے باب میں موجود ہے) تو ایم کیو ایم میں نیا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں فہمیدہ ریاض اپنی طویل تحریر کراچی میں باب "خون کی بو چھاڑ میں" دو خیالی کرداروں کے ذریعے دیتی ہیں یہ جواب سارے مسئلے کی جڑ کو بیان کرتا ہے۔

ایم کیو ایم دوسری سیاسی تنظیموں سے مختلف ہے۔ اس اختلاف کو اگر گہرائی سے سمجھنا چاہیں تو چند پہلو

سامنے آتے ہیں ان کا تذکرہ تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

سب سے پہلے تنظیم ایسی ہو جو اپنے کارکن کی انا کو توڑ دے۔ کارکن بڑی مشین کا کل پرزہ بن جائے اور اپنی سوچ، فکر تنظیم کے پاس گروی رکھوا دے۔ خود سے فیصلہ کرنے کا عمل معطل ہو کر تنظیمی فیصلے میں ڈھل جانے کا عمل بن جائے۔

مہاجرین کو اپنی علمی قابلیت پر ناز تھا اور وہ واقعتاً پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ تھے اور جب ایم کیو ایم نے ان کو اپنایا تو نتیجہ کیا نکلا؟ آج مہاجرین اپنے اس ہنر پر ناز کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

تنظیمی امور میں قائد کا عہدہ ایک دیو مالائی اور مافوق الفطرت قوت کا خالق و مالک بنانا۔ ایم کیو ایم کے بڑے بڑے حامی بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ الطاف حسین نے ایم کیو ایم پر مطلق العنان بن کر حکومت کی ان دنوں میں بھی جب وہ بیرون ملک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔

یونٹ، سیکٹر کی تقسیم اور ان پر کڑی گرفت، تنظیم نے اپنے آپ کو یوں منظم کیا کہ کوئی شخص، کوئی فرد تنظیم کی پہنچ سے نہیں نکل سکتا تھا۔ تنظیم کا ریڈار اس قدر طاقت ور تھا کہ وہ کارکن کو پاتال سے نکال لانے کی اہلیت رکھتا تھا۔

مضبوط دفاعی اور حملہ کرنے کا نظام یعنی ایسے لوگوں کی کھیپ جو اپنے منحرف کارکنان اور دشمنوں کی سرکوبی کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا، بوری بند لاشیں اور تشدد کرنے کی رسم ان سب ہتھیاروں سے لیس جماعت کے سامنے کس کی مجال تھی کہ ٹک سکے۔

ان نکات کو ذہن میں رکھنے سے ان سوالات کے جواب سامنے آتے ہیں جو گفتگو کی ابتدا میں اٹھائے گئے ہیں۔ تنظیم کی ابتدا کے بارے میں فہمیدہ ریاض اپنے دور کرداروں سے ایک مکالمے میں لکھتی ہیں۔

> پھر آتی ہے تنظیم بھئی ہم بیزار تھے پارٹیوں کی بدنظمی سے۔ ہم نے سوچا کہ تنظیم اتنی مضبوط ہونی چاہیے کہ کوئی کارکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکے اپنا ہی تصور منتخب ممبران اسمبلی اپنے گھر نہیں جاسکتے۔ اب وہ صرف تحریک کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ اُن کے گھر والوں پر بھی نظر رکھی جائے گی۔ اگر منتخب نمائندہ گمراہ ہو جائے تو اُس کے خاندان والوں کی خیر نہیں انا کو توڑا جائے۔ مہاجروں کو سب سے زیادہ ناز اس پر تھا کہ وہ پاکستان بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، ان میں پڑھے لکھوں کی شرح فی الحقیقت دوسری تہذیبی اکائیوں سے بڑھ کر

تھی۔اور تحریک نے ان کی ایک پوری نوجوان نسل کو تعلیم سے بے گانہ کر دیا وہ جاہل ہو گئے۔ صرف نعرہ بازی، جلسے جلوس میں مشغول، جیئے مہاجر! مہاجروں کو دوسری سیاسی جماعتوں پر اعتراض تھا کہ ان کی قیادت وڈیروں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے۔تحریک کے اپنے قائد وڈیرے تو خیر نہ بن سکے مگر اس شہری، تعلیم یافتہ روشن خیال جماعت کے سربراہ سرعت سے پیر بن گئے۔ پاکستان کے اس جدید ترین شہر کے اندرونی گلی کوچوں میں پتوں، پھولوں اور پتھروں میں ان کی مبارک شبیہ نمودار ہونے لگی اور لاکھوں پڑھے لکھے روشن خیال مہاجران باتوں کو یکسوئی کے ساتھ نظرانداز کرتے رہے۔[11]

ایم کیوایم کی ابتداء سے لے کر اب تک کی پوری تاریخ ان سب باتوں کی سچائی کی گواہی دیتی ہے۔ الطاف حسین کے زیر کنٹرول اس جماعت نے قائد کی محبت میں کس کس بات کا دفاع نہیں کیا۔ کیسے قائد کے کہنے پر شہر کا شہر بند ہوتا رہا۔ کیسے قائد کا اشارہ شہر کی زندگی کو جامد کر کے رکھ دیتا تھا یہ سب کچھ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ میڈیا اور اخبارات اس صورتحال کو اُجاگر کرتے رہے ہیں گو کہ سچ بولنا کبھی آسان نہیں رہا لیکن باقی ماندہ ملک میں ایم کیوایم کی جو شکل دکھائی جاتی تھی وہ کبھی پسندیدہ نہیں رہی۔

ایم کیوایم کے لوگ باقی ملک کے لوگوں کا اعتماد کبھی جیت نہیں پائے ایم کیوایم ایک جداجزیرہ تھا جس کے باسی باقی ملک سے کٹے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ اس تنظیم کا ڈھانچہ تھا جو سب میں ہونے کے باوجود سب سے جدا تھا۔

اس جماعت کے قیام بارے میں آگے چل کر کہتی ہیں۔

خیر تو میں نے ان سے کہا کہ ستارے تمہیں استعمال کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کسی مہاجر کے پاس کبھی نہیں آئے گی۔ پس آخر کار مہاجر طلبہ تحریک کا آغاز ہوا اور اس کی راہ نمائی میرے ہی محلے کے ایک لڑکے نے کی۔ میں نے ترقی پسند نوجوانوں کو اس طرف لانے کی بہت کوشش کی۔مگر وہ انکار کر دیتے تھے۔ کیا مہاجر مہاجر کر رہے ہیں؟ وہ کہتے ہم تو بین الاقوامی، طبقاتی تحریک پر یقین رکھتے ہیں۔ میں ان کو سمجھاتا، یہاں تحریکیں نیک جذبات پر کامیاب نہیں ہوتیں۔عوام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہوتا ہے۔ کسی زخم کو کریدنا ہوتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ گھٹیا سی بات لگے مگر اس کی آڑ میں بلکہ اس کے سہارے بڑے بڑے کام کیے جاسکتے

ہیں۔[۱۲]

دکھتی رگ، مہاجر قومیت، مہاجروں کے حقوق، مہاجر، مہاجر ستر سال گزرنے کے باوجود بھی اس لفظ کی گونج پورے ملک میں سنائی دیتی ہے یہ اس تنظیم کی کامیابی ہے یا ناکامی، حالات بتاتے ہیں کہ تنظیمی سطح پر یہ ایک ناکام عمل تھا اور اس عمل نے مہاجروں کو نہ صرف پاکستان میں ضم ہونے سے روکا بلکہ اُن کو اس مٹی کے ساتھ ایک رشتہ استوار کرنے سے بھی روکے رکھا۔ یہ ایک بڑا نقصان ہے۔مہاجرین اس نقصان کا ازالہ آج تک نہ کرسکے۔ تنظیم سے وابستگی پر مہاجرین کو انفرادی، اجتماعی طور پر فائدے بھی ہوئے لیکن ان کا حال کچھ اتنا اچھا نظر نہیں آتا۔

تنظیم کا رعب و دبدبہ اور سطوت بے مثال تھے اپنے عروج میں اس نے کراچی کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں پر شاندار کامیابیاں سمیٹیں مہاجروں نے بھرپور انداز میں اس تنظیم کا ساتھ دیا۔

اس تنظیم کی عوامی حمایت کے متعلق اکثر لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے یہاں تک کہ مقتدر حلقے بھی اس بارے میں درست تخمینہ لگانے سے قاصر رہے۔

ایک اقتباس جو عوامی حمایت کو بیان کرتا ہے۔

> آنے والے برسوں میں ایم کیو ایم بنی مہاجر قومی موومنٹ اور تمام مہاجر جیسا کی انگریزی کی اصطلاح ہے فرد واحد کی طرح اس میں شامل ہوگئے، اتنی بھاری عددی قوت کے ساتھ ایسا کسی نے آنکھوں دیکھا اور نہ کانوں سنا۔لوگ کہتے ۔ارے خالہ، اری چچی جان، ارے دلھا بھائی، ایسا جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ مارٹن کوارٹرز اور حیدری میں محمود آباد میں بڑے بوڑھے سفید کرتوں میں لپ لپاتے، جھکی کمریں سیدھی کرتے ہوئے کہتے، بھئی واہ، کیا بات ہے یہ اتحاد دیکھ کر تو قیام پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے ۔ارے اپنے آگرہ میں، کانپور میں، بنارس میں مسلم لیگ کے جلسوں میں نظر آتا تھا یہ جوش اور ولولہ! یہ عزم یا تو تب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہے ہیں۔[۱۳]

یہ عزم یہ حوصلہ تا حال جاری ہے حتمی فیصلہ مستقبل میں ہوگا۔ اس سے پہلے کہ منعقدہ تمام انتخابات سوائے اُن کے جن میں ایم کیو ایم نے حصہ نہیں لیا ایم کیو ایم کی کامیابی کی خبر سناتے رہے ہیں۔

عوامی حمایت کا کوئی بھی زمینی حقیقت سے منسلک جائزہ ایم کیو ایم کو عوامی حمایت سے محروم نہیں

دکھاتا۔ اسی عوامی حمایت کے بل بوتے پر ایم کیو ایم تقریباً تین دہائیوں سے کراچی کی بلاشرکت غیرے حکمران ہے۔

کراچی کے شہری اور خوف

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کراچی کے شہریوں پر خوف کا سب سے پہلا حملہ کب ہوا؟ ہجرت نے مہاجرین کو خوف زدہ کیا یا ایوب خان کی شکست پر چلنے والی گولیوں نے؟ ۹۰ کی دہائی سے تا حال کراچی کے باسی خوف کی کیفیت میں زندہ ہیں لیکن ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ کراچی خوف زدہ رہا ہے۔ کراچی کے ہر باسی نے اس کیفیت کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ لاشوں کا گرنا، بوری بند لاشیں، سرکٹی لاشیں، تشدد زدہ لاشیں، بے گور وکفن لاشیں، بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ، مذہبی منافرت، اغوا برائے تاوان، موبائل چھیننا، غرض ذہن میں کوئی بھی خوف زدہ کردینے والی اصطلاح موجود ہے تو کراچی کے شہریوں کا اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ بسوں کا جلنا، گولیوں کا چلنا، آج کتنے مرے، کل کتنے مرے یہ سب کراچی کے روز مرے ہیں۔ ایسا خوفناک منظر تھا کہ دیکھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اس مجموعی فضا میں کراچی کے شہری سانس لیتے تھے اور زندہ رہتے تھے۔

فہمیدہ ریاض نے بھی کمال بے باکی سے یہ تصویریں دکھائی ہیں۔ کہانی کی ابتدا ہی ایک واقعے سے ہوتی ہے جس میں لوگ ایک قتل کو سیاسی قرار دینے پر متفق نہیں۔ ڈرے سہمے لوگ بس جلدی سے لاش کو دفنانا چاہتے ہیں کچھ کہنا نہیں چاہتے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے سب کو جان پیاری ہے۔ اس قتل کو عام ڈکیتی کی واردات ثابت کرنے پر مصر ہیں۔ اس کی وجہ شہر پر چھایا ہوا وہ خوف ہے جو ان لوگوں کو کچھ بھی کہنے سننے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ کیفیت انتہائی دردناک ہے۔

فہمیدہ ریاض جن چار پہلوؤں کی نشاندہی کی کتنے برمحل ہیں۔

(۱) اس قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں

(۲) کسی قتل کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں

(۳) ہم جو کوئی سیاسی رائے نہیں رکھتے اور اس کا اظہار کرنے سے بھی اب پرہیز کرنے لگے ہیں تو ہم خصی نہیں ہوگئے۔

(۴) اس قتل میں یا کسی بھی قتل میں، ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔ ۱۵

یہ نتائج اخذ کرنے کے لیے خوف کی جس فضا کا ہونا لازمی ہے وہ کراچی میں وافر مقدار میں موجود تھی۔ کراچی میں کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے مذہبی منافرت، مہاجر اور حقیقی مہاجر کی لڑائی ماورائے عدالت قتل یہ سب کچھ کراچی کی زندگی کا حصہ تھا۔ جانا مانا اور پہچانا ہوا حصہ۔ اس خوف کی فضا کو بڑھاوا دینے والے بے شمار عوامل تھے۔

فوجی آپریشن، مخالفین کا قتل، مذہبی شدت پسندی۔

فہمیدہ ریاض کی پیش کی ہوئی تصویر اتنی واضح اور مکمل ہے کہ اقتباس کون سا پیش کیا جائے اور کونسا چھوڑا جائے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

فہمیدہ ریاض نے کہانی میں " کراچی کے شہری" کے نام سے جو عنوان باندھا ہے وہ مختصر ہونے کے ساتھ انتہائی جامع بھی ہے اس میں کراچی ک لوگوں کی نفسیات کا مکمل بیان ہے۔

کراچی کے شہری

پہلے لوگوں نے ایک سنسنی محسوس کی۔

پھر وہ مزید قتلوں کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے بعد مزید قتل ہوئے یہ سب قتل متوقع تھے۔

کراچی میں لوگ دو تین برس سے ایک بڑے قتل عام کی توقع کر رہے تھے۔

حالانکہ بیچ میں لوگ اپنی توقع بھول جاتے ہیں۔

کبھی انھیں لگتا ہے کہ قتل کی خبروں کا ان پر اب اثر نہیں ہو رہا۔

وہ کثیر التعداد قتل کی وارداتوں پر مذاق بنانے لگتے ہیں، ایک دوسرے سے آج کا سکور پوچھتے ہیں۔ ۱۵

اس ساری قتل و غارتگری پر کراچی کے شہریوں نے اور خاص طور پر مہاجرین نے مختلف ردعمل ظاہر کیے۔ کچھ بے حس ہو گئے جیسے یہ خبریں اُن پر کوئی اثر نہیں کر رہی ہیں۔ کچھ بیرون ملک جا بسے اور کچھ ان تاریک

راہوں پر چل پڑے جن کا انجام موت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ فوجی آپریشن کے دوران مہاجرین کے ساتھ کی گئی زیادتیوں نے مہاجر لڑکوں کو تنظیم کے ساتھ مزید شدت سے جوڑ دیا۔ فوج کو جب سندھ میں کچے کے علاقے میں آپریشن کے لیے بھیجا گیا تو فوج اس قتل و غارتگری اور ڈکیتی کو روکنے میں کامیاب رہی جس سے سندھ کے لوگ عاجز آ چکے تھے۔ لیکن یہی فوج شہری علاقوں اور خاص طور پر کراچی میں وہ نتائج نہ دے سکی۔ وجہ یہ رہی کہ یہاں لوگوں کو تنظیم کے ساتھ ہم دردی تھی اور تنظیم کے ساتھ منسلک لوگ جبر کے بدلے میں کھڑے ہو گئے۔

فہمیدہ ریاض بھی ایک ایسا واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کرتی ہیں جس میں عمران کو جب فوجی بری طرح تشدد کا نشانہ بناتے ہیں تو عمران غائب ہو جاتا ہے اور پتا نہیں وہ کہاں گیا۔ کراچی کے ایسے لڑکے اس تنظیم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور جب تک ریاستی جبر عدل و انصاف سے کام نہیں لے گا ایسی تنظیم کو ختم کرنا آسان نہیں ہوگا۔

کراچی کے منظر نامے کو متاثر کرنے والے دو بڑے عوامل

لینڈ گریبرز اور غیر قانونی اسلحہ

صدر ضیاء کے زمانے میں پاکستانی ریاست نے افغان جہاد میں عملی حصہ لیا اور روس کے خلاف امریکہ کا ساتھ دیا۔ یہ پاکستان کا ایک نامناسب فیصلہ تھا۔ اس فیصلے کے نتائج پاکستانی قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ اس فیصلے نے مذہبی شدت پسندی اور مسلکی منافرت کو جنم دیا۔ افغان جہاد کی وجہ سے لاکھوں مہاجرین افغانستان سے پاکستان پہنچے ان میں سے اکثر نے کراچی کا رخ کیا۔ کراچی میں غیر قانونی مہاجرین کی آبادیاں قائم ہوئیں ۔ پاکستانی ریاست نے اس سلسلے میں نرم دلی کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے یہ مہاجرین پاکستانی شہروں میں اپنی محفوظ پناہ گاہیں بناتے چلے گئے۔ کراچی خصوصی طور پر ان سے متاثر ہوا۔

افغان جہاد سے کراچی میں صرف مہاجرین نہیں آئے بلکہ ان کے ساتھ غیر قانونی اسلحہ کی بھاری مقدار بھی پہنچی جو آگے چل کر کراچی کے امن کو تباہ کرنے میں استعمال ہوا۔

اس اسلحے سے تمام گروپوں نے فائدہ اٹھایا۔ ان کو روکا کیوں نہیں جاتا؟ اور اسلحے کی اس ریل پیل سے متعلق فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں۔

> کیسی رکاوٹ؟ جب کہ یہ روز محشر ہے اور عالم نفانفسی اور جب کہ کل سورج کے طلوع ہونے کا کسی کو یقین نہیں اور آج جتنا پیسہ بنایا جا سکتا ہے وہ بنانا لازمی ہے۔ ہتھیاروں سے لدے

ہوئے ٹرک علاقہ غیر سے سفر کی ابتداء کرتے اور چاندی کی چھتر چھایا میں پورے صوبہ سرحد، پورے صوبہ پنجاب اور پورے صوبہ سندھ سے گزر کر کراچی میں ہتھیاروں کو مطلوبہ مقام تک پہنچاتے رہے ہیں۔ ان کو کہیں نہیں روکا گیا ہے۔ کہتے ہیں ساڑھے تین لاکھ میں ہتھیاروں سے لدا ٹرک بہ حفاظت گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ توڑے دار بندوقیں نہیں، جدید ترین ماوزر ٹی ٹی، کلاشنکوف، بم حتیٰ کہ دور مار میزائل بھی۔ آپ کو یقین نہیں آتا؟ کراچی میں لڑکوں نے میزائلوں سے نشانوں پر گولے برسائے۔ [۱۶]

یہاں پر بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنا کردار ادا کیوں نہیں کر پائے اور اس قدر اسلحے کو شہر میں آنے کی اجازت کیوں دی گئی؟ کیسے ان کی ناک کے نیچے یہ سب ہوتا رہا؟

یہ سوال سننے میں بڑے اہم اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے جن میں قانون کی حکمرانی ہے اور سب قانون کی نظر میں برابر ہیں وہاں تو یہ سوال پوچھنا بنتا ہے۔ لیکن وہ معاشرے جو ہر طرح کی قانون شکنی کو بطور مروجہ معاشرتی رویے کے قبول کر چکے ہوں ان کے لیے یہ سوال اتنے اہم نہیں وہ ان سوالوں کا کوئی بھی جواب دے سکتا ہے اور نہ بھی دے تو وہ ذہنی طور پر یہ مان چکا ہے کہ "سب چلتا ہے"۔ اس طرح بڑے شہروں میں مہاجرین (افغان) اور غیر قانونی اسلحہ پھیلتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ کلاشنکوف ایک عام ہتھیار بن گیا۔

اس اسلحے نے کراچی کے امن و امان کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہ اسلحہ ایم کیو ایم الطاف گروپ، حقیقی گروپ، پٹھان، سندھی قوم پرست سب کے استعمال میں رہا سب نے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کیں، حد بندیاں کیں اور علاقے نو گو ایریا میں منتقل ہوتے چلے گئے۔ کراچی کی یہ خونچکاں داستان ایسے ہی واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

دوسرا پہلو جو کراچی کے منظر نامے کو بدلنے میں اساسی کردار ادا کرتا رہا وہ ہے زمینوں پر ناجائز قبضے بدقسمتی سے اس عمل میں بھی سارے حصہ دار بنے۔ جس کو جہاں موقع ملا اس نے کراچی کے حصے بخرے کیے اور زمینوں پر ناجائز قبضے کیے۔ اس عمل کے ذریعے شروع میں کچی بستیاں بسائی گئیں پھر آہستہ آہستہ ان کو قانونی شکل میں ڈھالا گیا۔ کراچی ایک کیک تھا جس پر ہر کوئی اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے جھپٹ رہا تھا۔ اس دکھ دینے والے قصے پر فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں۔

تبھی پولیس کی ایک جیپ وہاں آ کر رکی۔ جیپ میں سوار پولیس افسر نے شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے جھانکا اور شفقت سے جھونپڑی کے مکینوں سے مخاطب ہو کر کہا کیوں بھئی

ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟ جی ساب، بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کا کرم ہے جناب! جواب ملا۔ ٹھیک ہے تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کوئی پریشان کرنے کی کوشش کرے تو ہمیں بتانا اس کے بعد جیپ دھول اڑاتی سٹارٹ ہوئی اور فراٹے بھرتی شہر کے بارونق علاقوں میں جا پہنچی۔ پھر وہ کئی جیپوں میں بدل گئی اور کئی پرتمکیں عمارتوں کے سامنے رکی جہاں باوقار تعمیرات اور دیگر کاروباری اداروں کے بورڈ لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی "قبضہ گروپ" یا "لینڈ گریبرز ایسوسی ایٹس" کے نام کی تختی آویزاں نہیں تھی مگر نام میں کیا رکھا ہے، تھانوں کو ماہانہ تو یہ ادارے کسی بھی مد میں دے سکتے ہیں۔ زمینوں پر قبضہ اس طرح بھی کیا جارہا ہے۔ زمین کے ٹکڑے کی آوٹر پوسٹ پر مسلح افراد کی جھونپڑیاں بنوادی جاتی ہیں قبضہ کرنے والے مالدار اور طاقتور افراد ہیں جو تنخواہ دار مسلح افراد تعینات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کون لوگ زمینوں پر قبضہ کررہے ہیں؟ عورت نے الٹی سانسوں کے ساتھ آہستہ سے پوچھا؟۔" آپ تو کراچی کی ہیں بوڑھے نے آنکھیں مچمچاتے ہوئے کہا۔ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ قبضہ گروپ کام کررہے ہیں۔ ہاکس بے میں بلوچ ہیں، کورنگی اور مہاجر کیمپ میں (حیران نہ ہونا) بنگالی یہ کام آرہے ہیں۔ جہاں جہاں ان کا تسلط ہے وہاں ایم کیو ایم حقیقی یا الطاف بھائی کا نام لینے والے مصروف کار ہیں۔ ہوں! عورت نے کہا پھر سوچ کر بولی، سندھی نہیں ہیں قبضہ گروپ میں؟ بوڑھا ہنسا، (کیا وہ خدا تھا)، ہیں تو سہی اس نے کہا گلشن اقبال سے گلستان جوہر تک قبضہ گروپوں میں مخلوط لوگ ہیں۔ پنجابی ہیں، پٹھان ہیں اور ان میں سندھی بھی ہیں۔ وہ اس دھندے میں آہستہ آہستہ شامل ہورہے ہیں۔ ۱۷

یہ ہے کراچی کی صورتحال جو فہمیدہ ریاض کی کراچی سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ معاشرے پر پھیلی اجتماعی بے حسی، خودغرضی، نفس پرستی کی داستان، اس کے سارے کردار گناہگار ہیں۔ موقع پرستی اور ہوس دو ایسے کردار ہیں جو کراچی کے خمیر میں بس گئے ہیں۔ ان کی شاخوں نے کراچی کو یوں جکڑا ہوا ہے کہ یہ شہر بمشکل سانس لے رہا ہے۔ کراچی نے لاکھوں لوگوں کو روزگار فراہم کیا چھت دی اپنائیت کا احساس دیا، لیکن اس کے مسیحا کبھی صرف کراچی کے لیے نہ سوچ پائے یہی وجہ ہے کہ جب ہر اچھے کام کے پیچھے اپنا ذاتی یا گروہی مفاد وابستہ ہو تو اس کام سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

کراچی کے سلسلے میں یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ سب اپنے آپ سے تو مخلص ہیں لیکن کراچی سے

اخلاص کا برتاؤ کسی نے نہیں کیا کوئی اس شہر کو ذاتی مفاد سے اٹھ کر اپنا ماننے کو تیار نہیں۔ یہ انتہائی قابل مذمت اور قابل افسوس بات ہے۔

چوتھے باب کے پہلے حصے کا اختتام اس شہر کے ایک بے غرض اور بے لوث بیٹے جمشید نسروان جی کی بات پر ہوگا کیونکہ آج کراچی کے شہری جن مسائل سے نبرد آزما ہیں جمشید جی ان سے کتنے آگاہ اور اس کے حل کے لیے کتنے فکر مند تھے۔

کاش ان کی بات مانی ہوتی۔

> بروہی آنے والے چند برسوں میں ہمیں نہ صرف محتاج، ناخواندہ اور سماج دشمن افراد کی ایک بڑی تعداد کا مسئلہ درپیش ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر حالات کا۔ ہمارے سامنے بے شمار ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم احتیاط کے ساتھ اس زندگی کا مطالعہ کریں جو مہاجر بچے گزارنے پر مجبور ہیں۔ کہ نہ ان کے بدن پر قمیض ہے اور نہ سر پر چھت جو انھیں تیز ہوا، دھوپ اور بارش سے بچا سکے۔ تو ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ نسل جو آج نشوونما کی ابتدائی منزل میں ہے ہمیں مضبوط صحت مند اور کارآمد شہری فراہم نہیں کر سکے گی بلکہ اس قسم کے افراد پیدا کرے گی جنھیں آنے والے سماجی نظام کا حصہ بنانا ایک ناممکن کام ہوگا۔ آگے چل کر کہتے ہیں۔ ایسی بات نہیں کہ یہ مسئلہ حل نہ کیا جا سکتا ہو اور نہ اس کے لیے کسی بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ درکار ہے تو بس ذرا تخلیقی انداز فکر اور ہمدردانہ فہم میں نے ایک سکیم تیار کی ہے۔ جس کے ذریعے صرف ایک سال کے عرصے میں ان تمام مہاجروں کو ملک کی معاشی اور سماجی زندگی کا حصہ بنانا اور انھیں وہ اندرونی قوت اور بیرونی وسائل مہیا کرنا ممکن ہے جن سے یہ پرمسرت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی میری بات ہی نہیں سنتا۔ [۱۸]

یہ گفتگو جمشید نسروان جی کی اے کے بروہی سے ہوئی جو اجمل کمال کے مجلّے آج سے پیش کی۔

اس سارے پیراگراف کو پڑھنے کے بعد کتنے اس کے مندرجات سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ کاش ان مخلص لوگوں کی بات سنی ہوتی جو کراچی کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ لیکن پاکستان کے لوگوں زندگیاں ایسے ہی کسی کاش کے گرگھومتی رہیں گی اور منزل ان سے دور ہوتی جائے گی۔

زیرِ تحقیق ناولوں میں اگلا ناول سیتا ہرن ہے جو قرۃ العین حیدر نے تحریر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول سیتا ہرن

اس باب سے قبل جن ناولوں پر گفتگو ہوئی وہ سارے کم وبیش ہجرت کا پس منظر رکھتے ہیں۔ ان ناولوں میں ہجرت کا بیان، مہاجرین کی مشکلات کا بیان بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا۔ لیکن یہ تمام مہاجرت ان مہاجرین کی ہے جو مسلمان ہیں اور ہندوستان سے پاکستان آرہے ہیں۔ ان مسلمان مہاجرین نے یہاں آکر ایک نئی دنیا بسائی اور موجودہ کراچی کا تذکرہ ان کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ سندھ اور کراچی میں ہندوؤں کی کثیر تعداد آباد تھی اور اب بھی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ ہندو، ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے لگے اور ان کی تعداد بھی لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ان مہاجرین نے بھی کم وبیش وہی سب کچھ سہا جو مسلمان مہاجرین کے حصے میں آیا۔

تقسیم سے قبل سندھ میں ہندوؤں کی کثیر تعداد آباد تھی ان ہندوؤں نے مناسب حالات میں خوب ترقی کی۔ کلھوڑوں، تالپوروں کے عہد میں انتظامی عہدوں پر ہندو تعینات تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سندھ کے ہندوؤں نے خوب ترقی کی انھوں نے تعلیم کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ تجارت سے ان کی رغبت کی وجہ سے آہستہ آہستہ سندھی مسلمانوں کی زمین بھی ہندوؤں کے تصرف میں آنے لگیں۔ مسلمانوں کی فضول خرچی اور اپنی بساط سے بڑھ کر خرچ کرنے کی عادت کے برعکس ہندوؤں میں کفایت شعاری اور بچت عام تھی۔ ہندو بچانا اور سرمایہ کاری کرنا جانتے تھے اس کے برعکس مسلمان بچانے پر یقین نہ رکھتے تھے، ان حالات کی منظر کشی کیول رام رتن مل ملکانی اپنے "سندھ کی کہانی" نامی مضمون میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

> برطانوی دورِ حکومت میں ہندوؤں نے ڈرامائی ترقی کی۔ شروع ہی سے ہندوؤں کی تعلیم یافتہ ذاتیں، برہمن، بنیے اور کائستھ، ہندو مذہب پر قائم رہی تھیں اور صرف زمین داروں، کاشتکاروں، کاریگروں اور سپاہیوں نے اسلام قبول کیا تھا چنانچہ ذات کا فرق مذہبی فرق کے باعث بڑھ گیا تھا اس امر نے کہ اونچی ذات اور اونچے طبقے کے ہندو شہری (Urban) بھی تھے، اس خلیج میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ یہ بات بہت سے مسلمانوں کے لیے تشویش کا باعث بنی۔ محمد ایوب کھوڑو نے کہا۔ آج ہم مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے گھر برتن مانجھتے دیکھتے ہیں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب ہندو عورتیں مسلمانوں کے گھروں میں برتن مانجھ رہی

ہوں گی۔ ۱۹

ہندوؤں کی یہ ترقی سندھ اور کراچی میں جابجا محسوس کی جاسکتی تھی، تقسیم کے بعد ان کو بھی اس جمے جمائے کاروبار، زمین، مکان، روزگار کو چھوڑنا تھا۔ اس بات نے اُن کو آزردہ کیا قرۃ العین حیدر نے سیتا ہرن میں ایسے ہندوؤں کا تذکرہ کیا ہے جو سندھ دھرتی کو چھوڑ کر گئے اور اب اس کے لیے تڑپتے ہیں۔

کہانی مرکزی کردار سیتا کے گرد گھومتی ہے۔ ہندو دیو مالا کے اہم کردار سیتا اور اس پر گزرے مظالم کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں ہونے والی معاشرتی شکست و ریخت سے عورتوں کی تقدیر پر مرتب ہونے والے اثرات کو گرفت میں لینے کی اہم کوشش ہے۔

سیتا اس عورت کا استعارہ ہے جو تقسیم کے بعد معاشرے میں اپنی پہچان بنانے کے لیے سرگرم ہے اس سفر میں اس کے پاؤں کہیں زمین پر نہیں ٹکتے۔ وہ زمانے کی تیز ندی میں بہتی جاتی ہے اسی سفر کی روئیداد قرۃ العین حیدر نے پیش کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوؤں کو بھی مہاجرت کا دکھ سہنا پڑا تو ان کے خیالات کیا تھے کیول رام رتن مل ملکانی اپنے مضمون "سندھ کہانی" میں لکھتے ہیں۔

> تقسیم کے فوراً بعد سندھیوں کی بڑی تعداد جودھپور اور اجمیر میں جمع ہوگی۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان جیسی غیر فطری چیز زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکے گی اور وہ راجستھان سے سندھ واپس چلے جائیں گے۔ بمبئی کو بہت بڑا، بہت مہنگا اور بہت دور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں تقسیم کی منسوخی کا امکان دور ہونے لگا، سندھیوں نے متبادل کی تلاش شروع کردی۔ ایک متبادل کانڈلا کی بندرگاہ تھی جہاں سندھوری سیٹلمنٹ کارپوریشن کو "گاندھی دھام" بسانے کے لیے زمینیں دی گئی تھیں۔ مگر جیسا کہ روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ گاندھی دھام بھی ایک دن یا چند برسوں میں نہیں بن سکتا تھا۔ مالی طور پر بدحال سندھی مہاجرین کے پاس وقت کم تھا۔ وہ برسوں انتظار نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے رفتہ رفتہ بمبئی کا رخ کرنا شروع کیا۔ وہاں کلیاں کیمپ، جسے دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اطالوی قیدیوں کے رکھے جانے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور جس کا نام اب "الہاس نگر" ہے۔ آسانی سے دستیاب تھا۔ مہاجرین یہاں کم خرچ میں رہ سکتے تھے اور بمبئی میں پیسہ کما سکتے تھے۔ ۲۰

ان سندھیوں کے لیے ہے جو سندھ کی دھرتی سے جدا ہوئے تھے وہی دکھ تھے وہی مشکلات تھیں جن کا

سامنا مسلمان مہاجرین نے کیا۔ زندگی کی مشکلات بعض اوقات انسان کو دکھی ہونے کا موقع بھی نہیں دیتیں۔ ان سندھی مہاجرین نے بھی زندگی کے اس کڑے امتحان کا بھرپور مقابلہ کیا۔ سندھ دھرتی جوان کی جنم بھومی تھی اس کی یاد ان کے دل میں انگڑائیاں لیتی رہی وہ اپنی دھرتی سے ناتہ نہ توڑ سکے۔ سیتا کے والدین جب سندھ کا تذکرہ کرتے ہیں تو درد کی کسک ان کی باتوں سے محسوس ہوتی ہے۔ ان سب کا احوال قرۃ العین حیدر نے سیتا ہرن میں پیش کیا ہے۔

اب قدرے تفصیل سے ناول کا مطالعہ کیا جائے گا۔

سیتا میر چندانی کی ہجرت اور ہجرت کے آلام

اس سے قبل مسلمان مہاجرین کی ہجرت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے اس ناول میں ان سندھی ہندو مہاجرین کے کرب ہیں جو سندھ سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں پہنچے ہیں۔ ہجرت کا عمل صرف جسمانی ہوتا ہے انسان کا ذہن، اس کا دل، انھی گلیوں میں بھٹکتا رہتا ہے جہاں اس کا بچپن گزرا ہوتا ہے یہ ایک فطری بات ہے ہر شخص کم وبیش اسی تجربے سے گزرتا ہے۔

انھی حالات سے سیتا میر چندانی گزریں۔ کہانی چونکہ ان کے گرد گھومتی ہے تو تذکرے میں ان کو مدنظر رکھا جائے گا۔ ہجرت میں مہاجرین کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی وہ "پدرم سلطان بود" کا رویہ تھا۔ آب گم کا کردار جب اپنی حویلی کی تصویر دکھا کر "یہ چھوڑ آئے ہیں" کی گردان دہراتا ہے تو دراصل وہ اس معاشی آسودگی کا تذکرہ کررہا ہوتا ہے جو کسی زمانے میں ان کی دسترس میں تھی لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اب تو حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ چھوٹے چھوٹے کام چھوٹی چھوٹی مزدوریاں ان لوگوں کی منتظر تھیں اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے یہ کام انھیں کرنے پڑ رہے تھے۔

سیتا میر چندانی جس کے والد ڈاکٹر اور کھاتے پیتے آدمی تھے جب مہاجر بن کر ہندوستان پہنچی تو کچھ ایسے ہی حالات ان کے منتظر تھے۔ ایسے میں ماضی کی یاد کا حملہ نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ جن کے دستر خوان مہمانوں سے بھرے رہتے تھے آج دوسروں کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ معاشی مجبوریاں ان کی ہڈیوں کا گودا خشک کررہی تھیں۔ انھی حالات کا سیتا میر چندانی کو بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک اقتباس میں یہ تذکرہ کچھ یوں ہے۔

> سیتا کی والدہ بڑی خوب صورت ساڑھیاں کاڑھتی ہیں۔ او۔۔۔ ہاؤ ونڈرفل ۔۔۔ ہما نے کہا تھا۔ ایک کاٹن ساڑھی کا پلو اور بیل آپ کتنے میں بنوا دیں گی؟ دس روپے، سیتا نے کڑوا

گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس وقت یہ محسوس کر کے وہ مفلس اور قابل رحم شرنارتھی ہے۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا۔[۲۱]

یہ مہاجرین کے لیے ابتدائی جھٹکے تھے جن میں ان کی عزت نفس کو سخت اذیت پہنچی۔ یہ لوگ نہ اس طرز زندگی کے عادی تھے اور نہ ان کا مزاج اس کو گوارا کرتا تھا۔ ان کی آنکھیں بھر آتی تھیں جب کوئی ہمدردی کے دو بول بولتا۔ زندگی انسان کو کیسے کیسے کنویں جھکاتی ہے۔ ہجرت کا منظر نامہ اس کی عملی مثال ہے۔ مہاجرین بھی رفتہ رفتہ اس پر درد زندگی کے عادی ہوتے چلے گئے۔ ان کو بھی اس مشکل سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ ستیا میر چندانی کا خاندان بھی اپنی کوٹھی کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ یہ مکان کسی مہاجر مسلمان کا ہے جو اسے چھوڑ کر انجانی منزل کا مسافر بن چکا ہے۔ اس مکان میں اب ہندو مہاجرین کا ڈیرہ ہے۔

اس مکان کا حال یوں بیان ہوا۔

"یہ کسی نچلے متوسط طبقے کے مسلمان کا چھوڑا ہوا تنگ و تاریک چھوٹا سا مکان تھا۔ ممی دونوں لڑکیوں کو وسطی کمرے میں لے گئیں اور دری پر بٹھا دیا۔ ایک طرف کو پلنگ بچھا تھا اور دیوار کے برابر ٹرنک چنے ہوئے تھے۔"[۲۲]

سیتا میر چندانی جو کراچی میں اٹھارہ کمروں کی کوٹھی جس کا نام "دولت رائے محل" تھا۔ سیتا می چندانی جو ہندوؤں کی "عامل" ذات سے تعلق رکھتی تھی جو سب سے ذہین اور منتظم ذات مانی جاتی تھی۔ عامل کالونی میں یہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ اس سیتا میر چندانی کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں اپنے خاندان کے ساتھ زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔

قرۃ العین حیدر نے بڑی چابک دستی سے اُن ہندوؤں کا حال بیان کیا جو کراچی میں کھاتے پیتے، مالدار، خوشحال طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اب کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

یہ تمام حالات انسان کو اندر سے کس قدر مجروح کرتے ہیں۔ مہاجرین کی زندگیاں اس کا عملی مجسمہ ہیں۔

سیتا ہرن اور ناسٹلجیا

ہجرت کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں "ناسٹلجیا" کا پہلو کسی نہ کسی حد تک شامل رہتا ہے۔ قرۃ العین

کے دونوں ناولٹ ہائوسنگ سوسائٹی اور سیتا ہرن ناسٹلجیا کا رنگ لیے ہوئے سیتا ہرن میں سیتا میر چندانی اور اس کے خاندان کا بیان ہے جو سندھ کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے کراچی میں جن کی ایک بڑی کوٹھی تھی۔ مہاجرت کے بعد ایک مشکل زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اس کہانی کا لوکیل کوئی ایک مقام نہیں بلکہ کہانی متحرک لوکیل کی حامل ہے۔ کبھی کراچی اور سندھ کا ماحول پس منظر کا کام دیتا ہے کبھی لکھنو، اودھ اور دلی ہے تو کبھی امریکا، فرانس اور کولمبو واقعات کا تسلسل کہانی کو مسلسل حرکت میں رکھتا ہے۔ سیتا کی زندگی سیال مادے کی طرح متحرک اور بے چین ہے کہیں سکون اور قرار میسر نہیں اور جب سیتا سمجھتی ہے کہ عمر بھر کی بے قراری کو قرار ملنے والا ہے ایک نیا غم اس کی راہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔

سیتا کے والدین جنھوں نے سندھ دھرتی، کراچی میں عمر گزاری ہوتی ہے اس کراچی کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہیں ان کی سب سے بڑی خواہش صرف اور صرف اسی دھرتی کے درشن ہیں جہاں ان کی عمر گزری ہے۔

وہ بڑی شیفتگی سے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں۔

> بی بی کراچی عامل کالونی میں ہماری اٹھارہ کمروں کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔ ممی گلاسوں میں پانی انڈیلتے ہوئے بلقیس سے مخاطب تھیں۔ ستیا نے بڑی کوفت سے انھیں دیکھا تھا۔ یہ قصہ ہر ایک کو سنا کر انھیں کس قسم کا اطمینان محسوس ہوتا ہے؟ اس کوٹھی میں ڈاکٹر صاحب نے سیتا کے ڈیڈی نے چھ کمروں میں سنگ مرمر کا فرش لگایا تھا۔ ممی اب ختم کرو یہ رام کہانی۔ سیتا نے چڑ کر کہا تھا۔ نہیں بلقیس ۔۔۔ تم جا کر دیکھنا ضرور۔۔۔ اس کی نیلی رنگ کے شیشوں والی کھڑکیاں ہیں۔ "دولت رائے محل" اوپر لکھا ہوا ہے۔ دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ جمشید روڈ سے موتی لال نہرو روڈ پر جب مڑو۔۔۔ ممی۔۔۔ بھئی ٹھیک ہے۔ دیکھ لیں گے۔ ہما تم نے دہی بڑے لیے اسی وقت ڈیڈی اندر آگئے تھے۔ کیوں بھئی۔۔۔ یہ تم کو دولت محل کے قصے سنا رہی ہیں؟ ان کی یہ عادت ذرا مشکل سے ہی چھوٹے گی۔ ۲۳

دولت رائے محل، اس کی نیلے رنگ کے شیشوں والی کھڑکیاں کیا کہتے ہیں " کیا کیا نہ ہمیں یاد آیا"۔ یہ یاد ماضی مستقل حوالہ ہے ان لوگوں کا اس میں ہندو مہاجر اور مسلمان مہاجر کی تخصیص نہیں ہے۔ زندگی کے رنگ

ایک جیسے ہیں دونوں انسان کی حیثیت سے ایک جیسا ہی سوچتے ہیں یہ تو ہندو مہاجرین کا احوال ہے۔مسلمان مہاجرین اور سیتا ہرن کا تناظر کچھ یوں بیان ہوا ہے۔

> یہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ آپ لوگ ایک پھٹیچر سے سابق تعلقہ دار ہیں اور پھٹیچر سا چاند پور نامی آپ کا تعلقہ تلسی پور ضلع فیض آباد ۱۹۴۷ء سے پہلے موجود تھا اور کچھ نہیں تو پاکستان آکر آپ رفیو جی لوگ پرانے ناموں ہی سے چپکے ہوئے ہیں۔بلقیس نے ایک روز صبح کو ناشتے کی میز پر حسب معمول اپنے پاکستانی عزیزوں سے جھگڑنا شروع کیا۔ہمارا چاند پور ہاؤس تھا کہ نہیں لکھنو میں جا پلنگ روڈ پر، منجھلی خالہ نے رسان سے کہا۔ان کی آواز میں سیتا کو اپنی ماں کی آواز کی جھلک سنائی دی۔[۲۴]

گویا یہ دونوں اطراف کا قصہ ہے۔مہاجرین کو یہ ماضی بھلانے میں خاصا وقت لگا زمانہ بہت بے رحم ہے یہ اپنی دھن میں بہنے والا دریا ہے۔کشتی کسی کی پار ہو یا درمیان رہے والا معاملہ ہے۔

کہانی آگے بڑھتی ہے اور اب کراچی، سندھ کا حصہ شروع ہوتا ہے۔سیتا میر چندانی پاکستان ایک شادی میں شرکت کرنے کے لیے آتی ہے۔اب کراچی اور اس کے مضافات، سندھ کے شہر کہانی میں آتے ہیں۔ایک ایک منظر میں یادوں کا پورا دیوان کھلا ہوا ہے۔

سیتا میر چندانی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی محبت، بے قراری، شیفتگی چھپا نہیں پاتیں۔تقسیم کے بعد عوام اور ریاست کا نقطہ نظر تبدیل ہوتا گیا۔

دونوں طرف دلوں میں میل بڑھتا گیا ایک دوسرے سے دشمنی کی ابتدا ہونے لگی تقسیم کی لکیر گہری ہونی شروع ہوئی اور آج تو لگتا ہے ہم ہزار کوس کے فاصلے پر ہیں۔

کراچی شہر تقسیم سے پہلے اپنی ایک شکل رکھتا تھا اس شکل میں انگریزوں اور ہندوؤں کی شبیہہ نمایاں تھی اور ایسا ہونا بھی تھا کیونکہ برطانوی راج نے کراچی کی صورت گری کی تھی اور ہندوؤں نے اس مقصد کی آبیاری کی تھی۔سڑکوں کے نام، باغات کے نام، انگریزوں اور ہندوؤں کے نام پر تھے۔لیکن تقسیم کے بعد شہر بھی ہندو اور مسلمان ہونے لگے اس عمل سے کراچی بھی گزرا گویا کراچی کو مسلمان کرنے کا عمل شروع ہوا۔

اس عمل کی ابتداء سڑکوں، شاہراؤں، باغات، عمارات کے نام تبدیل کرنے سے ہوئی۔یہ ایک اچھا عمل تھا یا برا اس بحث میں پڑے بغیر ایک فہرست پیش کرتے ہیں جس میں آزادی سے پہلے اور بعد کے ناموں

کا ایک تقابل کیا گیا ہے۔

کراچی کی مشہور زمانہ بندر روڈ آج کل محمد علی جناح روڈ ہے۔ الفنسٹن سٹریٹ کو زیب النساء سٹریٹ کہا جاتا ہے۔ موتی لال نہرو روڈ کو آج کل جگر مرادآبادی روڈ کہتے ہیں۔

اسی طرح مقامات کے نام بھی بدلے گئے۔ ایسا ہی ایک قصہ سیتا ہرن میں قرۃ العین حیدر نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

تمہارے ڈیڈی کراچی میں کیا کرتے تھے؟۔

ڈاکٹر تھے۔۔۔رام باغ میں ان کا کلینک تھا۔

رام باغ۔۔۔؟

رام باغ کراچی میں ہے آپ نے نہیں دیکھا؟

ارے ہاں، اسے ہم اب آرام باغ کہتے ہیں۔ ۲۵

سیتا میر چندانی جب کراچی پہنچتی ہے تو کراچی کے گلی کوچوں کا تو تذکرہ ہوتا ہی ہے ساتھ ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ واپسی پر سفر کراچی سے لاہور اور پھر واہگہ کے راستے ہندوستان جایا جائے۔

یہ سفر بھی سیتا میر چندانی کے لیے یادوں کے انمول خزانے لے کر آیا پرانے جاننے والوں سے ملاقات، پرانے راستوں پر سفر چھوٹی چھوٹی یادیں، سکھر کا سادھو بیلہ، دریائے سندھ کی عظمت سب کچھ، اس مسافر کے لیے خوابوں سے بھرا تھا۔

یہاں ضمناً ایک واقعہ کا بیان تا کہ مہاجرین کے دکھوں کو بہتر طور پہ سمجھا جا سکے۔ یہ واقعہ اختر بلوچ کے بلاگز کے مجموعے کرانچی والا سے لیا گیا ہے۔

میر پور خاص کے علاقے میں سکھ آباد تھے۔ یہاں اُن کا گردوارہ بھی تھا۔ میر پور خاص کا ایک سکھ بھان سنگھ ۲۰۰۴ء میں ہندوستان سے اپنا گھر ڈھونڈتا ڈھانڈتا میر پور خاص آیا۔ اس کے بعد کا حصہ کرانچی والا میں یوں بیان ہوا ہے۔

۲۰۰۴ء کی بات ہے، دن کے کوئی ۱۲ بجے کا وقت ہوگا گھر کے دروازے پر دستک ہوئی

---جب میں نے دروازہ کھولا ایک معمر شخص جو تقریباً نوے کے پیٹے میں تھا اور اس کے ساتھ ادھیڑ عمر عورت تھی جس کا تعارف اس نے اپنی بیٹی کی حیثیت سے کروایا۔ عمر رسیدہ شخص مجھ سے بولا بھان سنگھ کا گھر یہی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔ تو وہ بولے میں بھان سنگھ ہوں۔ کیا میں اپنا گھر دیکھ سکتا ہوں تو میں نے کہا کیوں نہیں اور انھیں گھر کے اندر لے آیا۔ میں نے باورچی سے کہا چائے وغیرہ کا بندوبست کرے گھر کے مالک آئے ہیں۔ اس کے بعد فقط اتنا ہوا کہ دو سے لے کر پانچ منٹ تک بھان سنگھ اور وہ ادھیڑ عمر لڑکی جو بھان سنگھ کے مطابق اس کی بیٹی تھی گھر کے در و دیوار پر ہاتھ پھیرتے رہے، چومتے رہے اور اس دوران روتے رہے۔ میں نے کہا آپ بیٹھیں میں چائے لے کر آتا ہوں۔ جب واپس آیا تو نہ بھان سنگھ تھا اور نہ اس کی بیٹی۔ ۲۶

یہ آنسو اور ان کی قیمت کوئی نہیں جان سکتا جو بھان سنگھ نے بہائے، جانے کتنے بھان سنگھ اسی طرح روتے، بلکتے، اُس بڑے سانحے کو یاد کرتے جان سے گزر گئے۔ زندگی آسان تو ہرگز نہیں ہے لیکن مہاجرت کے دکھ سے اس کی شدت سوا ہو جاتی ہے۔

سیتا میر چندانی کو بھی ایسی ہی جذباتی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب وہ کراچی سے براستہ ٹھٹھہ، حیدر آباد، ملتان، لاہور پہنچی، سندھ جو اس کی بچپن کی سنہری یاد تھا اس کے لیے ایک مذہبی یاترا میں بدل گیا۔

اسی شہری یاد کے کچھ حصے قرۃ العین نے سیتا ہرن کے اس ابتدائی حصے میں بیان کیے ہیں۔

سفر کی ابتدا ہوتی ہے تو ڈرگ روڈ کے راستے ٹھٹھہ کی طرف گاڑی چل پڑتی ہے۔ ستیا میر چندانی جو سندھ کی تاریخ سے واقف ہے ساتھ ساتھ سندھی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی چلی جاتی ہے۔ ٹھٹھہ کے متعلق بتاتی ہے کہ مغل دور میں یہاں کا بازار اتنا آباد تھا کہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے تو ٹھٹھہ کہلایا۔ حیدر آباد کے راستے میں اس پیڑ کی نشاندہی کرتی ہے جہاں وہ گاڑی روکتے تھے۔ غرض راستے میں وہ تمام جگہیں جن سے اُس کی یادیں وابستہ تھیں سیتا کو من ہی من میں رلاتی رہیں۔

سفر کے ساتھ سیتا کی کہانی بھی سامنے آتی ہے اس کا سندھ اور کراچی سے کیا تعلق تھا؟ سندھ سے کیسے ہجرت کر کے بمبئی پہنچے؟ اس کا بھی تفصیل سے تذکرہ ہوتا ہے۔

سیتا میر چندانی کے خاندان کی ہجرت

سیتا میر چندانی اپنے خاندان کے ساتھ سندھ سے بمبئی پہنچنے کے متعلق بتاتے ہوئے کہتی ہیں۔

> پہلے ہم یہیں حیدر آباد میں رہتے تھے۔ حیدر آباد میں ہمارا مکان تھا جو ہمارے دادا نے بنوایا تھا پھر ہمارے ڈیڈی نے کراچی پریکٹس شروع کردی اور وہاں کوٹھی بھی بنوالی۔ میں گریمر سکول اوراس کے بعد سینٹ جوزفز کالج میں پڑھتی رہی۔ ہمارا بہت بڑا خاندان تھا، رشتے کے چاچے، مامے اور ماسیاں۔ ان میں سے کچھ عامل کالونی میں رہتے تھے اور کچھ لاڑکانہ، حیدر آباد میں۔ میرا بھائی صرف ایک ہے اور دو بہنیں ہیں۔ یہ تینوں پارٹیشن کے سمے کافی چھوٹے چھوٹے سے تھے پھر اس کی آواز اداس ہوتی چلی گئی۔ جب پارٹیشن ہوا تو ہم لوگ جہاز پر بیٹھ کر کاٹھیاواڑ کے ایک پورٹ پر جااترے۔ اگست کے بعد اگلے تین مہینوں میں لاکھوں شرنار تھی ہوائی جہاز، ریل اور سمندر کے ذریعے یہاں سے گیا تھا۔ ۲۷

یہ بیان سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی سنی سنائی جانی پہچانی کہانی سنائی جارہی ہے اگر نام اور مقام بدل دیے جائیں تو یہ کہانی کسی بھی مسلمان لڑکی کی ہوسکتی ہے جو ہندوستان سے اپنے خاندان کا پاکستان آنا بیان کررہی ہے، ہندوؤں کے لیے بھی یہ ایک مشکل سفر تھا۔ سندھ کو اور کراچی کو بنانے میں ان لوگوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ پڑھے لکھے، ذہین سندھی ہندو جب ہندوستان پہنچے تو ابتدائی مشکلات کے بعد انھوں نے خاصی کامیابیاں سمیٹیں۔

سیتا میر چندانی اب اپنے خاندان کا تذکرہ کرتی ہیں۔ سندھ میں جو مقام ہندوؤں نے اپنی محنت سے بنایا تھا اس کا ذکر بہت عقیدت سے کرتی نظر آتی ہیں۔ انسان ماضی پرست تو ہے ہی لیکن اگر اس کا ماضی شاندار ہوتو پھر اس کے حصار سے بھاگنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور اگر مستقبل میں تاریکی نظر آنے میں تو ماضی کی روشنی ہی اس کی ڈھال ہوتی ہے۔ سیتا کی زبانی اس کے خاندان کا احوال۔

> سیتا کار میں بیٹھے بیٹھے باغ کے گھنے درختوں کو دیکھتی رہی۔ میں بچپن میں ڈیڈی کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھی۔ ڈیڈی پیر صاحب کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ہمارے دادا حیدر آباد کے مشہور وکیل تھے۔ ہربخش میر چندانی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ دادا جی پیر صاحب کے قانونی مشیر تھے۔ دوسرے وڈیروں کی طرح پیر صاحب بھی مستقل مقدمے لڑا کرتے تھے۔ آپ کو معلوم

ہے انگریزوں کے زمانے میں ہندوؤں نے خوب ترقی کی اور ہندو مہاجروں کے پاس مسلمان تقریباً گروی ہو گئے تھے۔ سندھی مسلمانوں کی کوئی مڈل کلاس نہیں بنی۔ یہ وڈیرے لوگ اسی طرح اپنی فیوڈل ازم میں قلعہ بند بیٹھے رہے اور شاید اب بھی ہیں۔ ۲۸

کلھوڑوں اور تالپوروں کے عہد میں ہندوؤں نے انتظامی سطحوں پر خاصی ترقی کی تھی انگریزوں کی آمد سے ان کا انگریزوں کے ساتھ ربط ضبط بھی مثالی تھا۔ اس لیے ان کو انگریزوں کے ساتھ معاملات کرنے میں بھی کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ کھتری ذات کے عامل جن کے نام سے کراچی میں عامل کالونی بھی موجود ہے۔ خصوصی طور پر آگے بڑھتے گئے۔ سیتا میر چندانی بھی عامل ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ لوگ سندھ میں خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کے پاس انتظامی ذمہ داریاں عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھیں یہ ذہین تھے اور انگریزوں نے جب مقامی لوگوں کو آئی سی ایس میں شامل کرنا شروع کیا تو عاملوں کی بڑی تعداد اس امتحان میں بھی کامیاب قرار پائی۔

اس زمانے میں جب مسلمان اپنی آوارہ گردی میں مشغول تھے۔ ہندوؤں کے بچے پڑھائی کی طرف راغب تھے۔ اس کے نتیجے میں معاشی سطح پر ہندو آگے بڑھتے رہے۔ انھوں نے سندھ میں خاصا رسوخ بنا لیا تھا۔ کراچی کو تو ہندوؤں کا شہر مانا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی کم تعداد وہاں آباد تھی اور تقسیم سے پہلے تک یہی صورتحال ہے۔ آج بھی اگر کراچی کو دیکھا جائے تو سندھی لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔

سیتا میر چندانی کا خاندان سندھ کا معتبر خاندان تھا یہ بات اب اُن کو بھلانے نہیں بھولتی۔ یہ تمام مہاجرین کا المیہ رہا ہے اس المیے کے تحت ان لوگوں کی زندگی گزری ہے۔ نوجوان نسل نے تو پھر بھی آگے بڑھ کر زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینی کی کوشش کی لیکن پرانے، عمر رسیدہ لوگوں کے لیے مستقبل میں کچھ نہیں تھا اُن کو ماضی کی یاد نے بے حال کر رکھا تھا۔

مہاجرین کے غم جابجا ناولوں، کہانیوں افسانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس تحقیق میں ان کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

مہاجرین کے اس غم واندوہ کو بیان کرتا ایک اقتباس پیش کر کے تحقیق کے اگلے ناول کا ذکر کیا جائے گا

> اسپیشل ریفیوجی ٹرین چلائی گئی تھی۔ جو میر پور خاص سے مارواڑ جنکشن تک جاتی تھی۔ وہاں ٹرانزٹ کیمپ قائم کر دیے گئے۔ جو لوگ یہاں سے گئے وہ زیادہ تر شہری پیشہ ور تھے۔ زمینوں

پر بسانا انھیں بہت مشکل تھا۔ یہ سب کے سب بمبئی پریذیڈنسی، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے ریفیو جی کیمپوں میں بھیج دیے گئے۔ میرے رشتہ دار بھی احمد آباد، جودھپور، وندھیا پردیش جانے کہاں کہاں بکھر گئے۔ بہت سے سندھی شرنارتھی بھول بھیج دیے گئے۔ ہم پہلے گاندھی دھام میں رہے۔ پھر الہاس نگر یہ سندھیوں کے لیے نئے سیٹلمنٹ بسائے گئے تھے۔ گاندھی دھام ہی میں ڈیڈی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ سارے سندھی شرنارتھیوں کی طرح ان کو بھی دو سال تک مالی امداد دی جاتی رہی۔ ۵۰ء کے شروع میں یہ امداد بند ہوگی۔ کچھ کیمپوں میں بیماروں اور بوڑھوں کو رکھا گیا۔ اس وقت سب شرنارتھی کاروبار کی تلاش میں سارے ہندوستان میں پھیل چکے تھے۔ ۲۹

قرۃ العین حیدر کا سیتا ہرن سیال لوکیل کا حامل ناول ہے کہانی کراچی کے مختصر مگر بھرپور تذکرے کے بعد ہندو مہاجرین کے ذکر سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی سیتا میر چندانی کی ذات سے متعلق ہے جو اپنی شناخت حاصل کرنے کے لیے نگر نگر گھومتی ہے لیکن اس عورت کے غم کم ہونے میں نہیں آتے۔ کراچی کا ضمنی تذکرہ تھا لیکن یہ تذکرہ ایک ہندو مہاجر کی زبان سے تھا جو کبھی سندھ اور کراچی کا باشندہ رہا۔

اس لیے یہ دوسرے ناولوں سے قدرے مختلف تھا۔ اس لیے کراچی کے تذکرے کو اپنی تحقیق میں شامل کیا۔

بنیادی طور پر کہانی میں ناسٹلجیا کا پہلو ہی سامنے لایا گیا ہے۔ اپنے گھر خاندان عزت وقار، رتبہ، مرتبہ جو کراچی اور سندھ نے اس خاندان کو دیا اس کا تذکرہ بڑی محبت سے سیتا میر چندانی نے بیان کیا۔ مہاجرین چاہے پاکستان کے ہوں یا ہندوستان کے آج بھی اپنے شہروں کی یاد میں بے کل اور بے قرار ہیں۔ جانے یہ کیسا عمل تھا جو ستر (۷۰) برس گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں کو بے چین کیے ہوئے ہے یہ زخم کیسا زخم ہے جو بھرنے میں ہی نہیں آ رہا۔

آج بھی جب کراچی کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو مہاجرین کے رستے زخم یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ستر برس اس عمل کو بھلانے کے لیے ناکافی ہیں اس یاد کو ذہن سے کھرچنے میں کتنا وقت لگے گا کوئی بھی اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہے۔ اگلے ناول کا ذکر جو محمد امین الدین نے لکھا ہے۔

کراچی والے

محمد امین الدین کا ناول کراچی والے کراچی کی سڑکوں، شاہراؤں، گلیوں، میدانوں، مکانوں، بازاروں میں پیش آنے والی وہ کہانی ہے جو کراچی کے ایک ہوش مند باسی نے سنائی۔ کراچی ملک پاکستان کا وہ شہر ہے جو بجا طور منی پاکستان کہلانے کا مستحق ہے ملک کے ہر کونے گوشے سے لوگ کراچی آئے اور پھر کراچی کے ہو کر رہ گئے۔ ان شہریوں نے اپنے اشتراک عمل سے ایک نئے شہر کی صورت گری کی ہے۔ کراچی ان کے لیے ماں سمان ہے جو ان کو پال پوس رہا ہے۔

شہریوں نے اچھے برے دن اکٹھے دیکھے ہیں غم خوشیاں مل کر برداشت کی ہیں۔ شہر کی فضا میں زہر گھلتا رہا اور ایک وقت ایسا آیا کہ شہر کی فضا میں سانس لینا دشوار ہو گیا۔ کراچی کی اس الجھی ہوئی پر پیچ زندگی کی تصویر کراچی والے میں دکھائی گئی ہے۔

محمد امین الدین کراچی کے رہنے والے ہیں۔ افسانے سے ابتدا کی اور آہستہ آہستہ ناول کی طرف آئے ہیں۔ محمد امین الدین کراچی کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح پہچانتے ہیں انھوں نے کراچی پر کراچی والوں پر جو بیتی یا بیت رہی ہے اس کو پیش کیا ہے۔ ناول ۲۰۰۹ء میں چھپا لیکن کہانی ۱۹۸۴ء کے اردگرد شروع ہوتی ہے ۔پس منظر کے طور پر ۱۹۴۷ء اور تقسیم کا تذکرہ بھی آتا ہے ۔کراچی پر لکھے جانے والے حالیہ ناولوں میں اس ناول کا شمار ہوتا ہے۔

اس ناول کا لوکیل خالصتاً کراچی ہے اگر کہانی کی ضرورت کے تحت لوکیل بدلتا بھی ہے تو کراچی سے اس کا گہرا تعلق واضح نظر آتا ہے۔ کہانی کا ایک اہم پہلو نوجوانوں کا المیہ ہے۔ کراچی کے نوجوان جو مستقبل کے معمار ہیں ۔ جنھوں نے کراچی کو تعمیر کرنا ہے۔ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں یہ ایک ایسے سفر پر آگے بڑھتے جا رہے ہیں جو ایک گہری کھائی پر اختتام پذیر ہوتا ہے جس کا انجام صرف تباہی ہے ۔ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

تعلیمی ادارے سیاسی اور مذہبی تقسیم سے بھرے ہوئے ہیں ۔نوجوانوں کے ذہنوں کو جلا بخشنے کے بجائے ان کے ذہنوں کو تاریکی سے بھر رہے ہیں، گویا تباہی کا مکمل سامان مہیا ہے۔ حقوق کی جنگ میں ان معصوموں کو جھونک دیا گیا ہے یہ لڑکے پڑھنے لکھنے کی عمر میں ہتھیاروں کا استعمال سیکھ رہے ہیں۔ مخالفین پر حملے کر کے ان کی لاشیں گرا رہے ہیں۔ غرض نوجوانوں کی بدقسمتی کا بھرپور بیان ہے۔

ناول کا مرکزی کردار شمس اس المیے سے گزرتا ہے۔ سیاسی تنظیم کا رکن ہونا تعلیم نامکمل، مستقبل مخدوش اور آخر کار خاندان سے دور زندگی یہ ایک ایسا مکروہ کھیل ہے جو طالب علموں کو سب سے زیادہ متاثر کر رہا ہے۔ جس عمر میں انھیں اخلاق، علم، بردباری، دیانت، ذہانت کے اسباق ملنے چاہیے تھے اس عمر میں انھیں نفرت، رجعت پسندی، تنگ نظری کا ایسا سبق پڑھایا جا رہا ہے جس کا انجام آخر کار بربادی ہے چاہے اپنی ہو یا دوسروں کی لیکن بربادی۔

نوجوانوں کے اس المیے کو پیش کردہ یہ ناول ایسے نوجوانوں سے بھی ملاتا ہے جو پڑھے لکھے ہیں اور معاشرے کو بدلنے کے ارادے سے آگے بڑھتے ہیں لیکن اطراف و جوانب میں پھیلی گمراہی ان کو نگل جاتی ہے۔

کاشف اس کہانی کا ایسا ہی کردار ہے جو تاریکی میں اُجالا، جہالت میں علم کی شمع روشن کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد صرف اور صرف خلق خدا کی بہتری ہے، جو قوم کا اثاثہ ہے۔ ایک دن خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ اس کے خاندان پر گزرنے والی قیامت ہر اس خاندان کی کہانی ہے جو معاشرے کو نئے سرے سے جیتا جاگتا، ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نیک خواہش کی ان کو کس قدر کڑی سزا ملتی ہے یہ بہت دکھ کی بات ہے۔

کراچی اس نہج تک کیسے پہنچا

تقسیم سے پہلے کراچی عالمی سطح پر اپنی پہچان بنا چکا تھا۔ چند لاکھ نفوس پر مشتمل شہر صاف ستھرا اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کے حوالے سے خطے میں مشہور تھا اس کے شہری خدا ترس اور دیالو تھے۔ ہندوؤں اور پارسی لوگوں کے قائم کردہ سکول، کالج، ہسپتال اس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔ انگریزوں نے بندرگاہ کی ترقی کے لیے خصوصی کاوشیں کیں جن کا شہر کی ترقی پر بہت مثبت اثر پڑا۔

تقسیم کے بعد ہندوستان کے کونے کونے سے مہاجرین پاکستان پہنچے ان سب کی آخری جائے پناہ کراچی ثابت ہوا۔ آزادی ملنے کے بعد مہاجرین کی آمد سے شہر کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت بدلنے لگی۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ اہلِ اقتدار بدلتے ہوئے معاشرے کو سمجھ نہ سکے پے در پے غلط فیصلے ہوئے جس سے کراچی کے شہری متاثر ہوئے۔ کراچی کو دارالحکومت بنانا، ون یونٹ کا قیام کراچی سے دارالخلافے کی منتقلی، ایوب خان کی فاطمہ جناح سے شکست یہ سب ایسے عوامل تھے جو اپنے نتائج رکھتے تھے۔ لسانی جھگڑے، سندھ مہاجر بڑھتی ہوئی تقسیم، ضیاء دور کی مذہبی شدت پسندی، مہاجروں، پٹھانوں کے جھگڑے۔ ان سب معاملات پر

حکومتوں کا پھسپھسا سا ردعمل، افغان جہاد کے دوران اور بعد میں کراچی میں غیر قانونی اسلحے کی ریل پیل یہ سب وہ عوامل ہیں جو کراچی کو تباہی کے دہانے پر لے آئے تھے۔ یہ سب کچھ ایک دم نہیں ہوا بلکہ اس عمل کے پیچھے حادثات و واقعات کی ایک لمبی قطار ہے۔

غرض یہ سب کچھ حکومتوں کی ناک کے نیچے ہوتا رہا۔ ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء یہ سب اپنے اپنے مفادات کا تو تحفظ کرتے رہے لیکن کراچی ان کی ترجیحات میں کہاں تھا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ کراچی کو لاوارث چھوڑ دیا گیا لوگوں کو کراچی سے محبت نہیں رہی۔ ذاتی اور گروہی مفادات نے مل کر اس روشنیوں کے شہر کو اندھیروں میں بدل دیا۔ ان سب حالات پر محمد امین الدین کراچی والے میں لکھتے ہیں۔

> نہیں، منظر انصاری نے شمس کے ابا دین محمد کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ نہیں انکل! اصل میں ہوا کچھ یوں، کہ آپ وہ لوگ تھے جو کسی بھی طرح کے وعدوں سے بے نیاز اور بے لوث ہو کر ایک نئی مملکت کو سنوارنے کا بھاری بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھائے جیے چلے گئے۔ پھر اس کے بعد میری نسل کے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے تھوڑا سا احتجاج کیا تو ان سے وعدے وعید کر لیے گئے، بہلاوے دیے گئے مگر ان وعدوں بہلاؤں کی تکمیل نہ ہو سکی۔ منظر ایک لمحے کو رکے اور دوبارہ گویا ہوئے، لیکن شمس اور ارشد اس تیسری نسل کے لوگ ہیں جنھیں اب جھوٹے وعدوں پر کوئی بھروسا نہیں ہے۔ آپ کی نسل کی بے زبانی، میری نسل کا ڈھیلا ڈھالا احتجاج اب نئی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہمیں ان بچوں کی باتوں سے اور ان کی شدید جھنجھلاہٹ سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن ان کے جو سوالات ہیں۔ ان کے جوابات ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہیں اور یہ خطرناک صورت ہے۔ کاش ۱۹۷۹ء میں افغان مہاجرین نے کراچی کا راستہ نہ دیکھا ہوتا یا کم از کم ہم نے اپنی سرحدوں پر آنے والے مہاجرین کے ٹرکوں اور بڑی بڑی بسوں کی باضابطہ تلاشی لی ہوتی۔ انھیں رجسٹریشن کے عمل سے گزارا ہوتا تو کراچی میں سہراب گوٹھ پر باڑہ مارکیٹ کی آڑ میں دوسرے دھندے نہ ہوتے۔ [۳۰]

یہ مہاجرین کی تیسری نسل ہے جو تجزیہ کے مطابق اب قابو سے باہر ہے یہ اپنے حقوق کی نہ صرف بات کرتی ہے بلکہ حقوق چھیننے کے لیے کسی بھی قسم کا حربہ استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاتی۔ یہ نسل قانونی اور غیر قانونی کی بحث سے بھی ماورا ہو چکی ہے۔ جب ۱۹۸۰ء کے آخری سالوں اور نوے کی دہائی کے حالات کو دیکھیں تو جو

ایسے سامنے آتے ہیں وہ دل دہلا دینے والے ہیں۔شہر کی اس ابتری کا مداوا کرنے کی کوشش کسی بھی حکومت نے نہیں کی۔

پاکستان پیپلز پارٹی ، متحدہ قومی موومنٹ ، پاکستان مسلم لیگ (ن) سیاسی منظر نامے پر کراچی کے حوالے سے اہم کردار ادا کرنے والی جماعتیں رہی ہیں ۔ان سب نے مسئلے کی جڑ کے بجائے علامات کا علاج کیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔گوکہ کراچی کے حالیہ حالات قدرے بہتر ہیں لیکن کون جانے یہ طوفان سے پہلے والی خاموشی ہے یا واقعتاً حالات بہتر ہوئے ہیں۔کراچی کا منظر نامہ وسیع ، پیچیدہ اور غم ناک ہے۔

کراچی کے باسی اپنی زندگیوں کو کیونکر گزارتے ہیں اس کا احوال، شمس، عالم، ارشد اور کاشف جیسے نوجوان اس کہانی میں سناتے ہیں ۔ایک پوری نسل تلاش لاحاصل کا شکار ہوگئی۔کوئی ناکامی سے ناکامی ہے۔

کراچی کے حالات کی بنیاد پر گفتگو کرنے کے بعد اب ناول کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

کراچی اور خاندانی زندگی

شہر چاہے جتنے بڑے ہوجائیں، آبادی چاہے جتنی زیادہ ہوجائے معاشرے کی بنیاد ایک خاندان ہوتا ہے جو ماں باپ اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔معاشرے کی بنیادی اکائی پہلی اینٹ خاندان ہوتا ہے۔اگر اس خاندان کی زندگی چین و آرام سے گزر رہی ہے تو لازماً اس کا اثر معاشرے پر مثبت ہوگا۔کراچی بھی ایسے لاکھوں خاندانوں پر مشتمل آبادی کا شہر ہے۔

ان خاندانوں میں امیر ،غریب ، سندھی، پنجابی، پٹھان، مہاجر ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔مختلف پیشوں سے منسلک یہ لوگ کراچی میں زندگی گزارتے ہیں۔

اگر ان کی زندگی میں آسانی اور سہولت ہے تو لازماً شہر کا مزاج بھی ہنستا مسکراتا ہوگا۔ایک زمانے میں کراچی کی فضا میں امن و شانتی تھی لیکن وہ پرانی بات ہے۔اب تو کراچی لسانی جھگڑوں سے ابتدا کرتا ہوا طالبان اور داعش جیسی جنونی تنظیموں کی رزم گاہ بن چکا ہے۔مہاجر کی حقیقی مہاجر سے لڑائی پھر فوجی آپریشن کے نام پر شہریوں کے ساتھ ہتک آمیز رویہ غرض خاندانی زندگی کو تہس نہس کرنے کے سارے عوامل اس شہر میں یکجا ہوگئے تھے۔

ان حالات میں ماؤں کا اپنے بچوں کے لیے ہر وقت پریشان رہنا سمجھ میں آتا ہے۔والدین کا ہر وقت

تناؤ میں رہنا، بار بار دروازے پر جانا بچوں کی خیریت پوچھتے رہنا۔خاندانی زندگی کے تہہ و بالا ہونے کی روداد سناتا ہے۔

کہانی کے مختلف کرداروں کے ذریعے ایسے ہی مناظر سامنے لائے گئے ہیں جہاں والدین اپنے بچوں کے لیے بے حد فکر مند ہیں۔

پروفیسر الفت رضا جو بائیں بازو کے دانش ور ہیں اور مساوات، انصاف اور اعلیٰ اخلاقی معیار کے قائل ہیں ایک سمینار میں اپنے متعلق بتاتے ہیں۔

> بہرحال میں نے ایک اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھایا، انھوں نے جب مجھ سے ڈھیروں سوالات، میرے پیشے، میرے گھر، میری سماجی مصروفیت کے حوالے سے کیے اور میری زندگی کو کھنگالا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ میں بعض باتوں او معاملات میں ابنارمل سا بی ہیو کرنے لگا ہوں۔مثلاً مجھے غصہ پہلے کی نسبت اب جلدی آجاتا ہے۔ میں فیصلہ اب اتنی سرعت سے نہیں کرتا جتنا پہلے کرلیا کرتا تھا۔میرے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔میرا بیٹا جب گھر سے باہر ہوتا ہے تو اس کے لوٹنے تک میں فکر مند رہتا ہوں، میری بیٹیاں جب کالج جاتی ہیں تو میں اکثر وسوسوں میں گھر جاتا ہوں اور ان کی واپسی پر ان کے چہرے پر لکھی ہوئی پریشانی یا اطمینان کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔[۳۱]

پروفیسر الفت جیسے اور بھی بے شمار والدین اپنے بچوں کے بارے میں پریشان ہیں زندگی مسلسل پریشانی میں آخر کیسے کاٹی جاسکتی ہے؟ زندگی میں روزگار کی فکر ہی انسان کو چین نہیں لینے دیتی ایسے میں اگر جان بچانے کی فکر بھی صبح و شام کی ساتھی بن جائے تو کیونکر گزارہ ہوسکتا ہے۔شمس کے والدین جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے سب سے زیادہ اپنے بچے کے ہاتھوں فکر مند ہیں۔ جونوجوان ہے بری بھلی تعلیم بھی رکھتا ہے گو اسے تعلیم نہیں کہ سکتے آج کل اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک تنظیم کا رکن بنا ہوا ہے یہ تنظیم کچھ عرصے سے زیرعتاب ہے اس لیے شمس کی زندگی بھی مشکل میں ہے۔اسی کے حوالے سے اس کا گھرانہ بھی ایک کرب کی کیفیت میں ہے۔

ماں، باپ، بہن، بھائی سارے پریشان ہیں کہ نہ جانے کیا ہوجائے کب ہوجائے اور ایسے میں شمس کے دوست ٹیپو کی ہلاکت شمس کے لیے ایک بڑی مصیبت بن کہ آتی ہے کیونکہ شمس ٹیپو کے ساتھ تھا جب ایک

چوکی سے ان پر فائرنگ کی گئی اور شمس بمشکل جان بچا کر گھر پہنچا۔

اس وجہ سے اسے روپوش ہونا پڑا اور آخر کار ملک ہی چھوڑ نا پڑ گیا۔ عظیم اس کا بڑا بھائی بڑی مشکل سے اُسے پاکستان سے باہر بھیجتا ہے۔ یہ ہیں وہ حالات جن کا سامنا کہانی کا مرکزی کردار کرتا ہے۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب شمس کی انھی حرکتوں کی وجہ سے اس کو اس کی من پسند لڑکی کا رشتہ مانگنا مشکل ہو جاتا ہے تو اس کی ماں کہتی ہے۔

"بیٹا میں اپنی بہن کو سمجھا سکتی ہوں، بہنوئی کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں اور پھر جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو کس کے آگے جا کر جھولی پھیلائیں۔"[۳۲]

یہ انھی کھوٹے سکوں کی کہانی ہے جو حالات و واقعات کے سامنے بے بس ہو کر کھوٹے بن گئے۔ ان کی وجہ سے خاندان کے سارے لوگ تکلیف میں ہیں۔ کیا ان کے درد کو سمجھنے کی کوئی کوشش ہوئی ؟ اسکا جواب نفی میں ہے۔

کراچی کے نوجوانوں کا المیہ اور محمد امین الدین کا کراچی والے

قوموں کی تعمیر و ترقی میں سب سے بڑا کردار اس قوم کے نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ نوجوانوں کی زندگیوں کا مقصد ملک و قوم کی خوشحالی ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے بغیر ترقی کا خواب ادھورا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری میں نوجوانوں کو مخاطب کیا اور ان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ دنیا کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس قوم کے نوجوان ہی جوہری تبدیلی لا سکتے ہیں۔

علم سے دوری

کراچی میں مہاجرین کی آمد کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ یہ ذہین اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ لوگ شاعر بھی تھے، ڈاکٹر بھی، سول سرونٹ بھی گویا ہر شعبہ زندگی میں ان کی خدمات سے قوم فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کی اگلی نسل اس جھنڈے کو تھام کر آگے بڑھتی اور نئے نئے اُفق اس کی دسترس میں ہوتے لیکن شومئی قسمت سے ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایسا نہ ہو سکنے کے بعد کراچی کی زندگی میں سب سے زیادہ نقصان بھی اس مہاجر قوم کا ہوا۔

مصطفیٰ کمال جب قائد تحریک الطاف حسین سے لاتعلق ہوئے تو انھوں نے مہاجر نوجوانوں کے اس

کرب کا برملا اظہار کیا کہ ہم پڑھے لکھے لوگوں کی اولاد تھے اور آج ہم کو کیا بنا دیا گیا۔ مہاجرین کے بچے جو تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں تحریک کے کام سے منسلک ہوگئے اور اپنی پڑھائی سے غافل ہوتے چلے گئے ۔نوجوانوں کے پاس اسلحہ آیا اور اس کے بل بوتے پر انھوں نے بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان اور چندہ لینے کی مہم شروع کی۔ ان کچے ذہنوں کو اس عمل نے اس قدر خراب کیا کہ وہ صرف داداگیری کے قابل رہ گئے۔

یہ تکلیف دہ بات تھی ۔ پوری قوم کا یوں گمراہی کے راستے پر چل پڑنا کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ اس عمل سے پوری ایک نسل جاہل رہ گئی اس بات کو محمد امین الدین نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ شمس خود بھی تعلیم کے میدان میں کوئی کارہائے نمایاں سرانجام نہ دے سکا۔

اس کے دوست کاشف کے علاوہ، بُندو، ارشد اور عالم بھی کوئی خاص پڑھے لکھے نہ تھے۔ ایسے عالم میں جب تنظیمی اور تحریکی کاموں کی بدولت معاشرے میں تھوڑی سی عزت ملنا شروع ہوجائے تو پڑھائی جیسے مشکل اور جانگسل کام کو کون نبھائے گا۔ کاشف جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سوچنے والا نوجوان ہے وہ اس سارے عمل پر کڑھتا ہے اور اس کے ذریعے محمد امین الدین ہمیں نوجوان نسل کی کم علمی اور جہالت کی تصویر دکھاتے ہیں۔

ایک اقتباس میں اس عمل کا نقشہ یوں پیش کیا گیا ہے۔

> کاشف نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ میرے کہے کی تعبیر تم اس اندھیرے میں کررہے ہو جو اس وقت چاروں طرف فضا میں پھیلا ہوا ہے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں تو اس اندھیرے کی بات کررہا ہوں جو دھیرے دھیرے ہمارے معاشرے کے وجود میں سرایت کرتا جارہا ہے۔ ہم علم حاصل کرنا چھوڑ چکے ہیں، ہنر سیکھنے سے بھی گریز کرنے لگے ہیں، آسان راستے تلاش کرنے کی عادت اور آسانی سے ترقی کے زینے چڑھنے کی خواہش نے ہمیں اندر سے کھوکھلا کردیا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں ڈگریاں تو آجاتی ہیں لیکن ہم سے کوئی چار سطر کی درخواست بھی لکھواتا ہے تو نہیں لکھ پاتے۔ ۳۳

اس عہد میں جب باقی اقوام کے نوجوان علم و عمل کی نئی منازل طے کررہے ہیں پاکستانی نوجوان علم سے دوری کی وجہ سے جن راہوں پر چل پڑے ہیں ان کا انجام صرف تباہی ہے۔

مہاجرین ہوں یا پٹھان جب نوجوان ہی منزل سے دور ہوتے جائیں تو قوم کیسے آگے بڑھ سکتی ہے۔ نوجوانوں کو تحریکی، تنظیمی کام کی وجہ سے اپنے اصل مقصد سے ہٹا دیا ان کو آتش و آہن سے روشناس کرا کے لیڈرا

ن نے بہت بڑی غلطی کی اس کا نتیجہ کراچی کے رہنے والے جانے کب تک بھگتتے رہیں گے۔

بے سمتی کا عذاب اور نوجوان نسل

محمد امین الدین کا ناول کراچی والے شمس کے دوست ٹیپو کی قانون نافذ کرنے والے ادارے کے ہاتھوں ہلاکت سے شروع ہوتا ہے۔ ٹیپو کو گولی لگنے کے بعد شمس گاڑی سے بھاگ نکلتا ہے اور چھپتا چھپاتا گھر پہنچتا ہے اور ماں، بہن سے الجھ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلا جاتا ہے۔

کراچی کی گلیاں ایسے ہزاروں نوجوانوں کی داستانوں سے بھری ہوئی ہیں جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ۹۰ء کی دہائی میں یہ قتل و غارتگری عروج پر تھی۔ آپریشن کلین اپ ہو یا کوئی اور فوجی آپریشن اس عمل کے نتیجے میں سب سے زیادہ جو طبقہ متاثر ہوا تھا وہ نوجوانوں کا تھا۔ یہ نوجوان جو اس ملک و قوم کی خدمت کے لیے کچھ کر سکتے تھے اندھی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ان کے گھر والے کس کرب سے گزرے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں۔

محمد امین الدین کا ناول کراچی والے نوجوانوں کی اس پر اذیت زندگی کا ایک پہلو سامنے لاتا ہے۔ ایسے نوجوان بھی تھے جو دوسروں پر تشدد کرتے رہے لیکن یہ عمل ان کو سکھایا گیا وہ خود سے اس طرف نہیں آئے۔ ان کے سامنے خواب رکھے گئے ان کو ہپناٹائز کیا گیا۔ خواب میں سوتے معمول کی طرح ان سے معاشرے کی جڑوں پر ضرب لگائی گئی۔ یہ نوجوان جو اپنے خاندانوں کے کفیل بن سکتے تھے، حقوق کی جنگ میں الجھائے گئے۔

محمد امین الدین کراچی والے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> یار کاشف! شمس جو کہ کاشف کے بولنے کی صلاحیت سے آگاہ تھا، ہنستے ہوئے بولا۔ تجھے کتابوں نے خراب کر دیا ہے۔ پیارے دوست! حقوق شرافت اور قابلیت سے نہیں ملتے طاقت سے ملتے ہیں۔ تیری انگریزی تو بہت اچھی ہے تجھے مائٹ از رائٹ کا مطلب تو بہت اچھی طرح معلوم ہوگا۔ [۳۴]

یہ مختصر جملہ مائٹ از رائٹ نوجوان نسل کے ذہنی رجحان کا پتا دیتا ہے کہ کراچی کے نوجوان کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ سوچ نہ ایک دن میں بنی ہے اور نہ اس کے ختم ہونے میں ایک دن لگے گا۔ اپنی محرومیوں کے قصے سنا سنا کر یہ نسل تیار کی گئی ہے۔ اس نسل کو صرف یہی پتا ہے کہ آگے بڑھ کر چھین لینا ہی درست ہے۔ جو آپ کے

راستے میں آئے اس کو مار گرا کر آگے بڑھنا کارِ خیر ہے۔ تنظیم کی خاطر خون کی ہولی کھیلنا جائز ہے۔

اس شہر نے دہشت و بربریت کی ہر حد کا نظارہ کیا ہے۔ بوری بند لاشیں، سرکٹی لاشیں، تشدد زدہ لاشیں، بے گور و کفن لاشیں، یہ کراچی کی معاشرتی زندگی میں بولے جانے والے عام الفاظ تھے۔ اخبارات، مجلّے ان الفاظ کی تکرار سے بھرے ہوتے تھے۔ روزانہ لوگ قتل ہوتے جیتے جاگتے انسان نظروں سے اوجھل ہوجاتے۔ ایسے مناظر دیکھ کر جو نسل نوجوان ہوئی اس کے لیے کسی کی جان لینا قطعاً مشکل نہ رہا۔ یہ سارا کام اس نسل کے ہاتھوں ہو رہا تھا جس نے قوم کو سجانا سنوارنا تھا۔ قلم کی جگہ بندوق نے لے لی تھی۔

زینت حسام کا ایک مضمون کراچی کی کہانی جلد دوم میں شائع ہوا۔ کراچی کے نوجوانوں پر بڑے چشم کشا حقائق سامنے لاتا ہے۔

ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے کہ کراچی کے نوجوانوں کی زندگی کی رائیگانی کو سمجھا جائے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں ساٹھ مربع گز کے پلاٹوں کی حد بندی شروع ہوئی۔ شیڈوں کو منہدم کیا گیا اور پرانے مکینوں کو نئے پلاٹ الاٹ ہوئے لیکن ان گنت پلاٹ دلالوں کے ذریعے کراچی کے دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کیے گئے اور یوں اے ون ایریا ۱۹۸۰ء کی دہائی کے تین خطرناک عناصر، ہتھیاروں، ہیروئن اور ایم کیو ایم کی پناہ گاہ بن گیا۔ ۱۹۹۲ء کے وسط میں ہونے والے واقعات، آپریشن کلین اپ اور حقیقی کی پیدائش۔۔۔نے بارود کا کام کیا۔ ہم ملیر میں ۳۵ سال سے ہیں لیکن ایسے حالات نہیں دیکھے، یہ ایم کیو ایم کی دھڑے بندی تھی جس نے ہم سب کو برباد کیا۔ لالو کھیت، کورنگی اور دوسرے علاقوں سے ایم کیو ایم کے لڑکے چھپنے کے لیے یہاں اٹھ آئے۔ چھپنے چھپانے والوں نے ہمارے علاقے کا ستیاناس کیا۔ اب یہ لڑکے بندوقیں لٹکائے، گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ڈاکا ڈالتے ہیں۔ بھتہ لیتے ہیں۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی کوئی عزت نہیں۔ ہماری گلی میں ایک بوڑھا، سفید کھچڑی بال، سبزی کا ٹھیلہ لگاتا ہے۔ اسے ان لڑکوں سے التجا کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ باندھ کے وہ ان اٹھارہ اٹھارہ برس کے لڑکوں سے کہتا ہے۔ سرجی پھیری لگا لوں؟ ایک ہفتہ ہوا، ان لڑکوں نے پنساری کی دکان لوٹ لی، گلی کے بچوں میں لوٹی ہوئی ٹافیاں اور دو دو روپے تقسیم کیے اور کہا، بولو حقیقی زندہ

باد، ہمارے دودھ والے نے میرے میاں کو بتایا کہ لڑکے اس سے دس ہزار مانگ رہے ہیں کہ اسلحہ خریدنا ہے۔غریب دودھ والا دس ہزار کہاں سے لاتا۔ بے چارہ یہ علاقہ چھوڑ گیا، خدا جانے اب کہاں دودھ بیچتا ہوگا۔تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔یہ غنڈے بدمعاش جن کے منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے نہ صرف یہ کہ بھتہ مانگتے ہیں بلکہ تمہارے منہ پر کہتے ہیں اسلحہ ختم ہوگیا، بندوقیں لانی ہیں گولیاں خریدنی ہیں۔تین سال کے عرصے میں سکینہ نے اس علاقے کا جو اخلاقی اور معاشرتی زوال دیکھا ہے، اس نے ان کا سر چکرا دیا ہے۔[۳۵]

زینت حسام کا یہ مضمون کراچی کے نوجوانوں کی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔طوالت کے باوجود اسے اس لیے پیش کیا کہ بتایا جاسکے کہ کراچی کا نوجوان جس کہ منہ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے ڈکیتی اور چھینا جھپٹی کا عادی بنتا جارہا ہے تو آگے چل کر اس سے معاشرے کو کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔صولت مرزا جیسے لوگوں کی صورت میں یہی نوجوان پھانسی کے پھندے پر جھولتے نظر آتے ہیں۔

زینت حسام کا یہ مضمون نوجوانوں کی اٹھان سے متعلق بڑے لرزہ خیز حقائق سے بھرا ہوا ہے لیکن ان سے آنکھیں چرا کر زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ان حقائق کو سمجھنا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا یہی نسل ہے جو محمد امین الدین کے ناول کراچی والے میں حالات سے بھاگتی، چھپتی چھپاتی اپنے والدین کو مصیبت میں ڈالتی نظر آتی ہے۔

ایسے ہی کچھ مناظر کراچی والے میں بھی نظر آتے ہیں جب شمس جو ٹیپو کی موت سے از حد افسردہ ہے لیکن کسی سے کچھ نہیں کہہ پاتا جب اپنے دوستوں کے پاس پہنچتا ہے تو پھوٹ پھوٹ کر روتا نظر آتا ہے۔اس کے آنسو تمام ان نوجوانوں کے آنسو ہیں جو تاریک راہوں کے مسافر ہیں جو تاریک راہوں میں مارے گئے ہیں۔

کراچی کے نوجوانوں کی اکثریت صرف اس وجہ سے شہر کو نہ بچا پائی کیونکہ ان کو کسی نے درست سمت کی طرف بلایا ہی نہیں ہر کوئی انھیں گمراہ کررہا تھا اور یہ معصوم انھیں راہ نما سمجھ کر ان کے پیچھے چلتے رہے۔

کراچی کے نوجوان اور مذہبی شدت پسندی

لسانی جھگڑے، حقوق کی جنگ، مہاجر پٹھان لڑائیاں، حقیقی اور مہاجر چپقلش ان سب کے ساتھ ساتھ کراچی میں جو عنصر آگے چل کر بہت بڑی تبدیلی کا موجب بننے والا تھا وہ مذہبی شدت پسندی تھی۔

کراچی کے مہاجرین مسلمان تھے لیکن اکثر مہاجرین کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ کراچی یونیورسٹی میں بننے والی تنظیموں سے یہ بات ثابت ہے (جن کا احوال پہلے باب میں پیش کیا گیا) کہ اکثر اوقات تنظیموں کا تعلق بائیں بازو سے رہا جو مہاجرین کے حقوق کی بات کرتی تھیں۔ ضیاء دور میں مذہب کو سیاسی سطح پر استعمال کیا گیا اور نرسری کے طور پر کراچی یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی پشت پناہی کی گئی۔ اس پشت پناہی کے بڑے مہلک اثرات مرتب ہوئے۔ کراچی کا سارا منظر لہولہو ہوتا چلا گیا۔ مذہبی شدت پسندی نے مکالمے کی فضا کو محدود کر دیا۔ اپنی بات کہنے کی آزادی تو مانگی گئی لیکن دوسروں کو اُن کی بات کہنے کی اجازت سرے سے نہیں دی گئی۔ اس عمل کے کئی نقصانات ہوئے مذہب کو ساکت و جامد بنا کر پیش کیا گیا اور مذہبی معاملات میں بحث مباحثے کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ اس عمل سے نوجوانوں کی ایک پوری کھیپ رجعت پسندی اور اپنے بیانیہ پر شدت سے ڈٹ جانے کی عادت میں مبتلا ہوگئی۔ اس عادت نے آگے چل کر شہر کا بڑا نقصان کیا۔ کراچی یونیورسٹی کے کئی پروفیسروں کا قتل اسی مذہبی جنونیت کے حصے میں آتا ہے۔

کراچی والے کے پروفیسر الفت رضا بھی ایسے کردار ہیں جن کو زدوکوب کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے ایک ذہین شاگرد کاشف کو دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا۔

پروفیسر الفت رضا ایک مہربان اور اپنے پیشے سے محبت کرنے والے استاد ہیں جو طالب علموں کو چیزوں کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بائیں بازو کی سوچ سے متاثر ہیں اور مساوات اور برداشت کی بات کرتے ہیں جب ان کا ایک مضمون شائع ہوتا ہے تو چند طالب علم ان سے استفسار کرنے آتے ہیں۔

وہ مکالمہ کچھ یوں ہے۔

> سر چند روز قبل ایک میگزین میں آپ کا آرٹیکل شائع ہوا تھا۔ ہم اس کا پس منظر جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے آخر اُسے کیوں لکھا؟ وہی نوجوان بولا۔ دیگر لڑکے خاموش تھے لیکن ان کے تیور سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پروفیسر الفت رضا سے مل کر خوش نہیں ہیں۔ یہ گفتگو خاصی طویل ہے ہم صرف اس کے اختتامی چند جملے لکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ آپ مسلسل ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچانک ایک نوجوان شدید غصے میں بولا۔ ہم آپ کا احترام کر رہے ہیں آپ اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اسلام کے لیے ہم جان دے بھی

سکتے ہیں اور جان لے بھی سکتے ہیں۔ ۳۶

اس گفتگو کے بعد پروفیسر صاحب کو مارا پیٹا جاتا ہے ان کے بازو توڑ دیے جاتے ہیں تا کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں اور جب کاشف معاشرے کے لیے کچھ نیا کچھ بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پگھلا ہوا سیسہ اس کے جسم میں اتار دیا جاتا ہے۔

وہ نوجوان جو معاشرے کے لیے سود مند ثابت ہوسکتا تھا جو معاشرے کی بہتری کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا خاک وخون میں نہلا دیا جاتا ہے۔

یہ مذہبی شدت پسندی کراچی کو کھوکھلا کر رہی ہے شہر سے اس کی آزادی کو چھین لیا گیا ہے وہ آزادی جو شہروں، ملکوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔ محمد امین الدین کا کراچی والے نوجوانوں میں مذہبی حوالے سے پائی جانے والی بے چینی کی بھی عمدہ تصویر دکھاتا ہے۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بائیں بازو کی جماعتیں اور دینی جماعتیں کراچی یونیورسٹی میں برسر پیکار رہی ہیں گویا کاشف کی کہانی کوئی فرضی قصہ نہیں بلکہ ماضی ایسے نوجوانوں کی داستانوں سے بھرا ہوا ہے۔

در بدری کا عذاب اور کراچی کے نوجوان

اَسّی کی دہائی کے آخری سالوں اور نوے کی دہائی میں کراچی کے حالات بہت مخدوش تھے۔ کرفیو، چھاپے، تلاشیاں، مہاجروں کی تذلیل یہ عام باتیں تھیں۔ نوجوانوں کو غائب کر دینا یہ سب ہو رہا تھا اور ظاہر ہے اس کا ردعمل بھی آ رہا تھا اس سارے عمل میں معاشرے کا فعال ترین طبقہ یعنی نوجوان بری طرح پس رہے تھے۔ تعلیم سے دوری، ہنر سے دوری، مقصد حیات سے دوری غرض پوری نسل کے سامنے کوئی مستقبل نہیں تھا۔ ایسے میں وہ نوجوان جو کسی جرم میں ملوث ہوگئے تھے ان کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو پکڑے جائیں اور اذیتیں جھیلیں یا پھر ملک سے فرار ہو جائیں۔

اب محمد امین الدین کے ناول کراچی والے میں کہانی کے مرکزی کردار شمس کے حوالے سے کچھ گفتگو پیش کرتے ہیں جو کراچی کے اس معاشرے میں اپنا مقام بنانے کی سعی میں راہ سے بھٹکتا ہے اور اس کا انجام بھی دردر کی خاک چھاننا رہ جاتا ہے۔

شمس جو کراچی کا رہنے والا ہے جو نوجوان ہے جس کی آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں جو ایک خوب صورت زندگی کا خواب دیکھتا ہے کراچی کے حالات کی نذر ہو جاتا ہے۔ اپنے دوست ٹیپو کی ہلاکت کے بعد اس پر زندگی تنگ ہوتی جاتی ہے۔ پہلے اسے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑتا ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی سے دوری ایک تنگ کمرے کی زندگی اور پھر ایک دن ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔

نہ جانے کراچی کے کتنے نوجوان اس انجام سے دوچار ہوئے، کتنوں کے ہاتھوں میں مایوسی آئی۔

شمس کی زندگی میں صرف والدین سے دوری نہیں بلکہ اپنی محبت کی قربانی بھی دینا پرتی ہے۔ سونیا جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہوتے ہیں اس کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ غرض ایک غم کا دریا ہے جس کی ہر لہر پہلی لہر سے زیادہ خونی اور تکلیف دینے والی ہے۔

ناول سے شمس کی زندگی کی کچھ جھلکیاں۔

شمس کے دوست بُندو، ارشد، عالم اور کاشف ان کے ساتھ گزاری زندگی کی شامیں برگد کے درخت تلے بیٹھنا، بے فکری کے مزے اور دوستوں کے ساتھ لگائی گئی خوش گپیاں شمس کی زندگی کا ایک پہلو ہیں۔ پھر وہ ایک بہن کا بھائی ہے اس کے ساتھ کی گئی پیار محبت کی باتیں اور بھائی عظیم کی بے لوث اور بے غرض محبت یہ سب شمس کی زندگی میں شامل ہے جو اس سے چھن جائے گا۔ یہ کراچی کے اکثر نوجوانوں کا المیہ ہے۔

شمس کی دوستوں کے ساتھ آپسی گپ شپ۔

تیرا مزار بھی ہوگا میں اس پر قوالی بھی کرواؤں گا اور قوال تالی پیٹ پیٹ کر گا رہا ہوگا۔

یہ کہہ کر شمس لہک لہک کر گانے لگا۔

نہ تو کارواں کی تلاش ہے نہ تو ہم سفر کی تلاش ہے۔

میرے شوقِ خانہ خراب کو تیری رہ گزر کی تلاش ہے۔

جس وقت شمس گا رہا تھا اس وقت چبوترے پر صرف وہ دونوں تھے۔ ۳۷

یہ ہنستا مسکراتا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ بے فکری کی زندگی گزار سکتا تھا لیکن کراچی کی ہلچل نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تنظیمی معاملات میں ان نوجوان لڑکوں کو ملوث کر لیا۔ شمس حقیقی کا ہے یا متحدہ کا کیا فرق پڑتا ہے۔ فرق تو انجام سے پڑتا ہے اور انجام بدقسمتی سے دونوں کا ایک ہے۔

یہی لڑکا سونیا سے محبت کرتا ہے اور اس کے نواب شاہ سے کراچی منتقل ہونے پر خوش ہے کہ ملاقات کے بہانے ملتے رہیں گے لیکن سونیا کے والد اس کی سیاسی مصروفیات سے واقف ہیں وہ شمس کو داماد بنانے پر تیار نہیں اپنی بیگم کو صاف منع کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو کبھی شمس کے حوالے نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ شمس کو جب یہ خبر ملی تو اس کو بہت دکھ ہوا لیکن وہ کر کچھ نہیں سکتا تھا جو شخص اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہو اس کے پاس فیصلے کے اختیار بہت محدود ہو چکے ہوتے ہیں۔

اس کا دوست کاشف اسے یہ خبر سناتا ہے۔

سونی کی شادی ہو رہی ہے۔

کیا؟ شمس نے حیرت سے پوچھا؟

دو ماہ بعد شادی ہے۔ کاشف نے اگلا جملہ کہا۔

کیا بکواس کرتا ہے۔ کس سے شادی ہے؟ شمس یکا یک طیش میں آ گیا۔

سونیا سے متعلق کوئی بھی بات جو شمس کی نفی کرتی ہو وہ اسے سننا گوارا نہیں تھا۔

تمہارے رشتہ داروں میں نہیں، غیروں میں ہے، شاید دبئی میں رہتا ہے۔

شمس کے اندر کھلبلی سی مچ گئی، وہ سونیا سے محبت کرتا تھا اور صرف وہی نہیں سونیا بھی اسے چاہتی تھی۔

اس کی اماں کی بھی خواہش تھی کہ سونیا کو اپنی بہو بنائیں اور آمنہ خالہ بھی یہی چاہتی تھیں مگر احمد خالو نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتا کہ وہ اسے ذرا پسند نہیں کرتے مگر خاندانوں میں تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں چلتی رہتی ہیں۔ اسے ہمیشہ سے یہ امید تھی کہ جب کبھی بھی شادی کی بات چلے گی تو اماں اور آمنہ خالہ، احمد خالو کو راضی کر لیں گی یوں بھی احمد خالو اماں اور ابا کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سونیا کی شادی کے معاملے میں اس قدر جلدی کریں گے اور بالخصوص اس وقت جب وہ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ [۳۸]

زندگی انسانی توقعات کے مطابق نہیں چلتی اس کی اپنی ڈگر ہے یہ اسی ڈگر پر چلتی رہتی ہے شمس جیسے نوجوانوں کے لیے ایک کے بعد ایک ناکامی گویا ان کا رستہ دیکھ رہی ہوتی۔

شمس جو ٹیپو کی موت کے بعد روپوش ہے گھر نہیں جا سکتا۔ ماں، باپ سے دور ایک زیر تعمیر گھر میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی زندگی اس کا پیار اس سے چھینا جا رہا ہے مگر وہ بے بس ہے اور مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتا کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا حالات نے اتنا بھیانک رخ اختیار کیا ہے کہ شمس تیز پانی پر بہتی لکڑی کی مانند اپنی راہ کا تعین خود نہیں کر رہا ہے بلکہ کوئی غیبی طاقت اس کی راہ متعین کر رہی ہے۔

میری بساط ہے کیا میں ہوں برگِ آوارہ

اُڑا کے لے چلے مجھ کو جدھر ہوا چاہے

ایک تنگ و تاریک مکان میں روپوش شمس اس خبر سے بالکل ڈھے جاتا ہے اور کاشف کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے۔ شمس کہتا ہے۔

> یار کاشف! مجھے یہاں سے نکال۔ اب مجھے یہاں خوف آنے لگا ہے۔ رات دن یہاں دبکا پڑا رہتا ہوں کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کسی نے مخبری کر دی تو کیا ہوگا؟ کبھی کبھی ان لوگوں سے بدگمان ہونے لگتا ہوں جنھوں نے میرے لیے خود کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ راتوں کو اکثر ڈر جاتا ہوں، ٹہلنے لگتا ہوں۔ کبھی چھت پر چلا جاتا ہوں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے کچھ آنکھیں میری تاک میں گھات لگائے بیٹھی ہوں۔ سارا سارا دن ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتے ہوئے خالی بے رنگ دیواروں کو تکتا رہتا ہوں۔ جب مجھے بخار چڑھا تو شازیہ کے ہاتھوں سے ماتھے پر رکھی ٹھنڈی پٹیاں یاد آئیں۔ کبھی اس کا میرے بالوں میں تیل لگانا یاد آتا ہے، کبھی اماں کا پیار اور ان کا ڈانٹنا یاد آتا ہے۔ کبھی تم یاد آتے ہو کبھی بوڑھے درخت کی چھاؤں یاد آتی ہے۔ دن میں تنہائی ڈستی ہے اور رات میں خوف ڈنگ مارتا ہے ان سب سے بچنے کے لیے یادوں کا سہارا لیتا ہوں تو وہ بھی مجھے لہولہان کر جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔[۳۹]

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ کیا ہے گویا نوحہ ہے نوجوان نسل کا جو آنکھوں میں خواب لیے، دل میں ارمان لیے، اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے تنظیموں میں شامل ہوئے لیکن بدقسمتی سے راہبروں نے راہ زنوں کی طرح قافلے کو لوٹ لیا۔ ان لڑکوں کے خواب چھین لیے ان کو گمراہ کر دیا۔ یہ گمراہ لڑکے اب کس طرف جائیں کیا کریں ان کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ کوئی ان سے شادی کیوں کرے؟ کوئی ان کا درد کیوں بٹائے؟

کوئی ان کو اپنا کیوں بنائے؟ یہ ناپسندیدہ نوجوان ہیں ان کا مقدر یا تو جیل ہے یا اندھی گولی جوان سے بچ نکلا وہ کسی غیر ملک میں اپنی زندگی کی گاڑی کھینچنے پر مجبور ہے۔

کراچی جو پورے ملک کی معیشت میں بڑا حصہ ڈالتا ہے۔ جو پاکستان کی معاشی شہ رگ ہے جب اس کی طرف دیکھیں اور ان خانماں برباد لڑکوں کی طرف دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کے لیے اس کے دامن میں کوئی جگہ نہیں۔

معاشرہ ان کو قبول کرنے پر تیار نہیں ان کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بہت دکھ دینے والی بات ہے کہ ان لڑکوں کو کراچی سے جانا پڑتا ہے دیار غیر میں ایسا ہی شمس کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ عظیم اس کے لیے جعلی کاغذات تیار کراتا ہے اور تنظیم کے لوگ اس کو مل کر جہاز میں بٹھا دیتے ہیں اور وہ ملک سے بھاگ جاتا ہے۔ شمس جواب نواز میمن ہے گویا اس شہر نے اُس سے صرف ماں، باپ، بہن، بھائی، دوست اور محبت ہی نہیں چھینی اس سے اُس کا آخر حوالہ اس کا نام تک چھین لیا ہے۔ اب وہ کسی اور نام سے لکھا اور پکارا جائے گا۔ کس قدر دکھ کا مقام ہے اس لڑکے کے لیے یہ صرف شمس کی نہیں کراچی کے ہر محلے، ہر کوچے کی کہانی ہے یہ شناخت چھن جانے کی کہانی ہے اس ناول کو نوجوانوں کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ناول نہیں کراچی کے نوجوانوں کا المیہ ہے۔ ان کے خوابوں کے چھن جانے کا المیہ ان کی شناخت چھن جانے کا المیہ۔

کراچی والے اور کراچی کے مختلف طبقات

کراچی انسانوں کا ایک وسیع سمندر ہے۔ کم و بیش دو کروڑ آبادی کا شہر اپنے اندر بڑی وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے۔ اس کے باسی پاکستان کے کونے کونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں امیر بھی ہیں، درمیانے، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں اور غریب کم آمدنی والے لوگ بھی اسی شہر میں آباد ہیں۔ اس شہر نے لوگوں کو چھت اور روزگار فراہم کیا ہے۔

کراچی والے متوسط طبقے اور درمیانے طبقے کی روداد سناتا ہے جو لوگ چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں اور شہر کی زندگی میں اپنا مقام بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ لوگ شہر میں کیسے زندہ ہیں ان سب کا احوال موجود ہے ان کے چھوٹے چھوٹے مکان اور بڑے بڑے خواب ہیں۔ یہ لوگ ایک بڑے، وسیع منظرنامے کا حصہ ہیں۔ ان کی زندگی کیسے گزرتی ہے کراچی ان کو کیسے پال پوس رہا ہے یہ سب کراچی والے میں نظر آتا ہے۔

ناول میں عظیم کا کردار ہے جو شمس کا بڑا بھائی ہے۔ ابا کے بیمار ہونے پر ہارڈ ویئر کی دکان سنبھال لیتا ہے۔ تجارت کی اونچ نیچ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جلد ہی اپنے کنبے کا واحد کفیل بن جاتا ہے۔ چھوٹے سے گھر کو خوشیاں دینے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ شمس کی ذمہ داری جو بہت بڑی تھی نبھانے کے لیے تن، من، دھن سے کوشش کرتا ہے اور اس کی زندگی بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے جب شمس عظیم سے جدا ہوتا ہے تو خاصا جذباتی منظر ہے۔

> "تھوڑی دیر میں شمس نے ایک کرتا شلوار پہن لیا۔ عظیم نے اسے دیکھا تو بے ساختہ آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عظیم بھائی مجھ سے جو بھی غلطیاں ہوئی ہیں آپ اماں اور ابا مجھے معاف کر دینا۔" [۴۰]

احمد خالو ہیں جو موٹر کلینک میں اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ نواب شاہ میں رہتے تھے مگر سندھی مہاجر جھگڑے کی وجہ سے کراچی آئے اور محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ بیٹی کے لیے ایک اچھا رشتہ مل جائے تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی آرزو ان کے دل میں ہے۔ شمس کے بارے میں جانتے ہیں لیکن اس کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اُسے رشتہ دینے پر راضی نہیں ہیں۔ یہ بھی کراچی کے وہ محنت کش ہاتھ ہیں جو کراچی کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

مولانا سبحانی ہیں مذہبی آدمی ہیں جہاد کرتے ہیں۔ وہ طبقہ جو مذہب کی ایک خاص تعبیر مانتا ہے اور تمام لوگوں کو اس تعبیر کے مطابق چلانا چاہتا ہے کراچی میں مذہبی شدت پسندی کی جو لہریں عرصہ دراز سے لہریں لے رہی تھیں اب قدرے نمایاں انداز میں سامنے آرہی ہے جس کے اثرات کراچی میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

پنجاب سے آئے دو بھائی ہیں بابر اور اصغر محنت مزدوری سے ابتدا کرنے والے بابر ملک نے آہستہ آہستہ ترقی کی راج مستری بنا اور چھوٹے موٹے ٹھیکے لینے شروع کیے کام چلنے کے بعد اپنے چھوٹی بھائی کو بلا لیا۔ اب دونوں مل کر تعمیراتی کام کرتے ہیں اور روپے پیسے اپنے گاؤں بھیجتے ہیں۔ محبت کرنے والے یہ بھائی مشکل وقت میں عظیم اور شمس کے کام آتے ہیں۔

کراچی محنت کشوں، مزدوروں سے بھرا ہوا ہے پنجاب، خیبر پختونخواہ اور ملک کے دیگر حصوں سے آئے لوگ مختلف کاموں میں جُٹے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ مختلف کاموں میں مشغول ہوئے ہیں یہ لوگ کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے نہ انھیں سیاست کا شوق ہے بس اپنی مزدوری کرتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بڑا حصہ

پٹھانوں کے پاس ہے۔اس کراچی کی گلیوں، چوراہوں، سڑکوں پر چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ میں ان لوگوں نے زندگیاں گزار دی ہیں۔

منظر انصاری ہیں جو شہر کے بچوں کو انصاف دلانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کی کہانی بھی تفصیل سے بیان کی ہوئی ہے ان کی زندگی کا مقصد مساوات اور عدل و انصاف کی حکمرانی ہے سیاسی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی سے منسلک ہیں اور بھٹو کے پرستار سندھی گھرانے میں شادی کی اور سندھ کے کلچر سے بخوبی واقف ہیں۔

پروفیسر الفت رضا ہیں استاد ہیں نوجوانوں کو معاشرے کا کارآمد شہری بنانے کے لیے اپنی پوری توانائی صرف کر رہے ہیں۔ اختلاف رائے کو برداشت کرنا اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینے کے عادی ہیں، لیکن بدقسمتی سے لوگ ان کو یا تو خاموش دیکھنا چاہتے ہیں یا اپنے جیسا۔

برگد کے درخت کے سامنے جہاں سارے دوست مل کر بیٹھا کرتے ہیں، صابر ہیں جو چھوٹا موٹا کھوکھا چلاتے ہیں، پان بناتے ہیں کھلاتے ہیں، معاشرے کے نچلے طبقے سے ان کا تعلق ہے۔

غرض کراچی والے کراچی کی زندگی بڑی بھرپور اور سچی تصور ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ہائوسنگ سوسائٹی

قرۃ العین حیدر کے دو ناولوں آگ کا دریا اور ستیا ہرن پر اس سے پیشتر بات کی گئی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں ناسٹلجیا کا پہلو غالب ہے لیکن تقسیم کے تناظر میں ان کے ناول خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ تقسیم ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ ترک وطن اور نئے ملک میں زندگی شروع کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ مہاجرین کے ریلے یکے بعد دیگرے ہندوستان سے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ پاکستان کے مختلف شہر مہاجرین کی آمد سے ایک نیا منظر نامہ پیش کرنے لگے تھے خاص طور پر سندھ کے مختلف شہر اور بالخصوص کراچی۔

اس نئے منظر نامے میں نئے مسائل تھے نئی الجھنیں تھیں اور ساتھ ہی ساتھ نئی کہانیاں۔ ہر مہاجر اپنے جلو میں اپنی پوری دنیا اٹھا لایا تھا اور اس دنیا کو یہاں بسانے پر مصر تھا۔

مہاجرین کی یوں جوق در جوق آمد سے کراچی کا بالکل نیا منظر نامہ تخلیق ہوا کیونکہ اکثر اندرون سندھ بسنے والے مہاجرین نے بھی آخر کار کراچی کا قصد کیا۔ یوں کراچی ان مہاجرین کی آخری جائے پناہ کہلایا۔

متحدہ ہندوستان جاگیردارانہ نظام پر اساس رکھتا تھا اور تقسیم کے بعد دونوں اطراف میں ایک بے رحم سرمایہ دارانہ طبقہ جنم لے رہا تھا۔ اس طبقے نے آگے چل کر پورے معاشرے کو اپنی سنگ دلانہ گرفت میں لینا تھا ۔اس بے رحم طبقے کے نزدیک اپنا مفاد، مقصد اور روپے کا حصول سب سے بڑی اور ابدی سچائی تھی ۔

یہ طبقہ نیکی، اخلاق، سچائی، پیار، محبت سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا بلکہ موقع پرستی اور ہوس کو جائز سمجھتا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کے ابتدائی نقوش دیکھ لیے تھے اور ان کو اپنے ناول ہائوسنگ سوسائٹی میں بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔

اس مفاد پرست طبقے کے نزدیک ہر چیز خریدی جاسکتی حتیٰ کہ نظریہ اور آرٹ بھی ، اس ناول میں طبقاتی کشمکش بھی نظر آتی ہے۔

نو دولتیے طبقے کی دولت کی ہوس اور دولت کی پوجا کرنا اور اعلیٰ انسانی اخلاق کی پامالی بھی جابجا نظر آتی ہے ۔ ناول کا مرکزی کردار جمشید علی سید جو خط سلمی مرزا کے نام لکھتا ہے گویا وہ شہر کراچی کا مینی فیسٹو ہے اور بعد کے کراچی نے اسی دستور العمل کو راہ نما بنایا۔ کراچی کے باسیوں کی موجودہ تکالیف اور پریشانیوں میں بڑا ہاتھ اس دستور کا بھی ہے جو اعلیٰ اقدار کی نفی اور مادیت پرستی کی تلقین کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر ہائوسنگ سوسائٹی میں اعلیٰ طبقے کی پوری تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں ہے کہ یہ طبقہ کراچی کی اکثر معاشرتی ناکامیوں کا ذمہ دار ہے۔

مہاجرین کی مشکلات ، ایسی بلندی ایسی پستی

قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول ستیاہرن پاکستان سے ہندوستان جانے والے خاندانوں کی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ جس محبت اور شیفتگی سے سندھ، کراچی کا تذکرہ کرتے ہیں اس کی بڑی سچی تصویر دکھائی ہے ۔ہائوسنگ سوسائٹی میں ہندوستان سے پاکستان پہنچنے والے مہاجرین کی مشکلات کا تذکرہ ہے۔

اس تذکرے میں یہ بات ذہن میں رہے کہ تقسیم کے حادثے میں صرف ملک دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا بلکہ اعلیٰ اقدار کی بھی موت ہوگئی ۔ سچائی، نیکی، بھلائی گویا زمین سے اٹھا دی گئی تھیں ان کی جگہ لالچ، ہوس، مفاد پرستی نے لے لی تھی۔

اب جن لوگوں نے پرانی اقدار کو سینے سے لگایا ہوا تھا ان کے لیے یہ مہاجرت عذاب سے کم نہ تھی ۔ایسے بھی تھے جنھوں نے اس مہاجرت سے اپنا الو سیدھا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار ملک کے بڑے

بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگے۔ کہانی کا لوکیل کراچی ہے اور کراچی کے نو دولتیے پھلتے پھولتے دکھائی دیتے ہیں۔

کہانی کو صرف وقتی پیمانے سے نہ دیکھیں بلکہ اگر اس کی ہمہ گیریت کو نگاہ میں رکھیں تو پورے پاکستانی معاشرے کے تار و پود جس طرح بکھرے اور اس کی جگہ نیا عمرانی معاہدہ وجود میں آیا اس معاہدے میں اولیت موقع پرستی اور خود غرضی کی ہے اس بنیاد نے پاکستان کس قدر کمزور اور لاچار کر دیا ہے یہ معاشرے کو بغور دیکھنے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مہاجرین سندھ کے مختلف شہروں میں آنے شروع ہوئے ان کی آمد سے ایک ہلچل مچی اور اس ہلچل کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا۔ قرۃ العین حیدر نے پچاس کی دہائی میں اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ اب جاگیردارانہ نظام کا اختتام ہے اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام لے گا۔ مہاجرین کے رویّے بھی اس بات کے غماز نظر آتے ہیں کون سمجھ سکتا تھا کہ یہ لٹے پٹے مہاجرین جو بظاہر بے بس اور لاچار نظر آتے ہیں ان میں سے کچھ دیکھتے دیکھتے اس نظام کی بنیاد ہی بدل کر رکھ دیں گے۔

ناول کا آغاز تو موضع محمد گنج ضلع سلطانپور سے ہوتا ہے لیکن اختتام جمشید علی سید کی شاندار کوٹھی کراچی میں ہوتا ہے اس ساری کہانی میں انسانی رویوں میں تبدیلی اور ابن الوقتی کی جیت بیان ہے۔

ہندوستان سے ہر طرح کے لوگ پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے ان میں ہر طبقہ شامل تھا امیر بھی اور غریب بھی۔ بعض لوگ اپنی وضع داری میں مارے گئے انھوں نے پاکستان آ کر صبر شکر کر کے روکھی سوکھی پر گزارہ کرنا شروع کر دیا لیکن بعض موقع پرستوں نے جو ہندوستان میں کسی خاص مالی حیثیت کے مالک نہ تھے۔ یہاں پر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے ذرا گریز نہ کیا۔

مہاجرین نے پاکستان آتے ہی سندھ کے مختلف شہروں کا بھی قصد کیا کہانی کے کردار بھی اندرون سندھ کے شہر لاڑکانہ جا پہنچے۔ ان کرداروں میں جناب قمر الدین مرزا، بیگم مرزا، مس سلمٰی مرزا بھی شامل ہیں جو سلمان کے امی ابو اور بہن ہیں۔ سلمان بائیں بازو کا ایک متحرک کارکن ہے اور تنظیمی کاموں میں بہت شہرت رکھتا ہے۔ اس لیے روپوش بھی رہتا ہے۔

یہ خاندان مسوری کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے ہے اور مسوری میں اپنی کوٹھی جلائے جانے پر پاکستان کا قصد کرتے ہیں۔ سلمان اپنی دوست ثریا کو اُن کے پاکستان جانے کے احوال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ماما کا خط چند روز ہوئے آیا تھا، سلمان نے چائے میں شکر گھولتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ جس دن اُن کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی اس کے اگلے روز انھوں نے لکھا تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں۔ اب تک سینکڑوں نوجوان لڑکیوں کو اغوا کیا جا چکا ہے۔"[۴۱]

ان پریشانیوں کے سبب سلمان کا خاندان ہجرت کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ وہ وضع دار لوگ ہے جو اپنی وضع داری نبھاتے ہیں اس عمل میں ان کو دکھ اور مصائب اور مالی تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معاشرے کی شکست وریخت اس قدر تیزی سے ہو رہی ہے کہ ان کے سامنے جلد یا بدیر ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی عزت نفس ،خوداری کو رہن رکھ دیں یا پھر حرف غلط کی طرح مٹائے جانے کے لیے تیار ہو جائیں یہ بڑی تکلیف دہ صورتحال ہے۔ان حالات میں بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔

یہ لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے نکلے اور سندھ کے شہر لاڑکانہ جا پہنچے وہ حالات کچھ ایسے ہیں۔

پروونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے ہیں۔قصرِ سلمان متروکہ جائیداد قرار دے دیا گیا۔ الہٰ آباد بینک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس منجمد کر لیے ہیں تاوقتیکہ دونوں ملکوں میں موواسیبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا تمہاری ماما کی زمینیں جاگیرداری کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ بابا نے بڑے اطمینان سے بتایا انھوں نے اضافہ کیا۔ بولے نہ عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا۔[۴۲]

یہ لٹے پٹے لوگ لاڑکانہ سے کراچی جانے کے خواہش مند ہیں تا کہ بابا کا علاج ہو سکے انھوں نے عیش کا زمانہ دیکھ رکھا ہے اب تکالیف کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں لیکن یہ راضی برضا ہیں جو میرے اللہ کی مرضی، سلمان ان کے لیے پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان ڈھونڈتا ہے انھیں کراچی بلا لیتا ہے۔

جن کے ہاں پالکی نالکی سب مہیا تھا ان کو کن حالات میں کراچی شہر میں زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

پیر الٰہی بخش کالونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا، کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں اور کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتے چپکا دیئے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر مہاجر آباد تھے

جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھے ان کی زندگیاں خاصی بے آرام تھیں مگر ایک عجیب وغریب ولولہ اور قومی جوش سب میں طاری تھا۔[۴۳]

یہ خاندان کراچی میں جیسے تیسے اپنی زندگی شروع کرتا ہے۔ مہاجرین کسی ایک خاص علاقے سے نہیں آئے تھے بلکہ یہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے یہاں پہنچے تھے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ہائوسنگ سوسائٹی چونکہ خاص پس منظر رکھتا ہے اس لیے اس کو اسی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مہاجرین کی آمد سے کراچی اور سندھ کی لسانی، سماجی، مذہبی زندگی پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ مہاجرین چونکہ صرف ایک علاقے سے نہیں تھے اس لیے ان کے مختلف رنگوں سے مل کر ایک رنگ وجود میں آیا یہ ہم رنگ منظر کراچی میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مہاجرین کن کن علاقوں سے پاکستان آئے تھے ایک اقتباس میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

> یہ جانے کون لوگ ہوں گے؟ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے؟ پورب اور بہار کے باشندے، جن کے چہروں پر امٹ اداسی تھی۔ گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے رام پور اور بریلی کے بانکے، مراد آباد کے برتن فروش، علی گڑھ کے قفل ساز، فیروز آباد کے چوڑی والے، فرخ آباد کے رنگ ریز، لکھنو کے زردوز اور شاعر، دلی کے کرخندار، اعظم گڑھ اور بنارس کے جولا ہے۔ مرزا پور کے قالین باف ان کی برقع پوش عورتیں اور بچے۔[۴۴]

یہ وہ ہمہ گیر رنگ ہے جو آگے چل کر ایک مخلوط معاشرے کی تخلیق کرتا ہے۔ اسی معاشرے میں رنگا رنگ کہانیاں بن گئیں۔ لوگوں کی زندگیاں آسان تو کبھی نہیں ہوتیں لیکن مہاجرین کے لیے یہ دہرا عذاب تھا۔ ماضی کی آسائشیں اور حال کی مصیبتیں انھیں بہت بے حال رکھتیں، لیکن زندگی نے تو آگے بڑھنا ہے چاہے کچھ بھی ہو۔

سلمان اور اس کے کنبے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا زندگی بلندی سے پستی کی طرف یوں لڑھکی کے رکنے میں نہیں آرہی۔ سلمیٰ مرزا (چھوٹی بٹیا) اپنے کنبے کو معاشی طور پر مستحکم رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے لیکن زندگی اُس کی پہنچ سے دور سے دور تر ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک سلمان اور اس کے کنبے کا تذکرہ ہے جو ہندوستان کے متمول لوگ تھے کھاتے پیتے اور خوشحال اور کراچی پہنچ کر انھیں زندگی کی مشکلات کا سامنا تھا لیکن یہ لوگ خودداری اور عزت نفس اعلیٰ انسان اقدار کو تج دینے پر تیار نہیں تھے۔

اب جمشید علی سید کا تذکرہ جو مہاجر ہوکر کراچی پہنچا۔ جمشید علی سید موضع محمد گنج ضلع سلطانپور (اودھ) کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس کے تایا دیہات میں رہتے ہیں اور اس کے والد اختر علی نے اپنے کھیت بیچ کر کانپور میں ایک مکان خریدا ہے جس میں یہ لوگ تقسیم سے قبل رہتے تھے۔ اس مکان کا ایک نظارہ۔

> بیٹھک کے دروازے پر حق پڑی تھی اندر اینٹوں کے فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لیے تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ بی۔اے ایل ایل بی کا گاؤن پہنے کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سرسید احمد خان اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھیں۔ کئی برس قبل سید اختر علی نے اپنے حصے کے کھیت بیچ کر کانپور میں یہ مکان خریدا تھا۔ جمشید میلا سا سوتی پردہ اٹھا کر زنان خانے میں گیا اندر نیلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے میں اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی چارپائیاں تھیں۔ کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس کی اماں سل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھیں۔ بھیا! گاؤں سے روپیا لائے؟ عالیہ کی آواز پر وہ چونکا روپے؟ ابا نے کہا تھا کہ چچا ابا سے روپیا لے کر بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے۔ یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔[۴۵]

اس اقتباس سے اس گھرانے کی مالی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ کہانی جمشید علی سید کے گرد گھومتی ہے تو اس کی خوشحالی کا تذکرہ ضروری تھا۔ جمشید اپنی چچازاد بہن منظور النساء سے شادی کرتا ہے۔ کان پور آنے کے بعد جب اس کے ہاں پہلی بیٹی فرحت النساء کی ولادت ہوتی ہے تو اسے طلاق دے کر کراچی آجاتا ہے۔

جمشید علی سید جیسے کتنے ہی موقع پرست لوگ شاید اس موقع کی تلاش میں تھے کہ کہیں ان کو موقع ملے اور وہ اپنی ہوس پوری کریں۔

جمشید جب کراچی پہنچا تو اس نے ترقی کی نئی راہیں دریافت کیں۔ ہندو پاکستان چھوڑ کر ہندوستان جارہے تھے ان کی چھوڑی ہوئی املاک اور مواقع پاکستان میں موجود تھے۔ جمشید ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانا جانتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

کراچی پہنچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کیا اور میکلوڈ روڈ پر ایک متروکہ دفتر حاصل کرلیا۔ وہ ہندو تاجروں کے انخلاء کا زمانہ تھا۔ اس لیے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی رہی۔ جنوری ۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دو منزلہ کوٹھی عامل کالونی نمبر۲ میں خالی ہوئی تو اس نے اپنے نام الاٹ کرالی۔ اس نے بڑی محبت اور توجہ سے اپنا کاروبار پھیلایا اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ [۴۶]

غرض بلندی سے پستی اور پستی سے بلندی کا سفر بڑی تیزی سے شروع ہو چکا۔ اصول، ضابطے، قاعدے، قانون تھوڑی دیر کے لیے اٹھا لیے گئے تھے انسان صرف اور صرف آگے بڑھنا چاہ رہا تھا معاشرے کے تار و پود کو تباہ کرتے ہوئے۔

کراچی اور بائیں بازو کی سیاست، سلمان کا قتل

کارل مارکس کے فلسفے پر برپا ہوا روسی انقلاب لینن کی جیت پر منتج اس جیت کا اردگرد کے ممالک پر بہت اثر ہوا۔ متحدہ ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک اور اس کے زیر اثر کیمونسٹ نظریات کا پرچار نوجوانوں کو متاثر کرتا رہا۔ تقسیم کے بعد بھی یہ نظریات نوجوانوں کے لیے پرکشش رہے۔ ان نظریات کو دونوں اطراف کی حکومتوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ سلمان بھی کیمونسٹ نظریات کا حامل تھا اور تقسیم کے بعد پاکستان پہنچا۔ پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست زیر عتاب رہی اور ملک کے مشہور و معرف شاعر فیض احمد فیض کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جنھیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

قرۃ العین حیدر کے ناول کا کردار سلمان بھی بائیں بازو کے نظریات کا حامی ہے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے اور انھی سرگرمیوں کی وجہ سے زیر عتاب رہتا ہے۔ جیل میں اس کی بہن اس کی مدد کرتی ہے اس کے لیے کتابیں اور رسالے فراہم کرتی ہے لیکن یہ نوجوان جیل کی اذیتیں برداشت نہیں کر پاتا اور مر جاتا ہے۔

سلمان اور ثریا حسین دونوں کا مرید ہوتے ہیں ایک دوسرے سے بے حد محبت بھی کرتے ہیں لیکن قربانی دینے کی باری آتی ہے تو ثریا زمانے کی سختیوں سے ہار جاتی ہے جب کہ سلمان اپنے اصول اپنے آدرش بچاتے بچاتے زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔

زندگی کے مقاصد قربانی مانگتے ہیں کراچی کی اس نئی زندگی میں جہاں زمینی حقائق صرف اور صرف پیسہ ہیں انسان کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ خود کو باز رکھ سکے ایسا ہی کچھ ثریا کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے نظریات سے منحرف ہونا شروع ہوجاتی ہے اور اس رنگ میں رنگتی جاتی ہے۔

سلمان اس کے برعکس آدرش مقدم رکھتا ہے اور دنیاوی آسائشوں کو ٹھوکر مار دیتا ہے اور سماج اس کو اپنے دھارے سے باہر نکال دیتا ہے۔

یہاں پر حسن ناصر کا تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا جو اپنی جان پر کھیل گیا۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد بہت سے نوجوان کیمونسٹ ہندوستان سے پاکستان آئے۔ حسن ناصر ۱۹۴۸ء کے شروع میں پاکستان آیا۔ حسن ناصر اور سلمان کی کہانی میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں دونوں کنوارے تھے دونوں نے حالات سے سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور دونوں کا انجام دردناک موت تھا۔

استحصالی طبقے نے اعلیٰ اخلاق کو ہی نہیں اعلیٰ اخلاق کے حامل انسانوں کو بھی برداشت نہیں کیا۔

یہاں مختصراً حسن ناصر کے متعلق سوبھوگیان چندانی کے مضمون " کراچی کی یاداشتیں" سے کچھ اقتباس نقل کیے جاتے ہیں۔

> ۱۹۵۱ء میں راول پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں جو گرفتاریاں ہوئیں ان میں حسن ناصر بھی تھا۔ جو شاید اکتوبر کے آخر میں کراچی جیل میں پہنچا۔ حسن ناصر سے معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد دکن کے ریٹائرڈ ہوم سیکریٹری کا بیٹا ہے اور نظام حیدر آباد کے خلاف تلنگانہ میں جو تحریک چل رہی ہے اس سے اس کا بالواسطہ تعلق رکھا۔ جب ہندوستانی فوجیں حیدر آباد دکن داخل ہوئیں حسن ناصر بمبئی سے ہوتا ہوا کراچی پہنچ چکا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں اسے روپوشی کے دوران گرفتار کیا گیا اور لاہور کے شاہی قلعے میں اذیتیں دے کر مار دیا گیا۔ اسے جو بات جاننے کے لیے مارا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے ساتھی کون ہیں اور ان کی مالی امداد کون کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ حسن ناصر کو اس لیے مارا گیا کہ اس نے اپنے مددگاروں کے نام بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ انقلابی اخلاق یہی بتاتے ہیں کہ مرتے مرجاؤ لیکن اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں کے نام ہرگز نہ بتاؤ۔[۴۷]

سلمان اور حسن ناصر کی موت اصل میں ان لوگوں کی موت تھی جو مساوات، برابری اور اعلیٰ اخلاق پر یقین رکھتے تھے جب کہ موجودہ معاشرہ جس ڈگر پر چل پڑا تھا اور کراچی میں جو نیا طبقہ اُبھر کے آیا تھا وہ نو دولت مند طبقہ تھا جس کے نزدیک پرانی اقدار صرف اور صرف پرانے لوگوں کی فرسودہ رسمیں تھیں جن پر عمل کرنا صرف وقت کا ضیاع ہے۔

کراچی اعلیٰ اقدار کی موت اور نئے سرمایہ دار طبقے کا ظہور

قرۃ العین حیدر کا ناول ہائوسنگ سوسائٹی پچاس کی دہائی میں سامنے آچکا تھا۔قرۃ العین حیدر بھی کراچی قیام پذیر رہیں۔ انھوں نے اس معاشرے کو بنتے دیکھا اور اس بات تک پہنچیں کے استحصالی طاقتیں نئے شہر میں اپنے پنجے گاڑنے میں مصروف ہیں اور کراچی ان کی جولاں گاہ ہے۔ ہر چیز قابل خرید ہے چاہے انسان ہوں یا ان کے آدرش خیالات،نظریات اس طبقے کا نمائندہ کردار جمشید ہے جو دولت کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ جمشید کا کردار ان تمام قوتوں کے لیے ہے جو اقتدار، حکمرانی، مالی بالادستی کی نمائندہ ہیں جو انسانوں کا خون چوسنے کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔

جمشید کی اٹھان دراصل اس معاشرے کی اٹھان ہے جس نے آگے چل کر کراچی کے ضابطہ اخلاق بنائے۔اگر کراچی میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ کو سمجھنا ہے تو ہائوسنگ سوسائٹی اس کا بہترین طریقہ ہوسکتا ہے۔

کراچی کا یہ طبقہ اپنی بقا کے تمام گُر جانتا ہے اور تقسیم کے بعد سے اس نے اپنے آپ کو پھیلانے کا عمل جاری رکھا ہے۔ یہ طبقہ اپنے خونین پنجے چاروں طرف پھیلا رہا ہے۔ جمشید اپنے بھائیوں کو سول سروس میں بھیجنا چاہتا ہے، سیاستدانوں سے تعلقات بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ قاعدے اور ضابطے بنائے جائیں جو صرف اور صرف اس طبقے کے مفاد کا تحفظ کریں۔

گویا یہ شیطانی کھیل پوری شدت سے کھیلا جائے گا پاکستان کے اس بڑے شہر کو دیکھیں تو ہمیں ہر جگہ سرمایہ دار طبقے کی جیت نظر آتی ہے اور شہر میں حالیہ تعمیراتی سلسلے اور نئی ہاؤسنگ کالونیز اسی عمل کا تسلسل ہیں۔ ناول کے اختتام میں جمشید علی سید اپنی سیکریٹری (چھوٹی بٹیا) سلمیٰ مرزا کو ایک خط لکھتا ہے یہ خط گویا اس عہد کے کراچی کا مینی فیسٹو ہے۔ایسا دستور العمل جو کراچی کے گلی کوچوں میں رائج ہے۔

منڈی کی اندھی قوتیں ہر چیز خریدنے کے لیے پاگل ہورہی ہیں۔قرۃ العین حیدر نے سب سے پہلے

اس بات کو محسوس کیا اور آئندہ کا تفصیلی خاکہ سامنے رکھ دیا۔

ہائی سوسائٹی کے تناظر میں ان سارے عوامل کا جائزہ لیا جائے گا تا کہ ناول کے مختلف شیڈز سامنے آتے جائیں۔

جمشید کراچی پہنچنے کے بعد اپنے کاروبار کو وسعت دیتا ہے اس وسعت کے لیے اُسے ہر حربہ استعمال کرنا آتا ہے اپنی شخصیت اور کاروبار کو وسعت دینے کے لیے وہ میڈیا کا بھی استعمال کرتا ہے۔ صحافیوں کو خریدتا ہے اور اپنے امیج کو بہتر بنانے کے لیے آرٹ، نظریات تک خریدنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

جمشید کراچی پہنچنے کے بعد ہی اپنی ترجیحات طے کر چکا تھا۔ کراچی میں اُس نے اپنا کاروبار جمایا اور اس کے بعد اُس نے اپنے گھر والوں کو کان پور سے کراچی بلایا اپنے بھائیوں کے لیے اس نے منصوبہ بنا رکھا تھا۔

> جمشید نے نوعمری میں آئی۔سی۔ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے وہ اس کو اب تک نہ بھولے تھے۔ وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر جانتا تھا کہ بڑے افسر کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اس نے طے کرلیا کہ چھوٹے بھائیوں کو سی۔ایس۔پی کے امتحانات دلوائے گا۔ بزنس مین کا ایک بھائی اعلیٰ عہدیدار بھی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔[۴۸]

ان منصوبوں کے ساتھ ہی اس نے اپنی بیٹی فرحت النساء کو کراچی بلا لیا۔ اس کی تعلیم و تربیت اور نئے رنگ ڈھنگ میں اس کو رنگنے کے لیے ایک اینگلو انڈین گورنس اور اعلیٰ پرائیویٹ سکول میں داخلہ دلوایا۔

جمشید علی سید ایک دین دار نیک گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کے چچا، والد مشرقی روایات کے امین اور قابل احترام بزرگ تھے۔ انھوں نے کبھی اس زندگی کو پسند نہ کیا تھا لیکن جمشید نے تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

بیٹی کے بعد اس کے بھائی اور کچھ عرصے بعد والد بھی کراچی پہنچ چکے تھے۔ کراچی آنے کے بعد اس کے والد پر بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی اور سب سے بڑھ کر اپنے بیٹے کا رنگ ڈھنگ کچھ اس طرح غالب آیا کہ وہ اس سے بڑھ کر اس دجل و فریب میں شامل ہو گئے انھوں نے بھی اپنی دین داری، خدا ترسی سے جان چھڑا کر حرص و ہوس کی غلامی کا جوا گلے میں پہن لیا۔ جمشید کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا یوں کہ ضمیر نامی کوئی الجھن اس نے پالی ہی نہیں تھی۔ ایک دن اپنے والد کی گفتگو سننے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ نے کتنے کا کلیم داخل کیا ہے وکیل صاحب؟

صرف تین لاکھ کا۔

سید اختر علی کی آواز آئی۔

آپ کی زرعی جائیداد بھی تو ہوگی۔

جی ہاں! مگر میرے بھائی صاحب ابھی بھارت ہی میں ہیں۔

سید اختر علی نے جواب دیا۔

جمشید یہ سب سن رہا تھا۔

جمشید نے گلاس ختم کیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

دفعتاً ایک بھیانک انکشاف اس کے ذہن کے دھندلکے میں کوندا۔ اپنے خدا پرست، فقیر منش، توکل پسند باپ کو، اس شخص کو جو ایک زمانے میں سید مظہر علی اور سائیں کا کا اور مولوی محمد حسن کے محدود و معصوم دائرے کا ایک فرد تھا۔ اس بھولے، بوڑھے کو جھوٹا، بددیانت، ریا کار اور جعل ساز اس نے خود بنایا تھا۔ Oh What a dog I am what a dog what a dog.

اُس نے زور سے تکیے پر مکا مارا اور کمبل میں منہ چھپا کر سو گیا۔ [۴۹]

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جمشید کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا اور یہ کانپور میں پہلے ٹیوشن پڑھاتا رہا اور پھر ایک محکمے میں کلرک بھرتی ہوا تھا۔ گویا ان کے ہاں دولت کی ریل پیل تقسیم اور کراچی آمد پہ شروع ہوئی تھی۔ اس نو دولتیے طبقے نے سب سے پہلے جس چیز کو بیخ کنی کی وہ سچ اور انصاف تھا۔ ان لوگوں نے جھوٹے کلیم بھرے، غلط بیانی، دھوکا دہی۔ ریا کاری کو کبھی برائی نہیں سمجھا۔

اس طبقے کی نفسیات میں ہر شے خریدی جاسکتی ہے کو اولیت حاصل ہے۔ جمشید اسی سوچ کے تحت ایک کے بعد دوسری کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اسی اثناء میں ایک بھولی بھالی لڑکی جو سلمان کی بہن ہے جس کو سلمان اور اپنے بابا کے لیے محنت مزدوری کرنی پڑ رہی ہے۔ جب اس کے دفتر میں سیکریٹری کے لیے درخواست دیتی ہے تو یہ اس کو بھی اپنے مفاد کے سامنے کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ اُس کو ایک خریدی جانے والی چیز کی طرح خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور خرید بھی لیتا ہے۔ یہ اُس کی مجبوری خوب جانتا ہے اور مجبوریوں کی قیمت اس کے

سوا کون جان سکتا ہے۔

وہ مجبور و بے کس لڑکی سلمٰی مرزا ہے جو ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ تقسیم کے بعد اُسے اپنے انقلابی بھائی سلمان اور والد، والدہ کے لیے سکول کی ملازمت کرنی پڑی ، چھوٹے سے کنبے کے اخراجات برداشت کرنے میں اس کو بڑی دقت پیش آرہی تھی ۔ یہ لڑکی زندگی کی گاڑی کھینچتے کھینچتے تھک سی گئی تھی اور ساڑھے سات سو ماہوار تنخواہ کو رد نہ کر سکی۔

شاطر جمشید نے پانسا ایسا پھینکا کہ مجبور ولاچار سلمٰی مرزا کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔اب جب اپنی مکروہ باتوں کو جمشید نے یاد کیا تو کسی ندامت کے بجائے وہ یہی سوچنے لگا۔

> میں اس لونڈیا کو Groom کروں گا بہترین Contact Woman ثابت ہوگی ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہوکر سارے کاروباری راز اگل دے گا۔لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہوجائیں گے اس نے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور سگریٹ جلایا۔What a lucky Dog I am What a lucky Dog. اس نے دل میں کہا۔ ۵۰

ہوس و لالچ کی ابتدا تو ہے لیکن اس کا اختتام کہاں پر ہے یہ بتانا بے حد مشکل ہے۔ جمشید نے جب ایک دفعہ اس لالچ کی پر ہوس وادی میں قدم رکھا تو پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ کراچی کی زندگی نے اس کو یوں اپنے شکنجے میں کسا کہ اب واپسی کو کوئی راستہ نہ تھا۔ جمشید اب ثریا کی تصاویر خرید رہا ہے۔

وہی ثریا جو سلمان کی دوست تھی اور بائیں بازو کے نظریات سے متاثر لیکن ثریا کو بھی زندگی کی مشکلات نے آہستہ آہستہ یہ سبق سکھا دیا ہے کہ روپے پیسے کی ضرورت انسان کی ہر بہر کیف رہتی ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ سمجھوتا کر لیتی ہے۔ یہ سمجھوتے اصولوں اور آدرشوں پر ہو رہے ہیں اس لیے ان کے نتائج بھی بے حد گھمبیر ہیں۔

معاشرہ کے قائم رہنے کی وجہ اس کی عمارات اور سنگ و خشت نہیں ہوتے بلکہ معاشرے ہم دردی، بھائی چارے، خلوص، سچائی اور نیک دلی پر قائم ہوتے ہیں۔اس کے برعکس کراچی کا نیا سرمایہ دار طبقہ اپنی بقا کا انحصار چیزوں کو قابل خرید اشیا میں بدل کر بنا رہا ہے۔ انسان، آئیڈیا، نظریات آرٹ اس لیے ثریا کی تصاویر اس کے فریسکو سب کے سب جمشید کے سامنے ڈھیر ہوتے نظر آتے ہیں۔

آج کل میڈیا کا تذکرہ ہے اور لوگوں کو ہیرو سے زیرو بنانے میں اس کا کردار مسلم ہے۔ آج سے ستر برس قبل قرۃ العین حیدر کے ناول کا کردار صحافی منصور احمد خان اسی میڈیا مینجمنٹ کا ابتدائی کارندہ ہے جو اخبارات میں لوگوں کی مرضی کے مضامین چھاپتا ہے۔ جمشید بھی اس سے کام لینا بخوبی جانتا ہے۔ گویا میڈیا کے ذریعے امیج بلڈنگ تقسیم کے بعد ہی کراچی میں شروع ہو چکی تھی۔

اور قرۃ العین حیدر اس کے ابتدائی نقوش سے آگاہ کر چکی ہیں۔ کراچی کے کینوس پر بعد میں جتنے رنگ رنگے گئے ان کے واضح اشارے ہائوسنگ سوسائٹی میں موجود ہیں۔

ان سب باتوں کا ڈراپ سین جمشید علی سید کی نئی تعمیر کردہ کوٹھی میں ہوتا ہے اس کوٹھی کی سج دھج نرالی ہے۔ اس کے برقی قمقمے آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں، شہر کے بڑے بڑے لوگ، سیٹھ، ساہوکار، اخبار نویس، آرٹسٹ، فنکار، صحافی اعلیٰ سرکاری عہدے دار، کابینہ کے وزیر، سفیر، فرسٹ سیکریٹری، پریس اتاشی، کمرشل اتاشی، حسین وجمیل ملبوسات میں ملبوس بیگمات غرض کاروبار زندگی کو قابو میں رکھنے والے تمام افراد کی ایک کہکشاں ہے جو جمشید نے اکٹھی کی ہے تاکہ اپنی امارت اور دریا دلی سے سب کے دلوں کو مسخر کر سکے سب کو اپنا احسان مند کر سکے۔

اس پارٹی میں ثریا حسین اور جمشید کی سیکریٹری مس سلمیٰ مرزا بھی شامل ہیں، ناؤ نوش کی محفل جاری ہے۔ اس پارٹی میں ہی وہ "Moment of Truth" آتا ہے جب جمشید کو ایک دھچکا لگتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال کر دوبارہ اپنی جون میں پلٹ جاتا ہے۔ وہ شخصیت جس کو اس نے بڑی محنت سے پروان چڑھایا ہوتا ہے اب اس شخصیت سے شاید وہ خود بھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

جمشید کو جب علم ہوتا ہے کہ سلمیٰ مرزا کون ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے اور ثریا کے تعارف پر بھی وہ چونک جاتا ہے۔ یہ دونوں اس کے مہربانوں کی اولادیں ہیں چاہنے خیال رکھنے والوں کی۔

یہ اس کے ان دنوں کی نشانیاں ہیں جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ جب زندگی میں صداقت، امانت، دیانت کی اہمیت تھی، جب اس کے والد چچا زندگی کی معنویت سے آشنا تھے۔ جب لوگ غریب تو تھے ذلیل نہ تھے جمشید اپنے اوپر آجانے والی اس اچانک افتاد سے برافروختہ تو ہوتا ہے لیکن جلد ہی وہ پرانا جمشید بن جاتا ہے۔ محفل برخاست ہونے پر وہ خود تو یورپ کے دورے پر نکل جاتا ہے لیکن مس مرزا کے نام ایک خط چھوڑ جاتا ہے جس میں اُسے نوکری سے الگ کر دیتا ہے کیوں کہ سلمان کی بہن ہونے کی وجہ سے اس کا کاروبار متاثر

ہوسکتا ہے۔

یہ خط کیا ہے سرمایہ دار طبقے کا دستور العمل ہے۔ یہ خط ہی کراچی کی زندگی کی اصل سامنے بیان کرتا ہے ،کراچی کیسے تباہ ہوا یہ خط اس کی ساری داستان دہراتا ہے۔

یہ خط اس قابل ہے کہ سارا کا سارا نقل کیا جائے۔ کراچی اور کراچی والوں کی نفسیات ،سرمایہ داری کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس خط کی قرأت بہت ضروری ہے۔ اس خط کے کچھ اقتباس نقل کیے جاتے ہیں تا کہ کراچی کے اس طبقے کی نفسیات کو سمجھا جا سکے۔

> چھوٹی بٹیا۔۔۔ پرسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری سے نکالے، اُن کو جھاڑا پونچھا اور انھیں الماری میں دوبارہ مقفل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا۔ اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبا دیا۔ اور آج میں وہی جمشید سید ہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے سے واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں انتہائی ذلیل، بے رحم، خودغرض، کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں اور ایک ایسا شخص ہوں جس کے لیے کسی قسم کی پرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصورات لایعنی ہو چکے ہیں لیکن پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مرزا صاحب کی صاحب زادی ہیں تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس اطلاع سے دوسرا ذہنی جھٹکا جو مجھے لگا اس کا تعلق سراسر میری کاروباری حس، میرے کمینے پن اور کامن سنس سے ہے۔ وہ جھٹکا یہ تھا کہ آپ نہ صرف مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں بلکہ اپنے بھائی کی بہن بھی ہیں۔ چھوٹی بٹیا آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں اور میری زندگی کا سب سے بڑا مطمع نظر میرا ذاتی مفاد ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میرا کاروبار خصوصیت سے کس غیر ملکی قوم سے ہے جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ میری کانفیڈینشل سیکریٹری کس شخص کی سگی بہن ہے تو آپ خود اندازہ کر لیجیے کہ اس کا اثر میرے کاروبار کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا بڑی ذلیل جگہ ہے میں بھی دنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے دنیا سے ایک حد تک سمجھوتا کر لیا۔ جس طرح ثریا نے میرے ذریعے سے سمجھوتا کر کے سورج کے نیچے اپنی جگہ بنا لی۔

آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے۔ جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید وفروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنکار، دانشوراور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود اکثر ان کی خرید وفروخت کرتا ہوں۔ میں یہ سب باتیں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید الوژن خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں ورنہ آپ کو مرتے دم تک صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ زندگی سے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیں اور زندگی کے مکروفریب اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔[۵۱]

اس اقتباس کے چشمے سے پاکستان کے بڑے شہروں کا کراچی سمیت مشاہدہ کیا جائے تو نہ حیرانی ہوتی ہے نہ اداسی طاری ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے حقیقت منکشف ہوگئی ہو۔ کراچی پر قبضے کی جنگ اور ہونے والی قتل وخون ریزی کا راز کھلنے لگتا ہے۔ یہ خط وہ بے لکھا دستور ہے جس پر چل کر لوگوں نے رفعتیں پائیں۔ کراچی کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ قیامِ پاکستان سے اس کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ رہی جنھوں نے اسے ایک عارضی قیام گاہ کے طور پر استعمال کیا اور پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ خودغرضی کی بیماری نے اس شہر کو بہت نقصان پہنچایا۔ شہر کی محبت سے لوگوں کے دل خالی تھے طمع، لالچ، حرص وہوا کے سوداگر اس شہر کے مالک بن بیٹھے جس سے شہر کو اور شہر کے عام شہریوں کو بے حد دکھ اٹھانے پڑے۔

قرۃ العین حیدر نے ابتدائی ایام میں ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کے اس ملک اور خاص طور پر کراچی کے باسی کس سمت چل پڑے ہیں ان کی نگاہِ دور بیں ان فتنوں کو وقت سے پہلے بپا ہوتا دیکھ رہی تھی جس سے شہرِ کراچی کے ہنے والے کو نبرد آزما ہونا تھا۔ سرمایہ داری نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیے تھے اور پیسہ اور صرف پیسہ عزت، شرف، بزرگی کا معیار مقرر ہو چکا تھا۔ اس اقتباس کی روشنی میں جب آج کے کراچی کو دیکھا جاتا ہے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کراچی اور آج کا دو کروڑ آبادی کا کراچی رقبے اور آبادی کے اعتبار سے تو مختلف ہوسکتا ہے لیکن جس دستور العمل کا بیان قرۃ العین حیدر نے ہائوسنگ سوسائٹی میں کیا ہے اُس میں سرِ مُو فرق نہیں آیا کل بھی مادیت پرستی نے معاشرے کو اپنی میں لپیٹ میں لے کھا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ کراچی کے بڑے جرائم پیشہ گروہ ہوں یا چھوٹے کارندے سب کے سب

اپنی اصلی شکل میں ہمارے سامنے اس ناول میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اسی وجہ سے کراچی کی سب سے درست اور موثر منظر کشی قرۃ العین حیدر کے ہاں نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اجمل کمال، "تعارف"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول،، مرتبہ، اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۲

۲۔ فہمیدہ ریاض، کراچی، تخلیقات پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء ص ۲۵

۳۔ ایضاً ص ۳۷

۴۔ ایضاً ص ۳۶

۵۔ ایضاً ص ۳۵، ۳۶

۶۔ ایضاً ص ۳۸، ۳۹

۷۔ ایضاً ص ۵۷، ۵۸، ۵۹

۸۔ ایضاً ص ۴۰

۹۔ ایضاً ص ۴۱

۱۰۔ ایضاً ص ۵۲

۱۱۔ ایضاً ص ۷۸

۱۲۔ ایضاً ص ۷۷

۱۳۔ ایضاً ص ۴۳

۱۴۔ ایضاً ص ۱۲

۱۵۔ ایضاً ص ۳۰

۱۶۔ ایضاً ص ۱۰۲

۱۷۔ ایضاً ص ۱۰۰، ۱۰۱

۱۸۔ اے کے بروہی، "جمشید نسروان جی"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم اجمل

کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۳۰۰، ۳۰۱

۱۹۔ کیول رام رتن ملکانی، "سندھ کی کہانی"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم اجمل کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۱۰۶

۲۰۔ ایضاً ص ۱۰۶، ۱۰۷

۲۱۔ قرۃ العین حیدر، سیتا ہرن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۱۰

۲۲۔ ایضاً ص ۳۱

۲۳۔ قرۃ العین حیدر، سیتا ہرن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۳۲

۲۴۔ ایضاً ص ۳۳

۲۵۔ ایضاً ص ۴۴

۲۶۔ اختر بلوچ، کرانچی والا، آج کی کتابیں، کراچی، ۲۰۱۶ء ص ۱۲۶

۲۷۔ قرۃ العین حیدر، سیتا ہرن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۵۲

۲۸۔ ایضاً ص ۵۵

۲۹۔ ایضاً ص ۵۲

۳۰۔ محمد امین الدین، کراچی والے، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء ص ۱۳۵، ۱۳۶

۳۱۔ ایضاً ص ۱۰۵

۳۲۔ ایضاً ص ۶۸

۳۳۔ ایضاً ص ۳۴

۳۴۔ ایضاً ص ۳۲

۳۵۔ زینت حسام، "گزرے دن گزرتے دن"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد دوم، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۶۲۹

۳۶۔ محمد امین الدین، کراچی والے ،شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء ص ۱۶۲، ۱۶۶

۳۷۔ ایضاً ص ۳۲

۳۸۔ ایضاً ص ۱۲۲، ۱۲۳

۳۹۔ ایضاً ص ۱۲۵، ۱۲۶

۴۰۔ ایضاً ص ۱۷۷

۴۱۔ قرۃ العین حیدر، قرۃ العین حیدر کے بے مثال ناولٹ ،مرتبہ امجد طفیل ،الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۴۷

۴۲۔ قرۃ العین حیدر، قرۃ العین حیدر کے بے مثال ناولٹ ،مرتبہ امجد طفیل ،الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۵۲

۴۳۔ ایضاً ص ۵۵

۴۴۔ ایضاً ص ۵۴، ۵۵

۴۵۔ ایضاً ص ۳۳، ۳۴

۴۶۔ ایضاً ص ۵۶

۴۷۔ سوبھوگیان چندانی، "کراچی کی یاداشتیں"، مشمولہ: کراچی کی کہانی جلد اول، مترجم اجمل کمال، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء ص ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹

۴۸۔ قرۃ العین حیدر، قرۃ العین حیدر کے بے مثال ناولٹ ،مرتبہ امجد طفیل ،الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۵۷

۴۹۔ ایضاً ص ۸۱، ۸۲

۵۰۔ ایضاً ص

(۵۱) ایضاً، ص ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰

ماحصل

حاصلات، نتائج اور سفارشات

کراچی ملک پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر اپنی ایک مکمل تاریخ رکھتا ہے ۔تقسیم سے قبل ہی یہ شہر انگریزوں کی انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے برصغیر کے نقشے پر اپنا آپ منوا چکا تھا۔ بندرگاہ ہونے کے ناطے یہ شہر تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اس شہر کے میئر اور انتظامی سربراہ بھی خوش قسمتی سے اس شہر کی محبت میں شہر کو سجانے سنوارنے میں لگے رہے۔ ان میں جمشید مہتا نسروان جی کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے جو "بابائے کراچی" کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔اس شہر کی صفائی، ستھرائی اور خوب صورت موسم کی تعریف کی جاتی تھی ۔کراچی میں فرائض کی بجا آوری کے لیے تمام سرکاری اہلکار ہر وقت خوش دلی سے تیار رہتے تھے۔

اس شہر کی خوبصورتی کو بڑھانے میں تمام قومیتوں نے اپنا حصہ ڈالا۔ پارسیوں اور ہندوؤں کے قائم کردہ، سکول، کالج، ہسپتال اس شہری دور کی یاد دلاتے ہیں جب سارے لوگ مذہب کی تفریق کے بغیر زندگی گزارتے تھے۔ یہ شہر امن و آشتی کا گہوارہ تھا۔

شہر میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ سندھ کے وڈیرے اور جاگیردار صرف گرمی کے موسم میں کراچی کا رخ کرتے تھے۔ جب اندرون سندھ گرمی ناقابل برداشت ہوجاتی تو ان کے قافلے شہر میں وارد ہوتے اور گرمی کا موسم ختم ہوتے ہی اپنے گوٹھ گاؤں واپس چلے جاتے۔

تقسیم سے قبل بدقسمتی سے شہر کی ہمہ جہت ترقی میں مسلمانوں کا کردار خاصا محدود نظر آتا ہے۔ حسن علی آفندی کے سندھ مدرسۃ الاسلام کے علاوہ شہر پر مسلمانوں کی چھاپ قدرے کمزور ہے۔

تقسیم کے بعد ہندو بہت تیزی سے کراچی کو چھوڑ کر جانے لگے اور مسلمانوں کے ریلے پورے ہندوستان سے پاکستان اور پھر کراچی پہنچنے لگے۔ اس عمل سے شہر کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی ہوئی ۔سب سے بڑی اور جوہری تبدیلی آبادی کا بڑھ جانا تھا اور یہ عمل ہنوز زور شور سے جاری ہے۔

کراچی کی آبادی ۴ لاکھ سے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۱ لاکھ ہوگئی ۔آبادی کے اس بے ہنگم اضافے سے کراچی میں جھگیوں کا ایک جنگل آباد ہوگیا۔ جس میں پورے ہندوستان سے آنے والے مہاجرین رہنے لگے۔ یہ مہاجرین دہلی، لکھنو، مراد آباد، الہٰ آباد، حیدرآباد دکن اور ہندوستان کے دیگر شہروں سے یہاں پہنچے تھے۔ یہ

بات دھیان میں رہے کہ ان مہاجرین میں سے اکثر کی ہجرت ارادی تھی نہ کہ اضطراری، یہ لوگ ایک نئی دنیا کا خواب آنکھوں میں بسائے اپنی خوابوں کی سرزمین میں پہنچے تھے۔

یہ سب لوگ مذہبی اور ملی جوش وخروش سے نئے ملک کی بنیادوں کو مضبوط کرنے آئے تھے۔ سندھ جہاں کبھی مڈل کلاس کا وجود نہ تھا ان شہری مہاجرین کے آنے سے کراچی میں مڈل کلاس کا ظہور ہوا۔ مہاجرین کی آمد کراچی کے لیے ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ کراچی کو سمجھنے کی جو بھی کوشش کی جائے گی اس کی ابتدا مہاجرین کی آمد سے ہوگی۔

کراچی پہنچنے کے بعد ان مہاجرین نے اپنے روزگار کے ذرائع تلاش کیے، پڑھے لکھے ہنرمند افراد نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی معاشی حالت بہتر کرلی اور جھگیوں سے چھوٹے مکانوں اور فلیٹوں میں منتقل ہوگئے۔ کراچی کی موجودہ صورت گری میں کراچی کے ان مہاجرین کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شہر کراچی کو تقسیم کے بعد جس پہلے بڑے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا وہ مہاجرین کی آمد تھی۔ کراچی نے اپنی معاشی خود کفالت کی وجہ سے مہاجرین کو اپنا مکان اور روزگار فراہم کیا۔

ملک پاکستان کے ناہموار سیاسی حالات کراچی کو بے طرح متاثر کرتے رہے ہیں۔ کراچی کو ۱۹۴۸ء میں ملک کا دارالحکومت بنایا گیا پھر ون یونٹ کا قیام اور آخر کار دارالخلافے کی اسلام آباد منتقلی سے کراچی کی معاشی رفتار پر بُرا اثر پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی افق کی بے یقینی سے بھی کراچی کی سیاسی، سماجی صورتحال متاثر ہوئی۔ پے درپے وزرائے اعظم کی تبدیلی اور غلام محمد کی مفلوج سوچ نے پورے ملک کو بالخصوص اور کراچی کو بالعموم یرغمال بنائے رکھا۔

۱۹۵۸ء میں صدر ایوب کی آمد سے ہی کراچی کے ساتھ معاندانہ سلوک کا سلسلہ شروع ہوا اور صدر ایوب کے دورِ اقتدار میں بلاتعطل جاری رہا۔ ۱۹۶۵ء میں ایوب خان اور فاطمہ جناح کے درمیان انتخابات نے تو گویا کراچی کے لیے جہنم کا دروازہ کھول دیا۔ صدر ایوب کو کراچی سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات ان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ ان کی فتح کا جشن کراچی میں منایا گیا۔ اس جشن کی قیادت ان کے بیٹے گوہر ایوب خان نے کی۔ اس جشن میں مہاجرین کو سبق سکھانے کے لیے ان کی آبادیوں پر حملے کیے گئے اور کئی مہاجرین اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

کراچی کی سماجی اور سیاسی زندگی میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ مہاجرین کو یوں دیوار سے لگایا گیا کہ

ان کے لیے پلٹ کر حملہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مہاجرین اگر سندھ کی مہربان وادی میں خود کو ضم نہ کر سکے تو اس کی بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کا اور حکومتوں کا بالخصوص ان کے ساتھ مخاصمانہ رویہ بھی ہے۔

سندھی لوگوں نے شروع میں مذہبی تعبیر کے مطابق مہاجرین کو خوش آمدید کہا ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سندھی لوگوں کو اپنے گھر میں اقلیت میں بدل جانے کے خوف نے گھیر لیا اور یوں سندھی مہاجر تنازعہ شروع ہوا۔ لسانی جھگڑے کی ابتدا سے ہی دونوں قومیتیں ایک دوسرے کی طرف سے عدم تحفظ کا شکار رہی ہیں۔ اس جھگڑے سے کراچی کی فضا مزید خراب ہوئی اور مہاجرین اپنے خول میں بند ہونے لگے۔ اسی عدم تحفظ نے آگے چل کر جب سیاسی شکل اختیار کی تو مہاجر جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔

ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی پر ایک اور فوجی آمر یحییٰ خان کی آمد ہوئی۔ اس دوران ۱۹۷۱ء کا دل دہلا دینے والا واقعہ ہوا جب ہمارا مشرقی بازو ہم سے جُدا ہو گیا۔ اس سانحے پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

یحییٰ خان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سامنے آئے اس دور میں کوٹہ سسٹم اور سندھی زبان کا لازمی قرار دیا جانا دو ایسے واقعات ہیں جن سے سندھی مہاجر تنازعات کو خوب ہوا ملی۔

صدر ضیاء کی مذہبی رجعت پسندی سے کراچی یونیورسٹی کی فضا بھی جو بائیں بازو کی سوچ سے متاثر تھی کو خاصا نقصان پہنچا۔ کراچی یونیورسٹی کی کھلی ڈھلی مکالمے کی فضا صدر ضیاء کی تنگ نظری سے ایک اُجاڑ کنویں کا منظر پیش کرنے لگی۔ ضیاء کا مذہب کو اپنی حکومت بچانے کے لیے استعمال کراچی کے لیے زہر قاتل ثابت ہوا۔ اس تنگ نظری نے کراچی سے آرٹ کلچر، سینما، کھیل تماشے، تفریح سب کچھ چھین لیا۔ کراچی کی فضا جو بڑی صاف اور معطر تھی ضیاء کی آمد سے سخت گھٹ کر رہ گئی اور مذہب کی سخت تعبیر نے ریڈیو، ٹی وی سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدر ضیاء نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی اور سندھی لوگوں کو شدید صدمہ پہنچایا۔ ان کی ترجیحات نے پورے ملک کو بالعموم اور کراچی کو بالخصوص ایک پنجرے میں قید کر لیا۔ ایسا پنجرہ جس سے نکلنے کے لیے کراچی آج بھی پھڑ پھڑا رہا ہے۔

کراچی کو سب سے زیادہ نقصان صدر ضیاء کے دور میں پہنچا۔ افغان جہاد، اسلحہ اور افغان مہاجرین کی بلا روک ٹوک آمد ایسے واقعات ہیں جنھوں نے کراچی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اسی دور میں مہاجرین کی سیاسی بیداری کی لہر اور اپنے حقوق کی جنگ مہاجر قومی موومنٹ کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ ایم کیو ایم نے

مہاجر سے متحدہ کا سفر طے تو کیا لیکن سرِ دست مہاجر قومیت ہی اُن کی پہچان ہے اور وہ بھی اسی طور پہچانے جانے پر مصر ہیں۔

مہاجر قومی موومنٹ کی آمد سے کراچی کی سیاسی فضا پر مہاجر کا راج رہا ہے اور یہ راج پچھلی تین دہائیوں سے برقرار ہے۔صوبائی اور قومی اسمبلی کے حلقوں کے علاوہ بلدیاتی انتخابات میں بھی متحدہ کامیابیاں سمیٹتی رہی ہے ۔یہ کامیابیاں مہاجر قومیت کو وقتی ریلیف تو دیتی رہیں لیکن دائمی کامیابی تا حال مہاجروں کے حصے میں نہیں آئی ۔کراچی کے لیے مہاجر قومی موومنٹ کا سامنے آنا اچھا شگون نہیں رہا۔کراچی میں تمام فوجی اور نیم فوجی آپریشن متحدہ کی آمد کے بعد ہی برپا ہوئے۔

کراچی کی فضا میں دہشت او بربریت کے بادل متحدہ کی آمد کے بعد ہی چھائے۔۱۹۸۰ء سے لیکر تا حال بلا مبالغہ ہزاروں شہری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔متحدہ کے خلاف فوجی آپریشن جو مختلف ادوار میں ہوئے ان میں ہزاروں مہاجر نوجوان مارے گئے۔اس عرصے میں کراچی ایک مقبوضہ شہر کا منظر پیش کرتا رہا ۔گرفتاریاں، کرفیو، قتل وخون ریزی، بوری بند لاشیں، اغواء برائے تاوان گویا تباہی کے تمام عناصر یکجا ہو گئے تھے۔اس دوران پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے دو مختصر دورِ اقتدار بھی گزر گئے لیکن کراچی کی حالت نہ سنبھلی۔

۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۸ء تک متحدہ کراچی کے سیاہ وسفید کی مالک رہی۔متحدہ نے اس دور میں اپنی قوم کی بہتری کے بجائے صرف اور صرف سیاسی فائدے کو مدِ نظر رکھا۔ذاتی اغراض ومقاصد کو اجتماعی فائدے پر فوقیت دی، اس قدر طاقت ور ہونے کے باوجود متحدہ نے مہاجرین کی علمی ترقی کے لیے مناسب اقدامات نہ اُٹھائے۔مہاجرین کی تعلیم متحدہ کے منشور میں کبھی سرِ فہرست نہیں رہی۔

۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۳ء تک متحدہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ شریک اقتدار رہی۔یہ کراچی کے لیے بدترین دور تھا اس دور میں ہزاروں شہری اپنی جانوں سے گئے۔متحدہ اور پیپلز پارٹی کے روٹھنے اور منانے کا سلسلہ بھی اس دوران جاری رہا۔۲۰۱۳ء کے بعد کراچی کے حالات قدرے بہتر ہونا شروع ہوئے۔متحدہ کے لیڈر الطاف حسین کی پاکستان مخالف تقاریر کے بعد متحدہ زیرِ عتاب ہے۔۲۰۱۸ء کے الیکشن متحدہ کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔کراچی کے سیاسی حالات کراچی کے باسیوں کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں۔

کراچی پر لکھے گئے ناولوں کی تاریخ اتنی قدیم نہیں۔تقسیم کے بعد کراچی کے شہریوں کی زندگیوں کو

نامور ادیبوں نے اپنے اپنے فن پاروں میں بیان کیا ہے۔ اس تحقیق میں ۱۳ ناولوں سے کراچی کے رہنے والوں کی زندگیوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔

یہ ناول درج ذیل ہیں۔

خدا کی بستی	شوکت صدیقی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
چاکی واڑہ میں وصال	محمد خالد اختر
ہائوسنگ سوسائٹی	قرۃ العین حیدر
ستیا ہرن	قرۃ العین حیدر
آب گم	مشتاق احمد یوسفی
ایک صدی کی کہانی	رضیہ فصیح احمد
آگے سمندر ہے	انتظار حسین
خواب رَو	جوگندر پال
نہ جنوں رہا نہ پری رہی	زاہدہ حنا
مٹھی بھر ہوا	کوکب جمیل
کراچی	فہمیدہ ریاض
کراچی والے	محمد امین

ان میں سے بیشتر ناول کراچی اور اس کا لوکیل اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ کچھ ناول ایسے ہیں جن میں کراچی کا ذکر تو ضمناً ہے لیکن وہ تذکرہ اتنا بھرپور جامع اور مکمل ہے کہ گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ جیسے قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا اور مشتاق احمد یوسفی کی آب گم ان تذکروں سے صرف نظر کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا لہذا ان کو بھی شامل کیا گیا یا یوں کہیے ان ناولوں نے اپنے آپ کو شامل کرایا۔

سرِ فہرست ناولوں میں شوکت صدیقی کا ناول خدا کی بستی ہے جو کراچی کے لوکیل پر ایک بڑا منفرد اور خوبصورت ناول ہے۔ کراچی کے سماج میں جرائم پیشہ گروہوں نے جو غارت گری کی ہے اُس نے کراچی میں بسنے والوں کی زندگیوں کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اغواء برائے تاوان، لوٹ مار، ڈکیتیاں، قتل و غارت گری

ان سب کا ابتدائی احوال شوکت صدیقی کے ہاں ملتا ہے۔ کمسن بچے کراچی پہنچنے پر جب جرائم پیشہ گروہوں کے ہاتھ لگتے ہیں تو ان کی زندگی کس قدر مشکل ہو جاتی ہے اور یہی بچے جب جوان ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھوں باقی لوگوں کی زندگیاں جہنم بن جاتی ہیں۔

اس سارے عمل کی سچی عکاسی خدا کی بستی میں نظر آتی ہے۔ جرائم پیشہ گروہوں کا اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے علاقوں میں واردات نہ کرنا گویا وہی نوگوایریاز ہیں جو مہاجر، پٹھان اور بلوچ علاقوں میں آج نظر آتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے پچاس کی دہائی میں آنے والے منظر نامے کے بڑے واضح نقوش پیش کیے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے تین ناول آگ کا دریا، سیتا ہرن اور ہائوسنگ سوسائٹی اس تحقیق میں شامل رہے۔ آگ کا دریا ایک بڑے پھیلے ہوئے پلاٹ کا ناول ہے جس میں کراچی کا تذکرہ ضمناً موجود ہے۔ کراچی کی صورتحال کو پچاس کی دہائی میں جس مصنفہ نے سب سے درست سمجھا وہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے کراچی کے حالات کو دیکھنے کے بعد جو پیشگوئی کی تھی وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئی چاہے آگ کا دریا ہو یا ہائوسنگ سوسائٹی۔

آج کل کے معاشرتی رویے میں جو مادیت پسندی، خودغرضی، لوٹ کھسوٹ اور پرایا مال اپنا کا جو رجحان ہے قرۃ العین حیدر اس کو بہت پہلے بھانپ چکی تھی اور جمشید سید جیسے کرداروں کے ذریعے اسے سامنے بھی لا چکی تھیں۔ کراچی کا موجودہ کارپوریٹ کلچر اور اس سے فائدہ اٹھانے والے لالچی کردار قرۃ العین حیدر کی نگاہ دوربیں بہت پہلے دیکھ چکی تھی۔

ہائوسنگ سوسائٹی میں چھوٹی بٹیا کے نام لکھا گیا جمشید سید کا خط سرمایہ دار طبقے کا دستورالعمل ہے جس کے تحت آج کراچی صرف اور صرف روپیہ کمانے کا مقام ہے۔ خلوص، محبت، ایثار، لوگوں اور شہر سے محبت کا اُٹھ جانا اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ کراچی کی درست تفہیم اور لوٹ کھسوٹ کے اس سلسلے کو سمجھنے کے لیے یہ ناول بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔

محمد خالد اختر کا ناول چاکی واڑہ میں وصال ایک بے حد مختلف ناول ہے۔ کراچی کے علاقے لیاری میں تخلیق کیا گیا یہ رومان ایک ایسی داستان ہے جو خوبصورت بھی ہے اور دلنشین بھی۔ اس کے کردار اور واقعات سب کے سب انوکھے اور اچھوتے ہیں۔ شیخ قربان علی کٹار گجرانوالوی، اقبال حسین چنگیزی، پروفیسر شاہ

سوار، رضیہ اور عمر قصاب ایسے کردار ہیں جو چاکی واڑہ میں وصال کو بے حد مختلف بناتے ہیں۔ کراچی کے یہ کردار اردگرد سے بے پروا زندگی گزارتے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ کردار زندگی کی معنویت اور اس کے مطالب سے آگاہ ہیں۔ ناول میں کہیں بھی چاکی واڑہ کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ اس کی بدصورتی کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ یہ حد درجہ جاذب نظر ہوگئی ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے آبِ گم میں مہاجرین کی ابتدائی مشکلات کے حسین اور جاندار مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان بہادر لوگوں نے کیسے زندگی کے وہ دن گزارے جب زندگی ان کا سخت امتحان لے رہی تھی۔ کرامت حسین کی جھگی جو منظر پیش کرتی ہے اُس کو رقم کرنے کے لیے یوسفی صاحب جیسا ہی صاحبِ قلم کار درکار تھا۔ کرامت حسین کے مسائل دراصل سارے مہاجرین کی ابتدائی مشکلات کا بیان ہے۔ مملکتِ پاکستان کو سنوارنے سجانے کا عزم لیے یہ لوگ جب پاکستان پہنچے تو انھوں نے کس قدر اذیت برداشت کی اس کا احوال آبِ گم میں جستہ جستہ نظر آتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کا ناول ایک صدی کی کہانی ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگیوں سے متعلق ہے۔ تقسیم کے بعد کراچی اور پاکستان بھی ناول کے بیانیے میں شامل ہوجاتا ہے۔ کراچی جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت اور پیارا ہوا کرتا تھا اُس کراچی کی تصویر رضیہ فصیح احمد کے ناول میں نظر آتی ہے۔ پاکستان اور کراچی نے مہاجرین کو جو نام اور مقام دیا اُس کا بیان اس ناول میں جابجا بکھرا ہوا ہے۔ ناول میں چونکہ مقامات سے زیادہ کہانی پر توجہ ہے اس لیے شہر کے اِکاد کا مناظر دکھانے کے بعد کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔

انتظار حسین کا ناول آگے سمندر ہے مہاجرین کی زندگیوں کو بیان کرتا ہے۔ مہاجرین جب پاکستان پہنچے تو ان کی جمی جمائی، بسی بسائی زندگی میں ایک بہت بڑی ہلچل پیدا ہوئی۔ ان کے لیے زندگی کو نئے سرے سے مرتب کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس سارے عمل میں مہاجرین نے اپنے آپ کو جس طرح کراچی میں ٹرانسپلانٹ کیا ہے اس کا حال انتظار حسین نے اپنے ناول آگے سمندر ہے میں بیان کیا۔ مہاجرین کی سیاسی بیداری کے بعد جب شہر میں خوف و ہراس کی فضا پھیلی، کرفیو لگنا اور شہر کا بند ہونا معمول بنا تو زندگی دشوار ہوتی چلی گئی۔ اس خوف و ہراس کی فضا میں شہریوں نے جس عزم و حوصلے کا مظاہرہ کیا وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ مہاجرین کے ہاں رفتہ رفتہ ماضی سے گریز کا جو رویہ نظر آتا ہے اس کا بیان بھی اس ناول میں جابجا ملتا ہے۔

جوگندر پال کا ناول خواب رَو ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی بے قراری اور ناسٹلجیا کا بیان ہے۔ مہاجرین اپنے لکھنو کی گلیوں سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں ہیں گویا نیند میں چلتے جا رہے ہیں۔ آج بھی جب ہندوستان سے آنے والے لوگوں کو "مہاجر، مہاجر" کی گردان الاپتے نظر آتے ہیں تو جوگندر پال کے ناول کی معنویت کھلتی ہے کیونکہ انھوں نے تقسیم کے مرحلے پر مہاجرین کا ایک لمحے پر ساکت ہوجانا بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔

زاہدہ حنا کا ناول نہ جنوں رہا نہ پری رہی کراچی میں آنے والے مہاجرین کی مفاد پرستی کی داستان سناتا ہے۔ برجیس داور علی کو اپنوں نے جو زخم لگائے ان رستے زخموں کی کہانی نہ جنوں رہا نہ پری رہی میں بیان کی گئی ہے۔ مفاد پرستی کی اس دھوپ میں شجر سایہ دار کا کردار ایک پارسی خاندان ادا کرتا ہے۔ پارسی لوگ جو اپنے خلوص، پیار اور محبت کے لیے مشہور ہیں اس ناول میں ان لوگوں کی تہذیب و ثقافت کے بیان نے اس کہانی کو دوسرے بہت سارے ناولوں سے منفرد اور ممتاز کر دیا ہے۔ تقسیم سے پہلے کراچی کے منظر نامے پر عیسائی، ہندو، پارسی اور مسلم سب کے اپنے اپنے کردار ہیں لیکن پارسی کمیونٹی نے کراچی کو بے حد نوازا ہے۔ اس کمیونٹی نے کراچی کو سنوارنے میں اپنا بے مثل کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تہذیب و ثقافت کو اس ناول میں خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے۔

کوکب جمیل کا ناول مٹھی بھر ہوا شہر کراچی کے سیاسی اور مذہبی حالات کو بیان کرتا ہے۔ کراچی کی سیاست پر ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء کا کردار انتہائی اہم رہا ہے۔ ان ادوار میں کراچی جو ہری تبدیلیوں سے آشنا ہوا۔ معاشی طور پر استحکام حاصل ہوا تو سیاسی عدم استحکام نے آن گھیرا۔ علی میاں کی زبانی یہ کہانی کراچی کے مذہبی حالات بھی بیان کرتی ہے۔ مذہبی طبقہ کیسے مسجد، مدرسے کی حدود سے نکل کر سیاست کی طرف بڑھتا ہے اور اپنا حصہ لینے کو بے قرار ہے اس کی خوبصورت روداد اس ناول میں بیان کی گئی ہے۔

فہمیدہ ریاض کا ناول کراچی دراصل ایک ڈاکومینٹری ہے جو کراچی کے بارے میں بے باکی اور جرأت کے ساتھ تحریر کی گئی ہے۔ کراچی کے رستے زخموں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے یہ ایک چشم کشا تحریر ہے۔ فہمیدہ ریاض نے کراچی میں جاری قتل و غارت گری کو تقسیم کے بعد سے لے کر اب تک دیکھنے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مہاجرین کے ساتھ کی گئی ناانصافیاں اور ان کے بدلے میں مہاجرین کی سیاسی جماعت کا بننا جس کا مقصد "منزل نہیں راہنما ہے" جو اپنے حقوق کے لیے ہر حد پار کرنے کو تیار ہے۔ غرض یہ ایک بے حد اہم اور پُر مغز تحریر ہے اس کو شامل کیے بغیر کراچی کی تفہیم نامکمل رہتی۔

محمد امین الدین کا ناول کراچی والے دراصل کراچی کے معصوم نوجوانوں کا المیہ ہے جن کو سیاسی جماعتیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ شمس جیسے نجانے کتنے نوجوان اس المیہ سے دوچار ہوئے۔ نوجوانوں کی علم و ہنر سے دوری، تہذیب و اخلاق سے دوری ہی آخر کار ان کو اپنے خاندان سے بھی دور کر دیتی ہے۔ ان نوجوانوں کی زندگیوں پر یہ ایک بہترین تحریر ہے۔ محمد امین الدین کراچی کے رہنے والے ہیں، انھوں نے کراچی کو بہت قریب سے دیکھ کر یہ ناول تحریر کیا ہے جس میں شمس جیسے نوجوانوں کی ناکامیوں کو دراصل حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کی ناکامی گردانا ہے۔

اس سفر کے دوران ان ناولوں کی بار بار قرأت کے بعد ان ناولوں سے کراچی کی معاشرت، سیاست، سماجیات، تہذیب و تمدن، کلچر و ثقافت کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ یہ تمام ناول کراچی کو ایک قاری کے سامنے نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے کردار کراچی کے جیتے جاگتے لوگ ہیں جن کے غم اور خوشیاں قلم کاروں نے اپنے قارئین کے سامنے رکھی ہیں۔ قرۃ العین حیدر وہ مصنفہ ہیں جنھوں نے کراچی کی محرومیوں کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا ان کے ناول آگ کا دریا اور ہائوسنگ سوسائٹی اس اخلاقی کجی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں جو آگے چل کر کراچی کے بڑے المیے کا سبب بنا۔

وہ سرمایہ دارانہ نظام جس نے کراچی کی جڑوں کو کھوکھلا کیا اور کراچی سے علم، محبت، ایثار، قربانی اور خلوص جیسے جذبوں کو دیس نکالا دیا، کراچی کی موجودہ صورتحال کا ذمہ دار ہے۔ کراچی پر قبضے کی جنگ بھی دراصل اس جنگ کی ایک شاخ ہے۔ کراچی کی معیشت سے اپنا حصہ بٹورنے کے لیے سب کے سب سیاسی اور غیر سیاسی لوگ ایک گدھ کی طرح کراچی پر حملہ آور ہیں۔ ان کی اولین نشاندہی قرۃ العین حیدر نے ہائوسنگ سوسائٹی میں کر دی تھی۔

سفارشات

(۱) علم سے دوری نوجوان نسل کو گمراہ اور مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے لیے آسان شکار بناتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مناسب انتظامات کیے جائیں تاکہ ان کو معاشرے کا کارآمد شہری بنایا جاسکے۔

(۲) اپنے شہر سے محبت ہر شہری کا بنیادی فرض ہے۔کراچی کی بہتری کے لیے کراچی کے شہریوں کو اپنے شہر سے محبت کا رشتہ نبھانا ہوگا۔شہر کی صفائی، ستھرائی اور اس کو ہر لحاظ سے جاذبِ نظر بنانے کے لیے شہریوں کو اپنا فرض پوری ذمہ داری سے ادا کرنے کی عادت اپنانی ہوگی۔

(۳) کراچی کی سیاسی جماعتوں کو اپنے منشور اور بنیادی ایجنڈے میں کراچی کو اولیت اور فوقیت دینا ہوگی۔کراچی کے لیے وفاقی حکومت سے خصوصی فنڈز منظور کرائے جائیں اور ان کو کراچی کے لوگوں کی فلاح وبہبود کے لیے پوری ایمانداری اور خلوص نیت سے خرچ کیا جائے تاکہ کراچی کے شہریوں کا معیارِ زندگی بہتر بنایا جاسکے۔

کتابیات

☆ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ، اُردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۵۱ء

☆ احمد حسین صدیقی، گوہر بحیرہ عرب کراچی، محمد حسین اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء

☆ اختر بلوچ، کرانچی والا، آج کی کتابیں، کراچی، ۲۰۱۶ء

☆ اسرار احمد، ڈاکٹر، استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۹۲ء

☆ اسلم عزیز درانی، ناول اور ناول نگار، ملتان کاروان ادب، ۱۹۹۰ء

☆ اقبال سعید خان، ڈاکٹر، میر اکراچی، راحیل پبلی کیشنز، اُردو بازار کراچی، ۲۰۱۵ء

☆ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

☆ انور پاشا، ڈاکٹر، ہندو پاک میں اُردو ناول، تقابلی مطالعہ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۲ء

☆ انور جمال پاشا، ترقی پسند اُردو ناول، پیشرو پبلی کیشنز، نئی دلی، ۱۹۹۰

☆ انور جمال پاشا، ہندو پاک میں اُردو ناول، پیشرو پبلی کیشنز، نئی دلی، ۱۹۹۲ء

☆ اے بی ایس جعفری، شہر آرزو کراچی کی داستان غم، مترجم برہان الدین حسن، رائل بک کمپنی لاریٹ پیکجز، کراچی، ۱۹۹۷ء

☆ کراچی کی کہانی جلد اول، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء

☆ کراچی کی کہانی جلد دوم، مرتبہ اجمل کمال، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی، ۲۰۰۷ء

☆ جوگندر پال، خواب رَو، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۲ء

☆ رضی عابدی، تین ناول نگار، پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

☆ قرۃ العین حیدر، بہائو سنگ سوسائٹی ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

☆ کوکب جمیل، مٹھی بھر ہوا، مکتبہ بھوپال، کراچی، ۱۹۸۸ء

☆ کھتری عبدالغفور کانڈا کریا، کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی، کھتری پبلی کیشنز،

☆ محمد امین، کراچی والے ،شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء

☆ محمد خالد اختر، چاکی واڑہ میں وصال ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

☆ محمد عثمان دموہی، کراچی تاریخ کے آئینے میں، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳ء

☆ مرزا خلیل احمد بیگ، اُسلوبیاتی تنقید، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۲۰۱۴ء

☆ مشتاق احمد یوسفی، آبِ گم، جہانگیر بکس، لاہور، ۲۰۱۳ء

☆ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۱۹۹۷ء

☆ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، طاہر بک ایجنسی، قاسم جان دہلی، ۱۹۷۲ء

Bibliography

- Herald Bloom, "*Novelists & Novels*" Chelsar House Publications, Philadelphia, 2005
- Julian Wolfreys, "*Modern European Criticism & Theory*", Edinburgh University Press, George Square, Edinburgh, 2006
- Lou Freitas Caton, "*Reading American Novels & Multi Cultural Aesthetics*" , Oxford University Press, 2002
- Laurent Gayer "*Karachi Ordered disorder and the struggle for the city*" Oxford University Press, 2014
- M. Hanif Raza "*Karachi The Show Window of Sindh*" Editions Mystique, Karachi, 1984
- Nichola Khan "*Cityscapes of Violence in Karachi*" Oxford University Press, 2017

پاکستانی اُردو ناول میں کراچی کی معاشرتی زندگی

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار:

شہزاد قیصر

رجسٹریشن نمبر: 105-FLL/MSURDU/S-13

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء